

ایوانِ غزل

(ناول)

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

نوٹ:

ء میں ”ایوانِ غزل“ چھاپ دی تھی۔ یہ ایڈیشن ہر طرح کی ۲۰۰۳ ایم۔آر پبلی کیشنز، نئی دہلی نے بغیر کسی تحریری معاہدے کے اغلاط سے پُر ہے۔ ربط قائم کرنے کی متعدد کوششوں کے باوجود اس پبلشر نے کتاب کی اس غیر قانونی حرکت کا اب تک کوئی جواز پیش نہیں کیا۔ موجودہ ایڈیشن ہر اعتبار سے درست ہے۔ وہ جامعات جن کے نصاب میں ”ایوانِ غزل“ کا مطالعہ شامل ہے، ازراہ کرم، اس وضاحت کو پیش نظر رکھیں۔

جیلانی بانو

اضافہ شدہ ایڈیشن

ایوانِ غزل

(ناول)

جی

فرحان کے نام
جو میرا مستقبل ہے

کسی غز کو مئے بنالو، کسی دل کو جام کرلو یہ غزل کی انجمن ہے ذرا اہتمام کرلو

(انور معظم)

صفحہ	باب	شمار
1	<u>بال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔</u>	1
5	<u>صبح</u>	2
27	<u>"الف لیلہ"</u>	3
35	<u>"دالان میں پہنائے ہار کیا خوشنما لگا کے۔"</u>	4
46	<u>"اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔"</u>	5
58	<u>دالان میں کھیلتے کھیلتے اچانک۔۔۔</u>	6
63	<u>"کیا سلا رُود والے آیا۔۔۔؟"</u>	7
69	<u>آئے ہے بے بسی عشق یہ رونا غالب۔۔۔</u>	8
87	<u>واحد حسین نے ایک آہ بھری</u>	9
96	<u>کل دو پھر سر میں جوئیں دیکھتے وقت</u>	10
99	<u>صبح ہمایوں منہ تمٹمائے</u>	11
103	<u>حیدر علی خاں نے</u>	12
107	<u>چاند کا پیغام واپس ہوا تو</u>	13
118	<u>اتنی چکا چوندا اس نے</u>	14
121	<u>صبح ہمایوں نے دیکھا کہ غزل</u>	15
127	<u>"ایوان غزل"</u>	16
135	<u>دکن ریڈیو سے ابراہیم جلیس</u>	17
156	<u>رات کو ابا نے</u>	18
164	<u>دماغ میں کوئی روشنی</u>	19
169	<u>دوسری رات پھر نصیر باغ</u>	20
174	<u>دوسرے دن غزل</u>	21
176	<u>خور داد کا مہینہ آ گیا</u>	22
190	<u>برادرم محترم دام بالاحترام</u>	23
193	<u>آج تیسرا دن تھا</u>	24

25	<u>پھر سب کی نگاہ میں</u>	206
26	<u>برسات شروع ہو چکی تھی</u>	219
27	<u>اس رات غزل کو</u>	231
28	<u>غزل کو ہر وقت</u>	237
29	<u>رات سے راشد کی طبیعت خراب تھی</u>	246
30	<u>راشد کی تیسری برسی کے</u>	249

بال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

صوفوں کے پیچھے کرسیوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ پھر بھی لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ دروازوں پر کھڑکیوں میں، ڈانس کے آس پاس اور باہر کوریڈور میں۔ اتنے بجوم میں عظیم نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے متعلق تعریف و تحسین لاؤڈ سپیکر کے ذریعے لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

سامنے کی صف میں ہندوستان کے وہ سب مانے ہوئے ادیب اور دانشور بیٹھے ہوئے تھے جو ہر کل ہندادبی کانفرنس کا لازمی جزو ہیں۔ وہ سب جناب صدر کی اس اردو نوازی پر خوش ہو رہے تھے کہ وہ اپنی وزارت کا قیمتی وقت نکال کر اردو کی ایک صنف سخن کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے آگئے تھے۔

جناب صدر، کار چوبی مسند کے گاؤ تکیے پر بیٹھے، دھوتی کا پلا سنبھالے اپنی اس قدر افزائی پر خوش ہو رہے تھے۔ خوشی کے مارے ان کا منہ کھلا ہوا تھا، جیسے وہ اس اردو جلسے کی کاروائی سننے کے بجائے، نگل رہے ہوں۔ کئی بار انہوں نے جھک کر اپنے پی۔ اے سے کہا کہ سرخ گلاب کے پھولوں کا وہ بار جو انہیں پہنایا گیا ہے حفاظت کے ساتھ گھر لے جایا جائے۔ پھر انہیں اپنی چپلیں یاد آئیں جو لوگوں نے زبر دستی محمل کے فرش پر اتر وادی تھیں۔

منسٹر بننے کے بعد انہوں نے آنا انا اردو کے متعلق بہت کی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ یہاں تک کہ آج انہوں نے ایک اردو جلسے کی صدارت بھی قبول کر لی تھی جو اردو غزل کے بارے میں ہو رہا تھا۔ آج جو تقریر انہوں نے کی وہ ان کے پی۔ اے نے پہلے اردو میں لکھی۔ پھر تلگو میں ترجمہ ہوا اور پھر انہوں نے تلگو میں اس کا مطلب سمجھ کر اردو میں رٹ لیا تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ غزل کسی چڑیا کو کہتے ہیں یا کسی عورت کا نام ہے مگر وہ اردو کے اس شاعر کو جانتے تھے جو آج انہیں زبردستی اس جلسے کی صدارت کرنے کھینچ لایا تھانہ نئی جمہوریت قائم ہوئی تھی اس لیے پنڈت نہرو کے خاص احکام تھے کہ تمام ریاستوں کے وزیر عوام میں گھلے ملے ہیں۔ اور خصوصاً کلچر پروگراموں میں شریک ہو کر عوام کے قریب آنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے انہوں نے اپنے دوست کی بات مان لی تھی۔ جب وہ منسٹر نہیں تھے بلکہ صرف یلا ریڈی تھے تو ایک بار پیپی آدمی گاؤں آیا تھا۔ اس نے لوگوں کو نظام کی جاگیر داری جبریت کے خلاف ورغلا یا تھا۔ کسانوں کو زمین چھین لینے کے خواب دکھائے تھے اور جاگیرداروں و سیٹھوں کے خلاف لڑنے پر تیار کیا تھا۔ اس نے سارے گاؤں کو اپنی اس میٹھی مسکراہٹ سے موہ لیا تھا جو ابھی تک اس کے لبوں پر زندہ تھی۔ جب گاؤں کے نوجوان اس کی باتیں سننے جاتے تھے تو بوڑھوں نے بہت ڈرایا تھا کہ تم لوگ نواب احمد حسین کو مت بھولو جو ایک ہی دن میں سب کو جیل میں سڑوا دے گا۔

مگر نو جوان تو طوفانی ہوا ہوتے ہیں۔ انہوں نے عظیم سے ملنے کے بہت سے راستے ڈھونڈ نکالے تھے۔

ان دنوں یلا ریڈی اپنے گاؤں کے اسکول میں بچوں کو پڑھاتے تھے۔ پھر ایک دن عظیم ان کے اسکول بھی آ نکلا اور بچوں کو پڑھانے کے نئے طریقے اور نئے سبق سکھانے بیٹھ گیا اور وہاں سے اٹھتے وقت وہ بچوں سے لیکر وہاں کے ماسٹروں تک کو اپنا دوست بنا چکا تھا۔ ایک پرانی کہانی کے بانسری والے کی طرح وہ سارے گاؤں کا دل اپنے نغمے میں سمیٹ کر لے گیا تھا۔ وہ معمولی سی صورت شکل کا دبلا پتلا آدمی۔

ان دنوں قیصر اور سنجیو کے بڑے چرچے تھے۔ سنا ہے وہ لوگ ولم (تلنگانہ تحریک کے چھاپہ مار دستے) کی رہنمائی کرتے تھے۔ قیصر کسی جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن وہ مشین گن لے کر نظام کی فوج سے لڑ رہی تھی۔

اس وقت تک یلا ریڈی کی نظر میں دکھنی مسلمانوں کے دوبی روپ تھے۔ یا تو نواب احمد حسین جن کے قہر سے سارا گاؤں کا نہتا تھا۔ یا پھر سلا رَو مچی جو ہر روز صبح پھٹے پرانے جوتوں کے درمیان خود بھی ایک سڑے ہوئے جوتے کی طرح آبیٹھتا تھا۔ سلا رَو کہتا تھا کہ اللہ میاں تو ہر مسلمان کو نواب احمد حسین بنا کر بھیجتے ہیں۔ اب یہ ان کے اپنے اعمال ہیں کہ وہ سلا رَو کی اندھی بیوی بن کر گھر گھر بھیک مانگتے پھریں۔

کچھ دن اور گزر جاتے تو ممکن تھا کہ ملا ریڈی بھی ان سر پہرے نوجوانوں کے بہکاوے میں آکر اپنا بیڑا غرق کر ڈالتے۔

مگر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ سوامی آنند راؤ جی نواب احمد حسین کے مہمان بن کر دہلی سے آئے۔ کانگریس کے اتنے بڑے نیٹا ہونے کے باوجود اس بار انہوں نے عوام سے چندہ وصول کیا اور نہ نذریں قبول کیں۔ بلکہ صرف یہ بشارت دی کہ اب انگریز اپنا بوریا بستر سمیٹ رہے ہیں۔ لہذا وقت آ گیا ہے کہ کانگریس بھی اپنی طاقت کو اکٹھا کر کے نظام کے پنجے سے عوام کو نجات دلانے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کمیونسٹ پورے تلنگانے پر ہی قبضہ جما لیں۔

ان دنوں گاؤں میں ہر رات قیامت کو ہم رکاب لاتی تھی۔ پہلے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے اتحاد المسلمین کے رضا کار نکلتے۔ جنہیں نواب احمد حسین خاں نے اپنی حفاظت کے لیے شہر سے بلوایا تھا۔ پھر ان سے لڑنے کے لیے سرخ جھنڈے والوں کی فوج پہاڑوں سے کود پڑتی۔۔۔۔۔ صبح پشیمان سا، پریشان سا سورج گاؤں میں جھانکتا تو کھیتوں کی ٹوٹی منڈیروں پر لاشیں پڑی ملتیں اور چاول کے دانوں سے بھری فصل خون کے چھینٹوں سے نہائی ہوئی نظر آتی۔

اس لیے دیکھتے ہی دیکھتے نواب احمد حسین خاں اور سوامی جی نے ملکر گاؤں کے سمجھدار نو جوانوں کی ایک جماعت بنائی۔ بہت سے خطرناک دماغوں کا دھارا موڑ دیا۔۔۔۔۔

یلا ریڈی کا نگریس پنچایت کمیٹی کے صدر چنے گئے۔۔۔۔۔ اس دن کی بھی کیا برکت تھی کہ یلاریڈی سیڑھیاں چڑھتے ہی چلے گئے۔ انہوں نے نواب احمد حسین کی بتائی ہوئی راہ پکڑی اور آج منسٹری کی مسند پر آبیٹھے۔

ان کے سامنے وہی دبلا پتلا سانولا آدمی بیٹھا تھا۔ اپنے چہرے پر دائمی مسکراہٹ لیے۔ اپنے ساتھ وہی آہنی عزم لیے جس نے اسے کبھی لچکنے پر مجبور نہیں کیا۔ اس نے اپنے سینے پر گولیاں کہیں اور پھانسی کا پھندا اس کے پیچھے بھاگا۔۔۔۔۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ سر کا۔۔۔۔۔ یلا ریڈی نے اسے بڑے سبز باغ دکھائے۔ دہلی میں کوئی بڑا عہدہ دلوانے کا بھی لالچ دیا۔ مگر اسے جانے کس چیز کا لالچ تھا کہ اس نے کسی عہدے کی پرواہ نہ کی۔۔۔۔۔ وقت نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

وہ آج بھی پھٹی چیلوں کو گھسیٹتا اسی طرح جلسوں اور میٹنگوں میں گھومتا نظر آتا تھا۔ اسے منٹ بھر کی فرصت نہیں تھی۔ وہ ایک ایک لمحہ سوچ سوچ کر خرچ کرتا تھا اور اس وقت جب وہ ڈانس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا یلا ریڈی کو دیکھ رہا تھا تو اس کے پیچھے اس کے چابنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔۔۔۔۔ ادیب۔۔۔۔۔ شاعر۔۔۔۔۔ دانشور۔۔۔۔۔ عوام۔۔۔۔۔ اللہ کی پناہ۔۔۔۔۔ آج ! ”ایوان غزل“ میں کتنے لوگ سمٹ آئے تھے۔۔۔۔۔

دس برس پہلے جب وہ عظیم سے ڈر کر بھاگے تھے تو انہیں کیا خبر تھی کہ ایک دن اسی عظیم کی دعوت پر انہیں اردو کے ایک جلسے کی صدارت کرنا پڑے گی جہاں غزل کے بارے میں اظہار خیال کرنا ہوگا ، وہ بھی ایسا جلسہ جہاں جوتوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور بیٹھنے کے لیے اتنی تکلیف دہ کار چوبی مسند کا انتظام کیا گیا تھا کہ ان کی نئی دھوتی اس میں الجھ الجھ کر پھٹ رہی تھی۔۔۔۔۔ یہ سب جاگیرداروں کے نخرے تھے۔۔۔۔۔ انہوں نے ”ایوان غزل“ کے اس عظیم الشان ہال کو دیکھا، اتنا بڑا محل۔۔۔۔۔ اتنا خوبصورت ہال۔۔۔۔۔ جھاڑ فائوس لگے۔۔۔۔۔ قیمتی مخمل کے قالین بچھے۔۔۔۔۔ سنہری فریموں میں جڑے ہوئے ان تمام جاگیردار شاعروں کے فوٹو لگے تھے جو اس محل کے مالک تھے اور ان کی اولاد نے یہ محل اور اس کی لائبریری اُردو کے لیے عوام کو دیدی تھی۔

لیکن عظیم کے دوست سرور کو آج بارہ سال بعد ”ایوان غزل“ میں آکر سخت اکتاہٹ سی ہو رہی تھی۔ سرور جدھر بیٹھا تھا لڑکیوں کی نگاہیں اس طرف تھیں۔ وہ حیدر آباد کا بے حد مقبول شاعر تھا۔ اس نے بڑی بڑی مغرور حسیناؤں کو جھکایا تھا۔ جانے کتنی نگاہیں اس کی راہ میں بچھی تھیں پھر بھی وہ کنوارا تھا، چالیس برس کا کنوارا !۔۔۔۔۔ آج ”ایوان غزل“ میں آکر وہ اداس ہوا جار ہا تھا۔ اپنے بے مصرف ہاتھوں کو دیکھ کر سوچتا کہ اب ان کا کیا کرے۔ کہاں رکھے۔

ذہن میں بڑی کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی بہت اچھا شعر تکمیل پانے کو ہو۔ جیسے آج تک اس نے ایک شعر بھی نہیں کہا۔ اس کے دونوں مجموعے ابھی تک بھاری پتھر بنے اس کے دماغ پر رکھے ہیں اور بوجھ کے مارے اس کا سر پھٹا جا رہا ہے۔

گردن اٹھا کر اس نے اوپر دیکھا۔۔۔۔

ڈاکٹر یعقوب حسین اپنی لحیم شحیم شخصیت کو سنبھالے، گرج دار آواز میں دھاڑ رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہاتھ میں مائک یوں تھام لیا تھا جیسے ان کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ چھوٹ بھاگے گا۔۔۔۔

!جناب صدر

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ غزل ہمارے ادب کی سب سے تابناک شمع ہے۔ بلکہ آپ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ ادب ” سے غزل کو نکال دیں تو شاعری کا شبستان تاریک ہو جائے گا۔۔۔۔ بلکہ میرا اپنا تو یہ خیال ہے کہ میں۔۔۔۔ میری ذاتی رائے۔۔۔۔ میرا نقطہ نظر، میں۔۔۔۔ میں میرا۔۔۔۔“ سرور نے زور زور سے پیر ہلاتے ہوئے سوچا کہ پرانے مکتب فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود۔۔۔۔ یعقوب حسین اتنے بڑے آدمی نہیں ہیں۔ ان کی بے تکی تو ند۔۔۔۔ ہونٹوں کے کونوں سے بہتی ہوئی پیک اور ان کے اپنے ذاتی خیال بھی برداشت کیے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے غزل کے بارے میں بڑی خوبصورت اور فصیح بات کہی ہے۔ غزل کے بغیر تو دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ ایک شبستان کی کیا حقیقت ہے۔۔۔۔ سامنے پھیلے ہوئے حسینوں کے ہجوم نظر نہیں آتے۔۔۔۔ ساری شاعری بے کیف ہو جاتی ہے۔۔۔۔ بے روح

تالیوں کے شور سے سرور چونک پڑا۔ اور سگریٹ کیس اٹھا کر کھڑا ہو گیا کہ غزل کے سمینار کا پہلا سیشن ختم ہو گیا ہے۔

مگر ڈاکٹر یعقوب حسین کے ہٹتے ہی سراج ہاشمی مائیکروفون کو اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔

سراج ہاشمی کو گڑے مردے اکھیڑنے کا بڑا شوق تھا۔ قلی قطب شاہ سے لے کر عظیم تک کا شجرہ نسب، ان کے خاندانی حالات، ان کے عیوب اور خطائیں اور ان کے مرنے کی تاریخیں، سب انہیں زبانی یاد تھیں۔ چنانچہ آتے ہی انہوں نے غزل کے بھی بخیے ادھیڑ نا شروع کر دیئے۔

غزل کے متعلق ایک قدیم روایت یہ ہے کہ غزل کا تعلق دراصل غزال سے ہے۔ شکاری جب غزال کا شکار کرتے ” ہیں تو وہ زخمی ہونے کے باوجود بھاگتا ہے۔ شکاری بھی اس کا پیچھا کیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ زخموں سے چور ہو کر ”گر پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو کرب اور مایوسی ہوتی ہے۔ اسے ”غزل“ کہتے ہیں۔

سرور کے سگریٹ سلگاتے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ اس کے ہونٹ حیرت کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ اور بے خواب سرخ آنکھیں ایک جگہ ٹھہرسی گئی تھیں۔۔۔۔ وہ پتھر کا بت بنا سراج ہاشمی کو گھورے جا رہا تھا۔۔۔۔ اس کے اندر بڑا شور مچا ہوا تھا۔۔۔۔ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔۔۔۔ ہزاروں شکاری ایک زخمی ہرنی کو گھیرے میں لیے تیر برسا رہے تھے۔۔۔۔

اُف۔۔۔۔ اس کائیاں بڈھے نے شاید مرتے وقت غزال کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔۔۔۔

!شاید وہ غزل اور ”ایوان غزل“ سے پوری طرح واقف ہے

جلسہ ختم ہو گیا۔۔۔۔ سب چلے گئے۔۔۔۔

اکلیے، سنسان ایوان غزل، میں بیٹھا ہوا سرور غزل کے خیال میں کھویا ہوا تھا۔۔۔۔

صبح

ہر صبح کتنی خوبصورت ہے۔ کتنی نئی اور حوصلہ آمیز۔۔۔ ہر روز صبح اُٹھ کر کیسی نئی خوشی ہوتی ہے۔ جیسے دروازے پر پوسٹ مین دستک دے رہا ہو۔۔۔ کون جانے اس ڈاک میں کتنی خوشخبریاں بھری ہوں گی۔۔۔ کتنے اچھے چہرے ہوں گے۔۔۔؟

صبح ایک پوسٹ مین کی طرح دل کے دروازے کھٹکھٹاتی ہے۔ زندگی کے ایک نئے دن کی آمد۔۔۔ ایک ناول کا پہلا ورق۔۔۔ ایک نئی غزل کا پہلا مطلع۔

اور یہ سوچ کر کیسی خوشی ہوتی ہے کہ اس صبح کو وہ لوگ نہ چھوسکیں گے جو ہم سے پہلے تھے اور وہ لوگ اس کے بارے میں سوچا کریں گے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔۔۔ یہ لمحے جن کے حق دار صرف ہم ہیں۔۔۔ کیسے جاندار ہیں۔۔۔ وقت کی اس ملکیت پر دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے اور چاروں طرف فوارے کی طرح بکھر جاتی ہے

سپوٹے کے پیڑ تلے باغ میں کرسی پر بیٹھے واحد حسین سوچے جارہے تھے۔ صبح کے مضمون کو ایک شعر میں ڈھالنے کے لیے وہ فجر کی نماز سے پہلے ہی یہاں چپ چاپ آبیٹھے تھے۔۔۔

سامنے کھلی ہوئی بیاض میں کئی پھٹی غزل کا کٹا پھٹا ڈیڑھ مصرعہ لکھا ہوا تھا۔۔۔ اس کے اوپر عینک رکھی تھی اور عینک کے اوپر وہ سمن جو عدالت سے کل ہی ان کے نام جاری ہوا تھا۔

”! بھلا کسی شاعر نے اس طرح شاعری کی ہوگی“

انہوں نے اپنے آس پاس کی فضا کو مخاطب کر کے کہا۔ اور پھر انہوں نے سوچا کہ مجھ سے پہلے جانے والے شاعروں کو کیا کامل سکون ملتا تھا؟ سکون جو موت بھی ہے اور حیات بھی۔ اسی سکون کی تلاش میں انسان نے زمین چیر چھینکی۔ سمندر کھنگال ڈالے اور آسمانوں کو چھان ڈالا۔ مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ واحد حسین نے سکون کے لمحوں کا اکثر تجزیہ کرنا چاہا۔۔۔ سکون کی قسموں کو یاد کیا۔۔۔ کیسا سکون؟ انہوں نے ملازمت کے تیس برس اسی سکون کی تلاش میں گزار دیئے تھے۔ مگر اب بھی انہیں کسی چیز کا انتظار سا تھا۔۔۔ موت کا۔۔۔! یا آنے والے اس وقت کا جو کوئی تبدیلی لائے گا۔۔۔ کوئی خوشخبری۔۔۔ خوشخبری بھی عجیب و غریب چیز ہے۔ راشد ٹھیک کہتا ہے آج کل خوشخبری کے معنی ہیں اپنا فائدہ۔۔۔ واحد حسین اس بات کو کبھی نہ مانتے۔ انہیں اپنے مفاد پرست بیٹے کی اس بات پر تعجب بھی ہوتا اور افسوس بھی۔۔۔ جانے کیسے ”ایوان غزل“ میں رہنے کے باوجود۔۔۔ شاعروں کی نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود، راشد اتنا خشک مزاج تھا۔ ہر وقت نفع اور نقصان کی تر از ولے بیٹھا رہتا۔ لیکن واحد حسین نے اس خوف کو دل سے نکال پھینکا تھا۔ نقصان جو انسان کا مقدر ہے۔ جس کا حق دار صرف اس کی اپنی ذات ہے۔۔۔ کیوں کہ نقصان انسان صرف تنہا برداشت کرتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہوتا۔۔۔

اکتا کر انہوں نے سوچا کہ بیاض اٹھا کر اندر چلے جائیں۔ اب تک گو ہر بیگم نے بادام کا حریر تیار کر لیا ہوگا۔ لیکن اب شاعری ان کے لیے خمیرہ مروارید بن گئی تھی کہ ہر نئی غزل سے ان میں نئی توانائی آجاتی تھی۔ وہ چاروں طرف سے گھیرنے والی فکروں کو بھگانے میں کامیاب نہ ہوتے تو کسی نئے مضمون کو شعر میں ڈھالنے بیٹھ جاتے۔ ساتھ ہی وقت کا اندازہ کرنے کے لیے سپوٹے کا سایہ بھی دیکھتے جاتے تھے۔

سائنس نے کتنی ہی ترقی کر لی ہو۔ وقت دیکھنے کے لیے کیسی ہی نئی نئی گھڑیاں ایجاد ہو چکی ہوں۔ مگر واحد حسین تو اب بھی دھوپ اور سالوں سے ہی وقت کا اندازہ لگاتے تھے۔ پنشن ہونے کے بعد انہوں نے انتقاماً گھڑی دیکھنا چھوڑ دی تھی۔ اس گھڑی نے انہیں پینتیس برس تک دنوں اور گھنٹوں کی گردان کرائی تھی۔

اب وہ آرام سے سوچ سوچ کر وقت ضایع کرتے تھے۔ موسم کی خفیف سی لرزش بھی انہیں محسوس ہو جاتی تھی۔

آج آسمان کتنا گہرا نیلا ہے۔ رات کو سردی خوب ہوگی۔“

”آج بڑا حبس ہے۔ اردی بہشت کا مہینہ آ رہا ہے۔

انجیر میں کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ بس اب بہار آنے والی ہے یہ شاعر جانے بہار کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔

راشد سوچتا۔ اچھا صاحب مان لیا بہار آگئی۔ باغ میں دو چار پھول زیادہ کھل گئے۔ ایک آدھ ر نگین چڑیا کہیں پھدکتی نظر آگئی۔۔۔ لیجیے صاحب اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔

راشد کو یوں دن رات روپے پیسے کے الٹ پھیر میں الجھتے دیکھ کر واحد حسین کے دل پر کوئی کنکر مار دیتا تھا۔ یہ آج کل کے لڑکے کتنے مادہ پرست ہوتے جارہے ہیں ! لطیف جذبات تو انہیں چھو کر نہیں گئے۔ راشد کو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ ان کا باپ گرمیوں کی کیا تیاریاں کر رہا ہے۔ ململ کے کرتے تیار ہیں۔ بولی جلنے سے پہلے مٹی کی صراحیاں خرید لی گئی ہیں۔ باغ میں پھولوں کی نئی پنیری لگائی جارہی ہے۔ انگور کی بیلوں کی کٹنگ ہو چکی ہے۔ اور اب لگان کا حساب کتاب کرنے گاؤں جاتا ہے۔

واحد حسین ہر موسم کا یوں استقبال کرتے تھے جیسے کوئی نیوہار آ رہا ہو۔ ورنہ باقی گھر والوں کو دیکھیے، اٹھتے بیٹھتے سردی کا دکھڑا۔۔۔ گرمیاں آئیں تو گرمیوں پر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔ یہ نہیں دیکھتے کہ گرمیاں آتی ہیں تو اپنے ساتھ آم بھی لاتی ہیں؟

واحد حسین کی ایسی شاعرانہ گفتگو کو سن کر ایک بار سروجنی نائیڈو نے کہا تھا۔

”واحد نواب اگر تم اپنے ان نازک خیالات کو شاعری میں ظاہر کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔۔۔؟“

اس بات پر حاضرین ہنس پڑے تھے۔ کیوں کہ واحد حسین اپنے آپ کو سوائے شاعر کے اور کچھ نہ سمجھتے تھے۔۔۔

ویسے یہ حقیقت تھی کہ واحد حسین جتنی خوبصورت باتیں سوچتے تھے وہ ان کی شاعری میں کبھی نہ ڈھل سکیں۔ کیوں کہ وہ رنگ داغ کی پیروی کرتے تھے۔ سراپا نگاری اور سستے قسم کے جذبات کی چمک دمک کے سوا ان کی شاعری میں اور کچھ نہ تھا۔ اس معاملے میں وہ سارا فلسفہ اور اپنے ذہن کی الجھنوں کو الگ بٹا دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کی سات پشتوں سے شاعری کی یہی روایت چلی آرہی تھی۔

ایوان غزل“ کے بام و درشاہ تھے کہ انہوں نے معشوق کی مدح سرائی کے سوا اور کچھ نہ سنا تھا۔“

اس وقت واحد حسین کے چاروں طرف صبح کا سکون آمیز سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آذر کامہینہ ختم ہو رہا تھا۔ اس لیے صبح کے دھندلکے میں ایک ہلکی سی خنکی تھی جو ذراذرا سی بات پر جسم میں ٹھنڈ کی لہر دوڑا دیتی تھی۔ ابھی دن نہ نکلا تھا۔ مگر درختوں کے اوپر چڑیاں جاگ چکی تھیں اور دنیا بھر کے مسائل پر ان میں زوردار بحث ہو رہی تھی۔

سڑکوں پر گزرنے والی ایکا دکا پر چھائیوں میں رنگ بھرنا شروع ہو چکے تھے۔ مالی نے پائپ لگا کر ابھی ابھی لان کی گھاس پر پانی چھڑکا تھا۔ اس لیے دوب کی کچی کچی خوشبو میں تازہ کھلے ہوئے رنگ برنگے پھولوں کی کڑوی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔ نیل بند تھالیکن اس میں سے گرنے والے پانی کے قطروں کی متوازن آواز آرہی تھی۔ جیسے کوئی ایک ہی رفتار سے چل رہا ہو۔۔۔۔۔

واحد حسین کے سر پر سپوٹے کے پیڑ پر چڑیاں جی بھر کے شور مچانے میں مصروف تھیں اور انہیں اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی۔ کہ واحد حسین آج بہت پریشان ہیں۔۔۔۔۔

ان چڑیوں کے بھی مسائل ہیں، اپنے نظریے اور عقائد، جنہیں منوانے کے لیے انہیں اتنی زور زور سے چلانا پڑتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تل جاتی ہیں۔۔۔۔۔ اپنے ہم خیالوں کے ساتھ گروہ بنا کر رہتی ہیں۔۔۔ انسان نے تو زیادہ پڑھ

کر، زیادہ سوچ کر مسائل پیدا کر لیے ہیں۔۔۔ انسان علم حاصل کرنے چین تک جا سکتا ہے۔ مگر وہاں سے لوٹتے وقت ساتھ کیا لاتا ہے۔۔۔؟ کیا کسی مسئلے کا حل ممکن ہے؟۔۔۔ انہوں نے عینک کو اپنی غزل کے ڈیڑھ مصرعہ پر رکھ کر سوچا۔ اور اخبار کا انتظار کرنے لگے۔۔۔ کسی نئی اہم خبر کا صبح کتنا انتظار ہوتا ہے۔ اور پھر مایوس ہو کر اخبار تہہ کر کے وہ رکھ دیتے۔ عینک اُتار کر خود ہی بڑ بڑاتے۔ آج اخبار میں کچھ نہیں ہے۔ لیکن بعض دن اخبار میں بہت کچھ ہوتا۔۔۔ نازیوں کی سازش، یورپ میں بھڑکتی ہوئی آگ۔۔۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی کی تحریک پر احتساب۔۔۔ اس دن واحد حسین کا بلڈ پریشر اور بڑھ جاتا۔۔۔ جیسے ان کی نبض کا تعلق اخبار ہی سے ہو۔۔۔ حالاں کہ وہ اپنے دوستوں سے اور اپنے بیٹے راشد سے یہی کہا کرتے تھے کہ ”اچی اپنے کو کیا کرتا ہے دوسروں کی باتوں سے۔ اپنے ملک میں چین وامن رہا تو بس ہے۔۔۔“

لیکن خود واحد حسین کی ڈیوڑھی ”ایوان غزل“ کے سوا جیسے ساری دنیا میں کہیں چین دامن نہیں رہا تھا۔ شہی شہی۔۔۔

رنگین پروں والی ننھی سی چڑیا اپنی ننھی سی تیز سیٹی جیسی آواز میں واحد حسین سے باتیں کرنے آگئی۔۔۔ یہ چڑیا دن میں کئی بار واحد حسین کے پاس آکر یوں باتیں کرتی جیسے کوئی میم انگریزی بول رہی ہو۔۔۔ ناشتے کے بعد وہ چڑیا کے لیے روٹی کا ذرا سا چورا آنگن میں بکھیر دیتے۔ اس کے بدلے میں وہ چڑیا ان کی ہرنی غزل سننے کو آمادہ رہتی تھی۔ ان کے تمام مسائل اور فکروں پر تبادلہ خیال کرتی۔۔۔ واحد حسین کے دشمنوں پر اس نے ہمیشہ ان کے ساتھ مل کر لعنت بھیجی۔

چڑیا کے ساتھ ہی تتلیوں کے رنگین جھنڈ بھی تفریح کرنے نکل کھڑے ہوتے تھے اور چھوٹے چھوٹے پودوں پر رنگین پنکھڑیوں کی طرح بکھر بکھر جاتے تھے۔

سرخ مورم کی روش ان کی کرسی سے بچتی ہوئی دور پہاٹک تک چلی گئی تھی۔ جہاں ”ایوان غزل“ کا دل کی وضع کا پہاٹک بہت دیر ہوئی کھل چکا تھا۔ پہاٹک کے دونوں طرف جینا کے پھولوں کی باڑھ تھی۔ اور اس کے پیچھے کروٹن کے کونڈوں کی قطار میں شروع ہو جاتی تھیں۔ گیٹ کے داہنی جانب سرخ اور سفید بوگن ویلیا کی بیل نے ”ایوان غزل“ کی زنگ آلودہ دھندلی تختی کو بالکل ڈھانپ لیا تھا۔ مگر اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ حیدر آباد کا ہر شخص اس ڈیوڑھی کو اور اس کے مکینوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ پہاٹک سے اندر تک روشوں کے دونوں طرف ہری گھاس کو کاٹ کاٹ کر پھولوں کی بڑی بڑی کیا ریاں بنی تھیں جن میں اودے اور سفید پھول جیسے کسی نے ٹوکروں سے الٹ دیئے تھے۔ پھولوں کے ڈھیروں کا یہ سلسلہ اوپر سیڑھیوں تک چلا گیا تھا، جہاں سے ”ایوان غزل“ کا سب سے بڑا ہال ”بیت الغزل“ نظر آتا تھا۔ سامنے بڑے بڑے اونچے ستونوں کے سہارے لمبا چوڑا ور انڈا تھا۔ اس کے دونوں طرف اندر جانے کے راستے اور بیچ میں ”بیت الغزل“ کا دروازہ۔۔۔ یہ ہال اس ڈیوڑھی کا سب سے بڑا کمرہ تھا۔ اور ڈیوڑھی کے ہر پورشن کا سلسلہ بالآخر اسی ہال میں آ کر ملتا تھا۔ ہال کے اندر سرخ قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ بے حد قیمتی پرانے اخروٹ کی لکڑی کے بھاری بھر کم مخمل کے صوفے پڑے تھے۔ اس کے پیچھے سنہرے کام والی منقش کرسیوں کا سلسلہ تھا اور بیچوں بیچ اونچا سا تخت، جس پر زریں قالین بچھا تھا اور کار چوبی تکیے رکھے تھے۔۔۔ یہاں بیٹھ کر حیدر آباد آنے والے ہر اہم شاعر نے اپنا کلام سنایا تھا۔

اس ہال میں واحد حسین کے جن آبا و اجداد نے شاعری کی اور مشاعرے منعقد کیے تھے، وہ سب بڑے بڑے سنہری فریموں میں جڑے اس ہال میں موجود تھے۔ ایک سے ایک رعب داب والی صورتیں تھیں۔ کہیں گل مجھے لہرا رہے ہیں اور کہیں لمبی لمبی داڑھیاں ہلتی نظر آئیں۔ دستار پہنے، کمر سے تلوار میں باندھے۔ حالاں کہ وقت پڑنے پر ان میں سے کسی کو تلوار چلانا نہیں آئی۔ وہ سب کے سب تو قلم کے دھنی تھے۔ اسی لیے جب بھی شہ پڑی ان کو مات ہوئی۔ ”ایوان غزل“ کی لائبریری میں ایک سے ایک قیمتی نایاب کتاب بھری ہوئی تھی۔ ان ہی کتابوں کا فیض تھا کہ ”ایوان غزل“ کے ٹھاٹھ باٹ پر زوال آتا گیا۔ جاگیریں کم ہوتی گئیں۔ بے ایمانیوں اور سازشوں کے جال پھیلے اور جھک مار کے واحد حسین ڈیوڑھی سے باہر نکلے، تحصیلداری جیسی حقیر نوکری کرنے۔۔۔ اور ان کا بیٹا راشد انجینئر ی پڑھنے ولایت گیا۔۔۔ ایسے برے دن دیکھنا لکھے تھے۔ اس ڈیوڑھی کے نصیبوں میں۔۔۔

زیادہ پڑھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔۔۔ بعض وقت واحد حسین سوچتے تھے۔۔۔ اور زیادہ الجھاوے۔۔۔ زیادہ مسائل۔۔۔ شکوک و شبہات۔۔۔ کیا علم کے ذریعے آدمی کسی ایک قطعی فیصلے پر پہنچ جاتا ہے۔۔۔؟

اب سڑک پر چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔۔۔

کبھی کبھار کوئی تانگہ ٹخ ٹخ کرتا گزر جاتا۔ یا کوئی گواہ بھینسوں کو ہانکتا سر پر چارے کا ٹوکرا لیے گزر جاتا تھا۔
پھر دو لہے نواب کی ڈیوڑھی پر کوئی ماما چلانے لگی۔۔۔ سینا رام کے مکان کے سامنے ان کی بڑی لڑکی نے گوہر کے پانی کا
چھڑکاؤ کر کے سفید چونے سے رنگولی بنانا شروع کر دی۔

سینا رام برہمن تھے۔ مگر عید بقرعید کو بڑی پابندی سے آکر واحد حسین کے ہاں شیر خرما کھاتے۔ ان کے ہاں کی ہر
پوجا اور تیوہار میں واحد حسین اور ان کے بیوی بچے شریک ہوتے تھے۔ وہ وکیل تھے اور واحد حسین کے سارے جھوٹے
سچے مقدموں کی پیروی کرتے۔ ان کے لیے جھوٹے گواہ ڈھونڈ کر لاتے اور ان کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے تھے۔ راشد کے
ساتھ ہی ان کے لڑکے ملیشمن نے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ مگر راشد انجینئری میں گیا تو وہ بلڈنگیں بنانے کا چھوٹا موٹا کاروبار
کرنے لگا۔ اس کام کے لیے بھی وہ راشد اور واحد حسین کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دو لہے نواب اپنی دیوڑھی سے باہر آئے۔ زربفت کی پرانی شیروانی پہنے، دستار لگائے، لمبے دبلے
پتلے، سفید بالوں کی پیچھے جھالرسی لٹکتی تھی۔ اپنے چھوٹے سے پوتے کو سینے سے لگائے سڑک پر ٹہلنے لگے۔۔۔ دولہے
نواب کے گھر میں دسیوں نوکر چاکر تھے۔ آیا نہیں اور چھو کر یاں تھیں۔ مگر روز صبح وہ اپنے سال بھر کے پوتے کو لے
کر ٹہلا کرتے۔ جیسے کہ یہ ان کی سب سے قیمتی شے ہو۔ دولہا نواب کو دیکھ کر واحد حسین کو بھی حرص ہوتی کہ اپنے تین
برس کے پوتے شاہین کو لے کر دو لہے نواب کے ساتھ ٹہلا کریں۔ مگر ان کا بیٹا اپنے بیٹے کو بالکل انگریزی اصولوں پر پال
رہا تھا اور اس کی موٹی کرسچین آیا بچے کو سات بجے سے پہلے نہیں اٹھنے دیتی تھی۔ اس پر بھی پابندی کہ بچے کا منہ مت
چومو۔ اسے وقت بے وقت کھٹے میٹھے پھل مت کھلاؤ۔ ننگے پیر مت آتا روز میں پر۔۔۔ جب زمین پر اتنی تلخی اور نفرت پھیلی
ہو تو یہی جی چاہتا ہے کہ دولہا نواب کی طرح کسی کو سینے سے لگا کر سب کچھ بھول جائیں۔۔۔ مگر نکلتے ہوئے دن کی
حقیقت۔۔۔ اور سورج کی موجودگی کو کیسے فراموش کر دیں گے آپ، ”بندگی عرض کروں قبلہ۔“ دو لہے نواب کو گیٹ کے
قریب سے گزرتے دیکھ کر واحد حسین کھڑے ہو کر تعظیماً جھکے۔

جیتے رہو۔۔۔ حیات بڑی ہو۔۔۔ دولت و اقبال میں ترخی ہو۔ “دولہا نواب رُک گئے۔“

”آج چھوٹے پاشا، بڑی جلدی آپ کو باہر لے آئے۔“

جی ہاؤ۔ ذرا چھوٹے نواب کو چھاتی سے لگالوں تو آرام ملتا ہے۔۔۔۔۔“ دولہا نواب نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔“

جی بجا ارشاد۔۔۔ وہ منصب کا بھی ابھی تک کچھ نہیں ہوا شاید۔“ واحد حسین جانتے تھے کہ دولہا نواب کا سکون
کیوں کھو گیا ہے۔

”کب ہوتا اللہ کو مالوم۔ لوگاں بول رہیں کتے حضور کی سلور جوبلی کی خوشی میں سب کا منصب بڑھنے والا ہے۔“

جی۔ انشاء اللہ۔۔۔“ واحد حسین ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ کیوں کہ بزرگوں کے ساتھ بات کرنے کا یہی
انداز تھا۔

مگر اتنا منصب بڑھا تو کیا ہوتا میاں۔“ دولہا نواب حقارت سے بولے۔“

بڑے بھائی صاحب کے محل میں چار بیگماں ہیں۔ چھ سات اور لونٹیاں چھوکر یاں ہیں۔ اپنے محل میں دو بیگمات
کے اخراجات ہیں۔ جاگیر تو صرف ڈیڑھ ہزار روپے مہینے کی رہ گئی ہے۔ صاحبزادے کی بھی شادی ہوگئی۔ گھر میں داماد اور
”ان کے بال بچے ہیں۔ آپ ہی بولو۔ گزر بسر کیسا ہونگی۔۔۔“

”جی بجا ارشاد فرمائے حضرت۔“

واحد حسین کی باتوں کے اختصار سے پریشان ہو کر دولہے نواب آگے بڑھ گئے تو واحد حسین کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر ہری گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگے۔ بھلا کبھی دولہا نواب کے باپ دادا نے یوں آمدنی اور خرچ کے بارے میں غور کیا ہوگا! اس نئے انگریز ریزیڈنٹ نے تو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ جاگیرداروں کی ساری جمع و خرچ کا حساب کتاب دیکھنے کی فکر۔ ہر بات کی نگرانی۔ خرچ کوئی کرے۔ فکر کسی کو۔۔۔ دولہے نواب کہتے تھے کہ ڈیوڑھیوں کی حرم سرانیں تک چھان ڈالی تھیں ان اجاڑ صورت فرنگیوں نے۔

ڈر کے مارے اعلا حضرت کو ”انسداد بے رحمی بر انسان“ کا محکمہ قائم کرنا پڑا۔ جو گھروں اور ڈیوڑھیوں کے چھوکروں اور لونڈیوں کو باہر بلا کر پوچھتے تھے کہ ان پر کیا ظلم ہوا ہے۔ اب ان نوکر پیشہ لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے چغل خوری کرنے کی۔ پیٹھ یا ہاتھوں پر کسی زخم کا نشان دیکھا اور ان لوگوں نے لاری میں لڑکی کو ڈال کر بحق سرکار ضبط کیا۔ اب لاکھ سر پٹکنے کوئی شنوائی نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ یہ چھوکریاں کوئی مفت میں آسمان سے نہ ٹپکتی تھیں۔ باقاعدہ پیسے خرچ کر کے خریدی جاتیں۔ لیجئے۔ اب کام کون کرے۔! انتخاب دار نوکر رکھو تو ان کے ہزار نخرے۔۔۔ اپنی یہ قدر دیکھ کر اب تو کا مائین تک اترائی پھر تیں۔۔۔ کیا مجال کہ کوئی اندھیرے اُجالے ان کا ہاتھ تو پکڑ لے۔ دھڑوں کی پوری پلٹن آجاتی ہائے واویلا مچانے۔

واحد حسین پھاٹک پر کھڑے دور تک پھیلے ہوئے بنگلوں کی قطاریں دیکھنے لگے۔ باہر سے فقیروں کے پیوند لگے کپڑوں کی طرح پرانے بدشکل مکان اپنے اندر کیا کیا چھپائے ہوئے تھے۔ ہر مکان کے اندر کتنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ آنسوؤں اور قہقہوں میں چھپی ہوئی باتیں۔۔۔ محرومیوں کی لمبی قطاریں۔

اکتا کر انہوں نے اپنے گھر کو دیکھا۔ یہاں انہوں نے کیسے سلیقے کا باغ لگایا تھا کہ سارے حیدر آباد میں ان کے باغ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے ”ایوان غزل“ صرف اپنے مکین شاعروں کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ لوگ چار پشتوں سے شاعری کرتے آئے تھے کیوں کہ فکر سخن کے سوا اللہ نے انہیں اور کوئی فکر نہیں دی تھی ”بیٹ الغزل“ میں لگی ہوئی تصویروں میں وہ سب بڑے جاہ و جلال کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ لیکن واحد حسین جانتے تھے کہ یہ سب کے سب کتنے بودے عاشق تھے۔ اس ڈیوڑھی میں ہمیشہ مرنے جینے کا کھیل کھیلا گیا اور ایک کا فراد ابت طنز نے یہاں ہمیشہ خدائی کی۔

اس گھر کو ایک نیا رنگ و روپ دے کر اسے چمنستان بنانے میں صرف واحد حسین کا ہاتھ تھا۔ اب اس ڈیوڑھی میں آپ کسی ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی کو ڈھونڈتے پھریں تو یہ سراسر حماقت ہوگی کیوں کہ واحد حسین نے جس غنچہ دہن سے ”ایوان غزل“ کو سجایا تھا وہ اپنے کھچڑی بال منہ پر بکھیرے، اپنے نواسوں، پوتوں کے ننھے ننھے کپڑے سینے میں مشغول تھی۔ اس کے باوجود واحد حسین کے فراق کا یہ عالم تھا کہ ساتوں بیاضوں کے سارے ورق ہجر کی بیکراری اور فراق کی آگ سے جل رہے تھے خود سر کیوں کہ خود سر اور بے رحم ساقی انہیں پیالہ دیتا تھا نہ شراب۔ وہ ساری جوانی ایک موم کی گڑیا سے کھیلنے رہے جے اٹھاؤ تو آنکھیں کھول دیتی ہے۔ لٹاؤ تو خوابوں میں کھو جاتی ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ واحد حسین نے اپنی خاندانی روایتوں کے خلاف ایک بیوی پر اکتفا کر لیا اور اپنے گھر میں نئے نئے پھول کھلانے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے باغ میں ہر ہر شاخ سلیقے سے جھکی ہوتی تھی۔ ہر پھل مہذب انسانوں کی طرح مسکراتا تھا۔ کیا مجال کہ گھاس پر بچھا ہوا ایک تنکے بھی ڈسپلن کو توڑ سکے۔ ان پودوں کے ساتھ واحد حسین وہی سلوک کرتے تھے جو انہوں نے تحصیلداری کے زمانے میں ماتحتوں کے ساتھ کیا تھا۔

کبھی کبھی راشد ابنس کر کہتا۔

”ابا جان تو سارے باغ کو مارچ پاسٹ کرواتے ہیں۔“

اپنے اکلوتے بیٹے کی یہ بات واحد حسین کو بہت اچھی لگی تھی۔ ویسے انہیں راشد کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ راشد کی پیدائش کے بعد ہی ان کے جنون کو قرار سا آ گیا تھا اور انہوں نے

بی بی کی خودسری سے اپنا دھیان ہٹا لیا تھا۔

کاش راشد اپنے دادا کے زمانے میں پیدا ہوتا تو اس کی قابلیت کو سراہا جاتا۔ کم سے کم صوبہ داری تک تو پہنچ جاتا۔ جاگیر اور خطاب ملتا، یہ دن تھوڑی دیکھنا پڑتے کہ نزاکت جنگ کا پوتا انجینئر ی پڑھ کر پانچ سو روپے کما رہا ہے۔ دن دن بھر مزدوروں کے ساتھ چھتری لگائے دھوپ میں کھڑا ہے۔ دوروں پر گھوم رہا ہے۔ ویسے یہ بات نہیں تھی کہ سرکار نے راشد کی قابلیت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہو۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی بلڈنگ بنانے سے پہلے اسے گورنمنٹ نے اپنے خرچ پر ولایت بھیجا تھا کہ وہاں کی اچھی بلڈنگوں کو دیکھ کر آئے۔

خیر۔ یوں بھی راشد اور اس کی اولاد کی واحد حسین کو زیادہ فکر نہ تھی کیوں کہ ان کے چھوٹے بھائی احمد حسین کی شادی مناسب جنگ کی اکلوتی پوتی اُجالا بیگم سے ہوئی تھی۔ اور اُجالا بیگم نے تیس برس گزرنے کے باوجود احمد حسین کی ڈیوڑھی میں اپنے وجود سے کوئی چراغ نہیں جلایا تھا۔ اس لیے واحد حسین کو قرض کی دیمک چاٹتی ہوئی اپنی جائیداد کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اپنی رہی سہی پونجی انھوں نے دونوں بیٹیوں بشیر بیگم اور بتول بیگم کی شادی میں خرچ کر ڈالی تھی۔ اب ہر سال ”ایوان غزل“ پر قرقی کا نوٹس آتا اور وہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ کر کے ٹال دیتے تھے۔۔۔ اب ان کی نظریں اورنگ آباد کی طرف لگی رہتیں جہاں احمد حسین بے شمار دولت کو سمیٹے بیٹھے تھے۔

احمد حسین نے واحد حسین کی طرح نہ تو شاعری کی اور نہ بڑے عہدے ڈھونڈے اور نہ شاہی سازشوں میں شریک ہوئے۔ کیونکہ بیوی کی دولت نے انھیں ہنر مند بنا دیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے گاؤں والی ڈیوڑھی ہی میں رہتے تھے۔ راجہ اندر کی طرح انھوں نے دُنیا کا ہر عیش اپنے لیے مہیا کر لیا تھا۔ انھیں دنیا کے جھمیلوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

واحد حسین کو اپنے چھوٹے بھائی کی قسمت پر رشک آتا تھا۔۔۔ احمد حسین صرف اپنے لیے جیتے تھے۔ اس لیے وہ کتنے مزے میں تھے۔۔۔ مگر واحد حسین لاکھ ڈھونڈتے انھیں اپنا وجود ”میں“ کبھی تنہا نہ ملتا۔

کسی نہ کسی سرے سے کوئی نہ کوئی ضرور بندھا ہوتا۔۔۔ یہ ”میں“ کیا ہے۔

میرا اپنا وجود جس میں کوئی اور شامل نہ ہو۔۔۔ خدا کی طرح۔۔۔ مگر خدا کو تنہا ماننے کے لیے بھی انسان کے وجود کو اس سے علاحدہ کیا جاتا ہے۔۔۔ تھک ہار کے واحد حسین پھر اپنی بیاض مینپناہ لیتے تھے۔

’تھوڑی دیر بعد اخبار آ گیا۔۔۔

واحد حسین وہیں کیاریوں کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور عینک لگا کر جلدی جلدی ”صحیفہ“ کے ورق پلٹتے لگے۔

کسی خاص چیز کا انتظار نہیں تھا۔ مگر پھر بھی سرخیاں پڑھتے وقت ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔

کون سے عہدہ دار کا تبادلہ کہاں ہوا۔ کون مرا کس پر عتاب نازل ہوا اور کون سر چڑھ گیا۔۔۔؟ اس وقت تک دکن میں باہر کی خبریں بہت کم چھپتی تھیں۔ کوئی بڑی اہم دُنیا کو بلا دینے والی نیوز ہوتی تو کسی کونے میں آپڑتی۔ واحد حسین سب سے پہلے ”فرمان مبارک“ پڑھتے تھے۔ فرمان پر نظر ڈالنے سے پہلے وہ بے ساختہ ٹوپے اٹھا کر سر پر رکھ لیتے اور مودب ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ آج کے فرمان پر بھی انھوں نے بڑے اہتمام سے نظر ڈالی۔۔۔

انعقاد محافل مشاعرہ

فرمایا آج کل جو اس کی کثرت ہو گئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے زبان اُردو کا استحکام یا احیا ہوگا، تو سمجھ ”میں نہیں آتا کہ چند گھنٹے اس میں صرف کر کے اور شعرا کے کلام کی داد دے کر چلتے پھرتے نظر آنا۔۔۔ بقول کے نشستند گفتند برخاستند سے کیا فائدہ ہوگا۔ بلکہ یہ صرف ایک تفریح طبع کا مشغلہ ہوگا۔ مثل متحرک تصاویر۔۔۔ البتہ وہ بات جدا ہے کہ اگر واقعی زبان اُردو کی اشاعت یا ترویج یا استحکام صح نظر ہے تو ایک صیغہ اس کا قائم ہونا چاہئے تا کہ جو دوسری زبانوں میں مفید کتب ہیں اس کا ترجمہ کرایا جائے۔ یا کوئی لٹریچر جدید وجود میں لایا جائے۔ یا کمیاب کتابوں کو چھپوایا جائے اور ان کی اشاعت کا باضابطہ انتظام ہو۔ مگر مشکل یہ ہے اس کے لیے کافی پیسے کی ضرورت ہے تا کہ ایک فنڈ قائم ہو سکے اور

قابل لوگ اس کام کو ہاتھ میں لے لیں اور شوق و ذوق سے اس کو انجام دیں۔ اور جب تک یہ بات پیدا نہیں ہے تو مشاعرے بے سود ہیں یا باعث تضييع اوقات

المحاصل ! یہ میری ذاتی رائے ہے جس سے بہت سے ذی علم اصحاب کو اتفاق ہے۔ ورنہ بے ضرورت دوسرے ” کاموں میں مجھے دخل دینے کا حق نہیں ہے اور نہ مشاعرے کی میرے ہاں کوئی قدر و قیمت ہے۔ مگر ایک چیز جو میرے سامنے ہے، یعنی ایک طرف مسلم قوم مفلس و نادار ہے اور دوسری طرف بے سود کاموں میں پیسہ جارہا ہے۔ جو ضرور قابل ”دید شعبہ ہے۔

لیجنے مشاعروں کا تولیوں بیڑا غرق ہو گیا۔ شاعروں کی اس ناقدری پر وہ کھسیانے سے ہو گئے۔

فرمان پڑھ کر انہیں یوں لگا جیسے کنگ کوٹھی کی دُنیا بھی احمد حسین کی دُنیا سے مختلف نہیں ہے جہاں صرف ”میں“ کا وجود ہے۔ ابھی واحد حسین اخبار کی اہم خبروں میں غرق تھے کہ عین اسی وقت ان کی نواسی چاند، حسب عادت پھولوں کی شاخوں میں اپنا فراک الجھاتی دوڑی ہوئی آئی۔

”نا ناحضت۔ جلدی اندر چلیے۔ چھوٹے نانا حضت کا خط لے کر اردلی، اورنگ آباد سے آیا ہے۔

ایں۔۔۔!“ وہ چونک پڑے۔ جلدی کے باوجود فرمان مبارک والا اخبار انہوں نے احتیاط سے تہہ کر کے ہاتھ میں تھاما۔

کتے چھوٹے ناناحضت کو بیٹا ہوا ہے۔“ چاند کروٹن کے پتے کھسوٹنے لگی۔

آ۔ ایں۔۔۔۔۔؟“ اس بار اخبار پھر پھڑاتا ہوا دور جا گرا اور وہ بیاض چھوڑ کر اندر بھاگے۔

چند منٹ بعد وہ پیش دالان میں سب کے بیچ بیٹھے عینک کو ناک کی پھنک میں اٹکائے خط کا آخری پیراگراف سب کو سنارہے تھے۔

بیگم اور نومولود سلمہ سب بزرگوں کی خدمت میں قدم بوسی عرض کرتے ہیں۔ میری جانب سے بھی جمیع بزرگاں ” کی خدمت میں قدم بوسی اور سب خورد د عا مطالعہ فرما دیں۔

والسلام

حقیر پر تقصیر

احمد حسین خان عفی عنہ

خط خود بخود واحد حسین کے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔ مگر ان کے ہاتھ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ایک وہ ہی کیا یہ خط تو یہاں بیٹھنے والے سب ہی کو پتھر بنا گیا تھا سوائے لنگڑی پھوپو کے جو منہ ہی منہ میں جانے کیا بڑبڑا رہی تھیں۔

کئی منٹ بعد واحد حسین نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو جنبش دی اور بڑی بے بسی سے ہاتھ ملنے لگے۔

”دیکھا۔ آخر اُجالا بیگم نے ہمارا پڑا کر دیا۔“

اونہے ، اس بچے کی پیدائش ایسی کونسی اہم بات ہے۔ ایسے تو جانے کتنے بچے چچا حضرت کی ڈیوڑھی میں پل رہے ”
”ہوں گے۔“

راشد کی دلہن رضیہ کسی طرح اس بات کو ماننے پر تیار نہ تھی کہ احد حسین کی اتنی بے شمار جائیداد کا وارث اس کے شوہر کے سوا اور کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

اللہ میاں، بی جانی کے نصیب کیسے کھولے۔ آن کی آن میں بیگم بن گئی۔“ لنگڑی پھوپھو نے بڑے رشک بھرے انداز ”
میں کہا۔

تھو۔ وہ اُجاڑ صورت کیوں بنتی چچا حضرت کی بیگم۔“ واحد حسین کی بڑی لڑکی بشیر بیگم نے تنک کر کہا۔“

دیکھ لیتا۔ اُجالا چچی تو اسے اپنی چیل کے نیچے دبا کر رکھیں گی۔ اس پر حق ہی کیا ہے۔۔۔ دو ٹکے کی ”
چھوہری۔۔۔“ بشیر بیگم کو بی جانی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اس چھوہری کی بوٹیاں بکھیر کے پھینک دے۔

تو کیا بی جانی واحد بھائی کی بیگم نہیں بنے گی۔“ بی بی نے پہلی بار اس بحث میں حصہ لیا۔ اور واحد حسین نے ”
دیکھا کہ بی بی کا دوسرا دانت بھی گر گیا ہے۔ مگر ان کی زہریلی مسکراہٹ میں وہی طنز تھا جو انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

بیگم بننا ہر عورت کے نصیبوں میں تھوڑی ہوتا ہے۔“ اتنے عظیم سانحے کے وقت بھی واحد حسین بی بی کو جواب ”
دینا نہیں بھولے۔

کیا ہوا۔۔۔؟ کون بیگم بن گئی۔۔۔؟“ قیصر کی ماں فاطمہ بیگم سوپ میں چاول لیے دالان میں آئیں۔“

اجی وہ تمہارے بھائی احمد میاں کے ہاں ایک چھوہری تھی۔ بی جانی کتے۔ اس کے نصیبوں میں بھی بیگم بننا لکھا ”
تھا۔“ بی بی اپنے پوتے شاہین کا ادھ سلا کرتا گھٹنوں پر رکھ کر باتھوں سے استری کرنے لگیں۔

بیٹا ہوا ہے تمہارے بھائی صاحب کے ہاں۔ اور نام کیا رکھا ہے نگوڑا، نومولود کتے۔ لنگڑی پھوپھو نے طنز کیا۔“

دونوں باتیں غلط۔“ واحد حسین نے عینک بھننا کر تخت پر پٹکی اور شیروانی کے بٹن کھسوٹنے لگے۔“

”نہ تو احمد میاں کے لڑکا ہوا ہے اور نہ اس کا نام نومولو درکھا ہے۔“

اور یہ جو آپ نے ابھی خط پڑھا۔۔۔؟“ رضیہ نے تعجب سے پوچھا سب ہی حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔ جیسے ”
واحد حسین نے سب کو پریشان کرنے کے لیے کوئی نا تک کھیلا تھا۔

میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ لڑکے کا نام نصیر حسین خاں رکھا گیا ہے اور لڑکا احمد میاں کے نہیں ان کی بیگم بی ”
جان کے ہوا ہے۔۔۔“ انہوں نے چلا کر کہا۔ اتنی دیر میں ان کا بلڈ پریشر کئی پوائنٹ آگے بڑھ چکا تھا اور وہ غصے کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

بابا۔۔۔ قیں قیں قیں۔۔۔“ فاطمہ بیگم، لنگڑی پھوپھو، رضیہ اور بشیر بیگم ہنس رہی تھیں اور اس بات کو بھول چکی ”
تھیں کہ واحد حسین کے آگے انہیں نہیں ہنسنا چاہیئے۔

غصے کے مارے واحد حسین کا بلڈ پریشر بڑھا اور رنج کے مارے رضیہ کے پیٹ میں پھد کنے والی ننھی سی جان بھی بے چین ہو گئی۔۔۔ اور وہ ہنستے ہنستے اندر جا کر کرانے لگی۔

اس خبر سے سب سے زیادہ خوش ہونے والی لنگڑی پھوپھو تھیں، مگر انہوں نے کسی پر اپنی خوشی ظاہر نہ ہونے دی۔

لنگڑی پھوپھو کا نا گوبر بیگم تھا وہ راشد کی ہم عمر تھیں اور واحد حسین کی چچازاد بہن تھیں۔ سنا ہے وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ چودہ برس کی بیٹی کے لیے ان کے ابارشتہ ڈھونڈ رہے تھے کہ ٹرین کے ایک حادثہ میں ان کے ماں باپ دونوں مر گئے۔۔۔ لنگڑی پھوپھو معہ اپنی جائداد اور زیور دولت کے، واحد حسین کے والد کی سرپرستی میں آگئیں۔ وہ بچارے اپنی لاوارث ہوتی کے لیے اتنی احتیاط سے رشتے تلاش کرتے رہے کہ وہ پچیس برس کی ہوگئیں۔ اور جب ان کی ننھیال والوں نے دادا کو طعنے دینا شروع کیے کہ واحد حسین اور احمد حسین گو ہر بیگم کی دولت پر دانت لگانے بیٹھے ہیں اس لیے ان کا ہر پیغام لوٹا دیتے ہیں، تو کرنا خدا کا یوں ہوا کہ گوبر بیگم عید کا چاند دیکھ کر اپنی قسمت جاگنے کی دُعا مانگنے چھت پر گئیں اور وہاں سے چکرا کے جو گری ہیں تو نیچے سڑک پر ہوش آیا تو ان پر بیہی وہم سوار تھا کہ انہیں کسی نے پیچھے سے دھکا دے دیا۔۔۔ مگر ”ایوان غزل“ میں کون ان کی جان کا دشمن تھا! اسپتال سے گھر آئیں تو کولہے کی بڈی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک پاؤں لنگ کھاتا تھا۔ اب وہ لکڑی کے سہارے پورے بدن سے دوہری ہو کر چلتی تھیں۔ اب سوچے بھلا اسی ٹوٹی پھوٹی لڑکی سے کون بیاہ کرتا! اس لیے ”ایوان غزل“ میں لنگڑی پھوپھو کے نام سے انہیں سب پکارتے تھے۔ لونڈیوں چھوکر یوں کے اوپر حکم چلانے اور تمام ڈیوڑھی کا انتظام کرنے میں وہ دن بھر مصروف رہتیں۔ سب انہیں بے حد چاہتے تھے۔ ان کی ساری کڑوی کسلی باتیں بڑوں سے لے کر بچوں تک کو ماننا پڑتیں۔ گھر کی لڑکیوں کو ان کا حکم سننا پڑتا۔ واحد حسین تو ان کی ذرا سی بیماری پر گھبرا جاتے تھے۔ اپنی بہن کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ بچاری قسمت کی ماری بہن پر انہیں بڑا ترس آتا تھا۔ سارے گھر پر لنگڑی پھوپھو کی حکومت تھی وہ اپنی جلی کٹی زبان میں جسے جو جی میں آتا کہ دیتی تھیں ہر ایک کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کو تیار۔

اس گھر میں صرف واحد حسین کی بیوی بی بی سے ہی ان کی بیڈ بھیڑ کا امکان تھا کہ نند بھارج کی ازلی دشمنی مشہور ہے۔ مگر بی بی بڑے ٹھنڈے خون کی تھیں۔ اور تیس برس گزرنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو ”ایوان غزل“ کی ملکہ کی بجائے ایک چپراسی کی لڑکی ہی بچھتی رہیں۔ انہوں نے اپنے سارے اختیارات لنگڑی پھوپھو کو سونپ دیے تھے۔ اور خود سارے گھر کی ذمہ داریوں سے الگ تھلگ بناؤ سنگار کیے، خوشبو میں بسے، چم چم کرتے کپڑے پہنے، کلاہوں میں سنہرے نگوں کا جوڑا چمکاتی، مسہری پر بیٹھی رہتیں تھیں۔ یا پھر ناو لیں پڑھنے میں وقت گزرتا۔ ماماؤں سے شہر کی اہم خبروں پر تبصرہ ہوتا۔ یا پھر پردہ لگی موٹر میں بیٹھ کر وہ رشتہ داروں کے ہاں ملنے چلی جاتیں۔۔۔ انہیں بالکل خبر نہ ہوتی کہ آج گھر میں امبارے کی بھاجی پکی ہے یا پالک کی۔ واحد حسین کا کن کن چیزوں سے پر ہیز ہے۔

البتہ واحد حسین کمرے میں آتے تو وہ نئی دلہنوں کی طرح سمٹ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کی ہر خواہش، ہر حکم کو بسر و چشم قبول کرنے کو تیار، واحد حسین کو نوابی قسمت ملی تھی نہ شاہانہ ٹھاٹھ۔ اسی لیے ان کی آواز میں بڑی شائستگی تھی۔ ان کی زبان بڑی مصلحت پسند تھی جو ضرورت پڑنے پر شہد بھی بن جاتی اور زہر بھی۔ اس لیے ان کی بات کرنے کے بھی دوا سٹائل تھے۔ ایک وہ پر مزاح اور شفقت آمیز زبان، جس سے وہ نوکروں اور دوستوں سے بات کرتے تھے۔ اور ایک وہ پرشکوہ انداز جو اپنے آگے اور کسی کو نہ مانتا تھا۔۔۔ لیکن اس کے علاوہ بھی واحد حسین کا ایک اور روپ تھا۔ وہ عاجزانہ اور نیاز مندانہ ایک عاشق کا انداز جو صرف بی بی کے لیے مخصوص تھا۔ کیوں کہ بندگی بھی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ کبھی کبھی اپنا سب کچھ کسی کو سونپ کر کسی کے حوالے کر کے بھی کیسی راحت ملتی ہے۔ اپنے وجود سے انکار کر کے۔۔۔ واحد حسین نے بھی

بی بی کو اپنی ساری چابیاں سونپ دی تھیں۔۔۔ یہ وہ عورت تھی جس نے پچیس برس کی عمر میں پچیس عشق کرنے والے واحد حسین کو اپنے پاس بٹھایا تو پھر وہ اور کسی طرف نہ دیکھ سکے۔ مگر اس ڈیوڑھی میں لاکر، تین بچوں کی ماں بنا کر بھی بی بی ان کے ہاتھ نہیں آتی تھیں۔ اب وہ بچارے باغ مینیباض کھولے صبح کا انتظار نہ کرتے تو کیا کرتے

خط ہاتھ میں تھا مے واحد حسین بڑی دیر تک سوچتے رہے کہ آج صبح ہی بڑی بے تکی ہوئی تھی۔ کبھی ایسا ہوانہ تھا کہ اتنے ہاتھ پاؤں مارنے پر بھی ایک مصرعہ ہاتھ نہ آئے۔۔۔ اخبار میں کوئی اچنبانہ نکلے۔ مگر اچنبا تو کمبخت خط کے اس پرزے میں چھپا بیٹھا تھا۔

یہ چاند بھی کیسی نکلی۔ جانے کیوں اپنے دادا کا گھر چھوڑ کر یہاں پڑی رہتی ہے۔ صبح ہی صبح سبق پڑھانہ نماز۔ بس چلی آئی یہ منحوس خبر سنانے۔ جبھی تو لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر سر پیٹ لیتے ہیں۔

دلہن بھابی، آپ آج ہی بشیر بیگم سے اُجالا بھائی کو خط لکھواؤ، کہنا کہ اس اُجاڑ صورت بی جانی کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ بچے کے لیے کوئی کرسٹن آیا رکھو۔ نہیں تو اس کمینی کا دودھ پی کر بچہ بھی ویسا نیچ ہو جائے گا۔

پھر تو وہ سچ مچ کا نواب بنے گا نا گوہر بیگم“ بی بی نے مسکرا کے گوہر بیگم کی طرف دیکھا ”اچھا ہوا اُجالا بیگم“ کو اپنی دولت کا وارث مل گیا۔

تھو۔۔۔ کیا دولت ہے ان کے پاس۔“ رضیہ نے بھنویں سکپٹر کے کہا۔۔۔

”بس اُجالا چچی اتراتی بہت ہیں اپنی دولت پر۔“

ا جی ننیں رضیہ دلہن! ہاتھی مرا بھی تو سوا لکھ کا ہوتا کتے۔“ اُجالا بیگم کے خاندان والے بڑے پیسے والے لوگ تھے۔ وہ جو قصے کہانیوں میں دولت مندوں کی باتاں لکھی ہیں نا، وہ سب اسی خاندان کی با تاں ہیں، میں سب سن چکی ہوں ہاں کے قصے۔ لنگڑی پھوپھو گھنٹوں پر ٹھوڑی ٹکا کے اُجالا بیگم کا ماضی دیکھنے لگیں۔

اندر والے کمرے میں شاہین اور با تھا۔ رضیہ اپنے کمرے میں جا کر کرانے لگی۔۔۔ جہاں واحد حسین بیٹھے تھے، اس کے بالکل پیچھے والے کمرے میں چاند ناچ ناچ کر گارہی تھی۔

”میرے چھوٹے سے من میں چھوٹی سی دُنیا رہے۔“

چاند اٹھ برس کی تھی۔ مگر ابھی سے اس کی ماں بیر بیگم، بیٹی کی خوبصورتی پر نظر ڈال کر کانپ جاتی تھیں۔

ان کے خاندان میں تو خوبصورت لڑکیاں زہر کھا کر مریں یا کسی محل میں قید کر دی گئیں۔

حسن چاہے بی بی کی طرح کسی چپراسی کی جھونپڑی میں چھپا بیٹھا ہومگر فتنے کھڑے کر بی دیتا ہے۔ اور دکن کی کہانی تو بھاگ متی سے لے کر بی بی تک عشق ہی کے مختلف رنگوں سے چمک رہی تھی۔ مگر اب زمانہ بدل گیا تھا اور اس بدلے ہوئے زمانے کا سب سے بڑا ثبوت بشیر بیگم کے شوہر حیدر علی خاں تھے۔ حیدر علی خاں یوں تو بشیر بیگم کے دور کے رشتے سے بھائی بھی لگتے تھے۔ لیکن وہ لندن سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے۔ اور بڑے نیشنلسٹ خیالات کے حامی تھے۔ ابھی حیدر آباد میں قوم پرستی کی کوئی لہر نہیں ابھری تھی۔ لیکن بہادر یار جنگ کی سیاسی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ حیدر آباد کے وفاق کے سخت مخالف تھے اور حیدر آباد کو ایک خود مختار ریاست دیکھنا چاہتے تھے۔

اس کے برعکس حیدر علی خاں جیسے باشعور لوگوں کا بھی ایک حلقہ تھا جو یورپ کی سیاسی تحریکوں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ پنڈت نہرو کی بنائی ہوئی کانگریس کی پالیسی کو پسند کرتا تھا۔ یہ لوگ فاشزم کے خطرے کو سروں پر منڈلاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یوں تو ہندوستان میں ہٹلر اور مسولینی کے خلاف عوام متحد تھے۔ مگر ابھی حیدر آبادی عوام دُنیا کی سیاست سے بہت کم واقف تھے۔ جب حیدر علی خاں نے لندن سے آکر بشیر بیگم سے شادی کی ہے تو حیدر آباد کی سیاست بھی کروٹیں بدل رہی تھی۔ جوش کی شاعری اور قاضی عبدالغفار کی کوششوں سے کچھ نئے رجحانات بیدار ہو رہے تھے۔ سروجنی نانڈو کانگریس میں شریک ہو کر کام کرتی تھیں۔ اور ان کی قیادت میں حیدر آباد میں بھی نئے رجحانات رکھنے والوں کا ایک حلقہ ابھر نے لگا تھا۔ اس کے سب سے سرگرم کارکن حیدر علی خاں تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال ”بال جبریل“ لکھ کر ہندوستانی نوجوانوں کو بیداری کا پیغام دے رہے تھے اور ٹیگور گیتانجلی ناچکے تھے۔ مگر حیدر آباد میں اقبال کی غزلیں ڈیوڑھی میں ہونے والی قوالیوں میں سنی جاتی تھیں اور نا انصافیوں تلے پسنے والے بوڑھے جاگیردار، حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں بلانے پر اپنی ڈاڑھیوں سے آنسو پوچھ لیا کرتے تھے۔ بشیر بیگم نے کبھی کوشش نہیں کی کہ اپنے دولہا کے خیالات کو سمجھیں۔ وہ ابھی چھٹی ساتویں کلاس میں تھیں کہ ان کی شادی ہو گئی۔ اس زمانے میں عام طور پر لڑکیوں کا پڑھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جہیز کی دولت اور اونچا خاندان ہی انہیں سرال میں برتری کا احساس دیتا تھا۔ بشیر بیگم تو بی بی کی

خوبصورتی کا حصہ بھی لائی تھیں۔ یوں بھی ”ایوان غزل“ کا حسن کا جادو مشہور تھا۔ اس لیے وہ اپنے ولایت پاس میاں کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ اور اس بات پر اترائی اترائی پھر میں کہ ان کا دولہا بالکل انگریزوں کی طرح روز صبح نہاتا ہے۔ انگریزی میں باتیں کرتا ہے اور اس نے ایک اونچی پہاڑی پر ایسا مکان بنوایا ہے جس کے دروازوں میں کنڈیاں اور زنجیریں نہیں ہیں۔

حیدر علی خاں نے طے کر لیا تھا کہ ان کی بیٹی چاند سلطانہ ڈاکٹر بنے گی۔ اس لیے انہوں نے چاند کو کانویٹ میں داخل کیا تھا۔ اسے نئے زمانے کی ایک خود مختار عورت بننا تھا۔ اس لیے شام کو وہ ایک ڈانس اسکول بھی جاتی ، اسکرٹ پہنتی۔ اس کے بال میموں کے ڈھنگ پر کٹے ہوئے تھے اور وہ اپنے ڈیڈی سے انگریزی میں بات کرتی تھی۔

چاند کی اس بدلی ہوئی روش پر س کی ننھیال میں بڑی لے دے ہوئی خود واحد حسین کو اپنی نواسی کی ننگی ٹانگیں بالکل اچھی لگتی تھیں۔ مگر وہ اپنے ولایت پلیٹ داماد سے بڑے مرعوب تھے اور ان کی ہر بات کو بے سوچے سمجھے مان لیا کرتے تھے کہ قابل آدمیوں کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی اچھی بات پوشیدہ ہوتی ہے۔

لیکن چند برس بعد شمالی ہند کے ادب میں ایک نئی تحریک ابھری اور حیدر آباد میں سروجنی نائیڈو کی زیر قیادت ترقی پسند ادیبوں کا پہلا جلسہ ہوا تو اس کے کرتا دھرتا حیدر علی خاں تھے۔ داماد کے کرتوتوں سے واحد حسین بہت خوف زدہ تھے۔ جب داماد ہی کمیونسٹوں اور دہریوں کی حمایت کرنے کھڑا ہو جائے تو اپنا بیڑا ہی فرق سمجھو۔

فرض کرو کسی باریابی کے موقع پر حضور حیدر علی خاں کے بارے میں سوال کر ڈالیں تو واحد حسین کیا جواب دیں گے؟

آپ انگریزوں کے خلاف تقریریں کرے تو ٹھیک ہے۔ مگر ان دہریے غنڈوں کی باتوں میں آ کے پولیس کے ہتھے ”چڑھ گئے تو میرے کونکو بولو۔ بھلا شریف خاندانی لوگوں کا ان غنڈوں چھوکروں میں کیا کام۔۔۔“ پھر انہوں نے سوچا نو جوانوں کو ہمیشہ مستقبل کے خوف سے ڈرانا چاہیے کہ وہ صرف اسی طرف دیکھا کرتے ہیں۔

ذرا تو سوچو حضرت! کہ ان کمنسٹوں کا راج ہو گیا تو شریف لوگوں کی عزت کاں باقی رہینگے! کبھی دُنیا میں ایسا ہوا ہے کہ غریب اور امیر برابر ہو جائیں۔ پھر کا ہے کو آپ چپ یوم پٹارہ بچاریں ؟

حیدر علی خاں جانتے تھے کہ ان کے خسر جس انداز سے سوچتے ہیں، وہ صحیح ہے۔ کیوں کہ ہر انسان کے ساتھ اس کا ماضی، اس کا تجربہ اور مفاد ہوتا ہے۔ جو اسے ایک خاص نقطہ نظر قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن یہی مصیبت خود حیدر علی خاں کے ساتھ تھی۔ ان کی نظر تمام دُنیا کے حالات پر تھی۔

ہندوستان کی سیاست اور ہندوستانی عوام کی جدو جہد کے نتائج کو وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کے سر پر وطن پرستی کا جو بھوت سوار تھا۔ وہ رزق کے بھوت سے کسی طرح کم نہیں تھا۔

اس کے باوجود جب وہ سسرال آتے تھے تو واحد حسین سے ایک مچٹیا کرنے میں کافی لطف آتا۔

جی فرمائیے ابا جان کچھ نئی خبر ہیں؟“ وہ کہا پی کر اطمینان سے بیت الغزل کے آراستہ ہال میں جا بیٹھتے۔

ہم کیا خبریں سنانا۔؟“ واحد حسین بھی فوراً پُپا نپ سلگا کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتے تھے۔

وہ آپ کی صوبائی خود مختاری کا خواب تو خوب سچا ہو امیاں“ واحد حسین کو ہنسی آ جاتی۔

لیکن سوٹ بوٹ میں ملبوس حیدر علی خاں کو خسر کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھنا پڑتا تھا۔

جی ہاؤ۔ بجا ارشاد فرمائیے آپ۔ لیکن دیکھیے تو با جان ایک یہی فائدہ ہو گیا نا کہ ہمارے دلوں سے ہر چیز کا خوف ” نکل گیا۔ غیر ملکی طاقت کا خوف۔ نئے تجربوں کا خوف۔ نئے اقدامات کا خوف۔ اظہار رائے کا خوف۔ یہ بھی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔“

اجی کیا باتاں کرتے آپ دولہا بھائی۔“ راشد بھی ایک کرسی کھینچ کر ان کے قریب آ بیٹھا تھا۔ ویسے اسے پالیٹکس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن شمالی ہند میں جو طوفان اٹھ رہے تھے ان کا تھوڑا بہت اثر یہاں بھی ہر سمجھدار تعلیم یافتہ انسان پر ہوا تھا۔

اپن تو ایک بات بولتے ہیں دولہا بھائی کہ ریاستوں کا الحاق ہوا تو اپنے ٹھاٹ باٹ ختم ہو جائیں گے۔ منصب، جاگیریں ” سب چھن جائیں گی۔ بڑے بڑے عہدے سب ہندوستانیوں جھپٹ لیں گے۔“

خیر۔۔۔ جاگیر داری تو بہر حال ختم ہو ہی جائے گی۔۔۔ لیکن جمہوریت میں ترقی پسند عناصر۔۔۔“ حیدر علی خان ” ٹھہر ٹھہر کر بات کرنا چاہتے کہ واحد حسین ان کی بات کاٹ دیتے۔

معاف کرنا میاں۔ آپ کے ان ترقی پسندوں سے تو اللہ بچائے۔ کیا بے معنی شاعری۔۔۔ کیا فحش کہانیاں۔۔۔ استغفر اللہ ”۔۔۔ اور آپ ہیں کہ ان کے سب سے بڑے حامی بنے پھرتے ہیں۔

حیدر علی خاں سٹپٹا جاتے۔ ہزاروں سال سے عیش کرنے والے ان بڈھوں سے نیٹنا مشکل تھا۔ ان کی بیرسٹری والی زبان کا سارا زور ختم ہو جاتا اور وہ رک رک کر کہتے۔

بات یہ ہے ابا جان کہ ادب میں بھی نئے تجربے کیے جارہے ہیں۔ جاگیر داری سماج میں ادب کو صرف عیش و ” عشرت اور تفریح کا ایک ذریعہ سمجھا گیا۔ غزل میں صرف عورت کے حسن کے سوا اور کوئی موضوع نہیں ملتا۔ لیکن اب ادب ”میں نئے موضوع۔۔۔“

اجی رہنے دو میاں۔۔۔ شاعری کا کون سا موضوع ہے جو نیا ہوگا۔۔۔؟“ واحد حسین پائپ کی تمبا کو جھٹک کر ” کہتے۔۔۔“ وہی عشق و عاشقی کا موضوع۔۔۔ بھلا اس میں کیا جدت ہو سکتی ہے۔۔۔؟

ایسے وقت وہ خود ایک بات بھولنے کی کوشش کرتے کہ انہوں نے عشق میں کیسی جدت پیدا کرنے کی کوشش کی (ہے)

اب آپ ہی بتاؤ حضرت کہ شاعری میں معشوق کی بجائے شاعر کس کی سراپا نگاری کرے گا ؟ بھلا مزدوروں کے ” کام پر کہیں غزل لکھی جاتی ہے؟ یا پھر مشینوں کے پرزوں کی تعریف ہوتی ہے۔

(اس بات پر راشد اور واحد حسین کو بڑے زور کی ہنسی آجاتی تھی)

اور پھر یہ بتائیں دولہا بھائی کہ آپ کے کمیونزم کے دور میں یہ کیا انصاف ہوگا کہ ہماری دولت چھین کر آپ ” غریبوں کو دیدیں گے۔ یہ بھی تو سخت نا انصافی ہوگی نا کہ دھیڑ چمار کسی خاندانی نواب کے برابر ہو جائیں۔“ راشد کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

لیکن ایسی تو بہت کی نا انصافیاں سہنے کے لیے تیار ہو ہی جائے راشد میاں۔“ حیدر علی خاں کی آواز میں اب کافی ” تلخی آجاتی تھی۔

”جب الیکشن جیت کر کوئی کھیت مزدور آپ کا آقا بن جائے گا تب آپ انصاف کی بات سوچنا۔“

ایسے موقعوں پر واحد حسین کا بلڈ پریشر اچانک بڑھ جاتا تھا اور وہ بڑے غصے میں کہتے۔

دیکھو حیدر پاشا! آپ کے خلاف سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹ علی پاشا تک پہنچ گئی ہے کہ آپ فاشزم کے بہانے بین الاقوامی حالات کا سہارا لے کر اندرونی سیاست پر تقریریں کرتے ہیں۔ کمیونسٹوں کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔“ وہ داماد کو خطرے سے آگاہ کرتے۔

یہ شہر یور کا مہینہ تھا۔

فضا میں ایک طرح کی غنودگی اور مستی آمیز کیف سا چھایا ہوا تھا۔ ”ایوان غزل“ میں فضا اور بھی خوشگواہی لگتی۔ کیوں کہ اس ڈیوڑھی کے مکین اپنی اپنی ذات میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کا باہر کی دنیا سے بہت کم رابطہ تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کرپس کی تجاویز کانگریس نے رد کر دی تھیں اور جناح کے پیچھے مسلمان چلاتے پھر رہے تھے۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔۔۔ پل ٹوٹ رہے تھے۔ ریلیں لڑھک رہی تھیں۔ ہندوستان کے تمام اہم لوگوں نے ”سر“ کے خطاب واپس کر دیے تھے۔ لیکن حضور نظام کو ان خبروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ روز رات کو ایک غزل کہتے تھے جو مقامی اخباروں میں استاد جلیل کی رائے کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع ہوتی تھی۔ اور اس اخبار کو عوام احتراماً کبھی ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکتے تھے۔ مالک سے وفاداری اور محبت دکن کے عوام کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی۔ ہر روز جب حضور نظام کی سواری سڑکوں سے گزرتی تھی تو قطاروں میں کھڑے ہوئے عوام ان کے دیدار کے لیے گھنٹوں ٹھہرتے تھے۔ اور تا ابد اس ریاست کے قائم رہنے کی دُعاؤں صبح شام کرتے تھے۔

اس دن بھی ”ایوان غزل“ میں حسب معمول صبح کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ واحد حسین باغ کی سیر سے فارغ ہو کر اخبار لیے اندر آئے تو چاند سامنے دالان میں ناچ رہی تھی۔ مگر نا نا حضرت کو اندر آتے دیکھ کر وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاتے رضیہ کے کمرے میں بھاگ گئی۔ چھٹی کا سارا دن وہ اپنی ننھیال میں گزارتی تھی۔ کیونکہ گھر میں ڈیڈی بات بات پر اسے ٹوکتے تھے۔ لیکن یہاں وہ اپنے ماموں اور ممانی کی بڑی چہیتی تھی۔

چاند کی اس بدلی ہوئی روش پر سب سے زیادہ بی بی خوش تھیں۔ کیوں کہ وہ ایک جھونپڑی سے اس ڈیوڑھی میں آئی تھیں اور جانتی تھیں کہ عورت چاہے محل میں ہو یا جھونپڑی میں وہ ایک ہی دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔ لیکن چاند کو پڑھتے دیکھ کر انہیں آس بندھتی کہ وہ اس دائرے کو توڑ کر نکل جائے گی۔

واحد حسین اندر آئے تو ان کی آمد کا خلاف توقع کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ کیوں کہ اندر رضیہ دردوں سے تڑپ رہی تھی اس لیے لنگڑی پھوپو اور بی بی وہیں اسے تھامے بیٹھے تھے۔ دالان میں سرخ مدرے کا دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ اس پر بڑی بڑی قابوں میں کھجڑی، مسکہ، قیمہ، اچار، پاپڑا اور واحد حسین کے لیے اُبلے ہوئے انڈے رکھے تھے۔ اور مالن بی سر پر پلو ڈالے ہاتھ میں پنکھا لیے بیٹھی تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ واحد حسین کھانا شروع کر دیں۔ واحد حسین معاملے کی نزاکت سمجھ گئے۔ اس لیے آواز کو دھیمہ کر کے مالن بی سے پوچھا۔

”راشد میاں کہاں ہیں۔۔۔؟“

”جی انوں موٹر لے کر ڈاکٹرنی کو لانے گئے ہیں۔“

ہونہ۔۔۔“ واحد حسین نے بے دلی سے بیسن کے آگے ہاتھ بڑھا دیے اور جب سلا رو نے ان کے ہاتھ دھلا کر تولیہ ”بڑھائی تو انہوں نے دستر خوان پر بیٹھ کر وہی تولیہ اپنے گھٹنوں پر پھیلا دی اور بسم اللہ کر کے کھجڑی کی قاب کھولی۔ مگر آج ان کا جی کھانے میں نہیں لگ رہا تھا۔ دوسرے پوتے کی آمد کی خوشی اور گھبراہٹ دونوں بیک وقت انہیں بے چین کیے دے رہی تھیں۔

آج اس گھر میں ایک نئے فرد کی آمد ہے۔۔۔ ابھی کل ہی انہوں نے راشد کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنی تھی۔۔۔ بالکل ایسی ہی صبح تھی۔۔۔ ایسا ہی موسم۔۔۔ اور آج راشد کا دوسرا لڑکا آ رہا ہے۔۔۔ یہ نئے نئے بچے کیا کرنے آ رہے ہیں۔۔۔ واحد حسین

کا ہاتھ رکابی میں تھم گیا۔۔۔ ٹیگور کہتے ہیں خدا دنیا سے مایوس نہیں ہے اس لیے نئے بچے کو بھیجتا ہے۔ لیکن وہ ہر پرانے بچے سے مایوس ہو چکا ہے، یہ بھی تو دیکھیے۔ قرض اور رہن کی دیمک بھری جائداد کے لیے بھائیوں کی لڑائیاں، بے ایمانی اور دھاندلی، اونچے عہدوں اور خطابوں کے لیے بھاگ دوڑ۔۔۔ اور پھر کسی عورت کے لیے سب کچھ ہار دینا۔۔۔ بس واحد حسین کے لیے زندگی کا مقصد یہی تھا۔۔۔ ہر انسان صرف اپنے ہی لیے تو جیتا ہے۔۔۔ نواسوں پوتوں کی خوشی دیکھنا۔۔۔ بیٹے کو پھلتے پھولتے دیکھنا۔۔۔ تا کہ اپنی اُنا کی تسکین ہو سکے۔۔۔ آج وہ اپنی ترکی ٹوپی کو ذرا اور اونچا کر کے نکلیں گے۔ دو پوتوں کے دادا۔۔۔ دولاکھ کے مالک۔۔۔ ہر پوتے کو وہ ایک پرامیسری نوٹ بنا کر کیش کر لیں گے۔۔۔ اسی لیے تو بیٹے کی آمد پر خوشی منائی جاتی ہے۔

انگن میں بسم اللہ ہی اپنے بچے کو مار رہی ہے شاہین کی آیا اسے جو کپڑے پہنا رہی ہے وہ شاہین پہننا نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ بار بار قمیص اُتار کے چلا رہا ہے۔ شاہین کو ضد کرتے دیکھ کر واحد حسین نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا اور آیا کو ڈانٹ دیا کہ چھوٹے نواب کی مرضی کے بغیر ان کا کوئی کام نہ کیا جائے۔ انہیں اپنا پوتا بے حد عزیز تھا۔ اتنا پیارا کہ اس کے مقابلے میں اپنا پڑھا لکھا جوان بیٹا بھی اچھا نہ لگتا۔ وہ لوگوں سے مسکرا کے کہتے تھے۔۔۔ ”بات یہ ہے کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔“

اری او قیصر ذرا بابا کی ریٹی اٹھالا نا۔“ آیا نے پکارا تو قیصر دوڑی دوڑی آئی۔ نو دس برس کی دہلی پتلی سی ” لڑکی تھی۔ اٹنگا سا پاجامہ اور پھٹا ہوا میلا کرتا پہنے۔ اس کی صورت دیکھیے تو سب سے پہلے اس کی روشن آنکھوں پر نگاہ جاتی جو دیوں کی طرح جھلملاتی سی لگتیں۔ اور وہ پلٹ کر جانے لگتی تو اس کی غیر معمولی لمبی چوٹی پر نظر ٹھہر جاتی تھی۔ اتنی سی لڑکی کی اتنی بڑی چوٹی۔۔۔

قیصر آ کر واحد حسین کے پاس کھڑی ہو گئی تو انہوں نے غور سے دیکھا۔۔۔ آج انہیں بڑا تعجب ہوا۔ یہ اتنی بڑی !ہو گئی

یہ فاطمہ بیگم کی بیٹی ہے نا۔“ قصر اکثر ڈیوڑھی میں آتی رہتی تھی مگر واحد حسین نے اسے بہت زمانے سے ” نہیں دیکھا تھا۔

جی ہاؤ بھائی۔۔۔“ فاطمہ بیگم چاول صاف کرتے کرتے سر پر پلو سنبھال کر پیچھے آکھڑی ہوئیں۔

اتنی بڑی ہو گئی ہے بھائی جان بچی۔ پڑھنے کی بہت ضد کرتی ہے۔ کیا کروں۔ اس کے باوا کا انتظار کرتے کرتے ” بارگئی۔“ آج زمانے سے انتظار میں بیٹھی ہوئی فاطمہ بیگم نے اپنی عرضی ان کے حضور میں پیش کر دی۔ مگر بہت ڈرتے ڈرتے نہایت دھیمی آواز میں۔ واحد حسین شاہین کو سنبھالے خاموش بیٹھے رہے۔

”ہاں واقعی تمہیں بڑی مشکل ہو رہی ہوگی۔ خیر اگلے مہینے سے دس روپے ہر مہینہ یہاں سے لے جایا کرو۔“

مگر قیصر کے باوا۔“ فاطمہ بیگم سے شرم اور غم کے مارے پوری بات نہیں کہی گئی۔

وہ تو مجبوری ہے فاطمہ بیگم ” واحد حسین نے انہیں رسان سے سمجھایا۔

احمد میاں بچارے کیا کر سکتے ہیں؟ اگر غلام رسول کو چھوڑ دیں تو دوسرے کھیت مزدور بھی کہیں گے کہ ہمیں ” بھی چھوڑ دو۔۔۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی بچی کو لے کر اورنگ آباد چلی جاؤ۔

جی ہاؤ۔۔۔ مگر قیصر نہیں جاتی۔ اسے اُجالا بھابی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ اجاڑ صورت تو مجھے کہیں چین نہیں ” لینے دیتی۔“ فاطمہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور مایوسی کے ساتھ پھر چاول صاف کرنے لگی۔

فاطمہ بیگم وہ خاردار جھاڑی تھیں جو پھولوں کی کیاری میں نکل آتی ہے۔ واحد حسین کے ابا بچوں کی آنے دن کی پیدائش سے گھبرا گئے۔ اور کسی ستم پیشہ معشوقہ کے غم میں نڈھال پڑے تھے تو جی بہلانے کے لیے انہوں نے فاطمہ بیگم کی ماں سے عقد کر لیا۔ مگر سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ بیوی بھی میاں کی صورت دیکھ کر ابکائیاں لینے لگی۔ کہتے ہیں کہ جب نواب صاحب نے یہ خبر سنی تو مارے طیش کے اس عورت کو کوٹھری میں بند کر دیا۔ اور پھر جب یہ خبر سنی کہ ایک عدد صاحبزادی تشریف لائی ہیں تو نڈھال ہو کر گر پڑے۔ واحد حسین کہتے تھے کہ اس دن کے بعد

ابا جان کو لوگوں نے لحد میں اتارنے کے لیے ہی اٹھایا۔ بعد میں واحد حسین اور احمد حسین نے وصیت نامہ دیکھا تو اس میں کہیں فاطمہ بیگم کی ماں کا ذکر نہ تھا۔ اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت ملا کہ ان کے ابا نے کوئی اور نکاح کیا تھا۔

احمد حسین تو یہ سمجھتے تھے کہ اب یہ بلا زندگی بھر کے لیے گلے پڑ جائیگی مگر واحد حسین نے بڑی ہمدردی سے کام لے کر فاطمہ بیگم کی ماں کو کچھ مابانہ مقرر کر دیا کہ لاوارث بے سہارا عورتوں کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور پھر بارہ تیرہ برس کی فاطمہ بیگم کا عقد احمد حسین کے ایک کھیت مزدور غلام رسول سے کر دیا۔ یہ شادی انہوں نے اپنے خرچ سے کی تھی۔ مگر اتنے بڑے جاگیردار کی منہ بولی بہن کو بیابانے کے لیے غلام رسول کے باپ کو کچھ پیسے کی ضرورت پڑی۔ اس لیے اس نے احمد حسین کے یہاں اپنے بیٹے کو پانچ سو روپے کے عوض رہن رکھ دیا۔ اس وقت گاؤں میں کھیت مزدوروں کو بڑی آسانی سے رہن رکھا جاتا تھا۔ مقررہ میعاد تک مزدور دن رات مالک کا کام کرتا تھا۔ اس میں اس کا کھانا اور کپڑا شامل نہیں ہوتا۔ اس دوران اسے مالک کے پیسے لوٹا دینے ہوتے ورنہ رہن کی میعاد اور بڑھ جاتی تھی۔ اور کوئی مزدور معاہدے کی خلاف ورزی کر کے کہیں بھاگ جاتا تھا تو گاؤں میں اس کی کوئی عزت باقی نہ رہتی۔ کیوں کہ انسان کی زبان ہی تو سب سے زیادہ قابل بھروسہ شے ہے۔ جو شخص اپنی زبان سے پھر جائے اسے کون عزت دے گا۔ یہ بھی گاؤں کا ایک ایسا قانون تھا جو دوسرے قوانین کی طرح ہر ایک کو قبول کرنا پڑتا۔ اس لیے غلام رسول بھی دن بھر احمد حسین کے کھیتوں میں کام کرتا۔ وہاں کام نہ ہوتا تو اجالا بیگم ڈیوڑھی میں دوسرے کاموں پر لگوا دیتیں۔ لکڑیاں پھاڑنا، سرکار کے پاؤں دبا تا، بیگم صاب کے کپڑے دھونا، کوڑی پھیرا بازار کا کرنا۔ یہ اور دوسرے سارے چھوٹے موٹے کام تھے۔ فاطمہ بیگم بھی چلی جائیں تو ایک ماما اور ایک چھوکری کو اجالا بیگم اور نکال دیتیں۔ تنخواہ دے کر نو کر رکھو تو اس کے چلے جانے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ مگر انہیں معلوم تھا کہ فاطمہ بیگم اور قیصر کہیں نہیں جائیں گی۔ اس لیے وہ دن رات جوتی لیے ان کے سر پر سوار رہتیں۔ فاطمہ بیگم ہر ظلم سر جھکا کر سہ لیتیں۔ مگر قیصر بڑی منہ پھٹ اور زبان دراز تھی۔ کئی بار اس نے پلٹ کر اجالا بیگم کو منہ توڑ جواب دیا اور اپنا منہ ان کے جوتوں سے کچلوا کے وہاں سے نکلی۔ اس طرح بارہ برس گزر گئے۔ فاطمہ بیگم کا دولہا اپنا قرض ادا نہیں کر سکا تھا اس لیے رہن پڑا تھا۔

فاطمہ بیگم شہر آگئی تھیں۔ کہیں ایک جھوپڑی میں رہتی تھیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے پاپڑ اور اچار بنا کر بیچتیں۔ قیصر اسکول جاتی تھی۔ باقی وقت میں فاطمہ بیگم عزیزوں رشتہ داروں کے ہاں چھوٹے موٹے کام کر کے کچھ پیسے لے آتیں۔ ہر مہینے چار پانچ دن کے لیے وہ بی بی کے ہاں آجاتی تھیں۔ اچار ڈالنے، مسالے کوٹنے اور چاول صاف کرنے کے بہانے بی بی انہیں تین چار روپے دیدیتی تھیں۔ اس کے علاوہ پھٹی پرانی ساڑیاں جی سے اترے ہوئے کپڑے، اور خیر خیرات کی مستحق بھی وہی سمجھی جاتی تھیں۔ قیصر اوپر کے کام پر لگادی جاتی۔ مگر قیصر اپنی ماں کے برخلاف بڑی تیز مزاج تھی۔ محلے کے ہر بچے سے فوراً لڑنے بیٹھ جاتی۔ جب وہ چھوٹی سی تھی تو عائد اسے پیپر منٹ کی گولی کے بہانے کونین کی گولی کھلا دیتی تھی۔ راشد ایک پیسہ دینے کے بدلے اسے ایک گھنٹے تک گرمی کی دھوپ میں کھڑا کر دیتا تھا۔ پھر جب وہ پیسے کا مطالبہ کرتی تو اسے انگوٹھا دکھا کر سب کا ہنستے ہنستے برا حال کر دیتا تھا۔

توبہ۔ پیسے کا کتنا لالچ ہے اس چھوکری کو ابھی سے۔“ بشیر بیگم ناک سکوڑ کر کہتیں۔

جب رضیہ اپنے جہیز کے گراموفون پر بیواور سر پندر کا ریکارڈ بجاتی۔

تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا“ تو قیصر سخت حیران ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ سب چاند کی شرارت ہے۔ وہی اس ” صندوق میں چھپ کر گاتی ہے۔

سارا گھر قیصر سے نوکروں کی طرح کام لیتا تھا۔ لنگڑی پھوپو اس سے اپنے پاؤں دبوائیں۔ بتول اپنے بچوں کو تھما دیتی۔ واحد حسین کو فاطمہ بیگم کے ہاتھ سے بنے ہوئے اچار چٹنیاں بہت پسند تھیں۔ اس لیے فاطمہ بیگم آم پھلنتیں تو قیصر مسالہ کوٹتی۔ چاول صاف کیے جارہے ہیں۔ دونوں ماں بیٹیاں مل کر چولہے سنوار تیں۔ رضانیوں لحافوں میں دھاگے ڈالتیں۔ زندگی گرم دودھ بن گئی تھی کہ نکلتے بنتی نہ اگلتے۔ بدلے میں تین چار دن کھانا مفت مل جاتا۔ بشیر بیگم چاند کی پرانی فراکیں دے دیتیں کہ یہ چاند کو چھوٹی ہوگئی ہیں حالاں کہ قیصر چاند کی ہم عمر تھی اور قد میں چاند سے بھی لگتی تھی۔ وہ چاند کی اترن پہنتے وقت بہت روتی تھی۔ کیوں کہ چاند کی اس سے بھی نہ بنتی۔ وہ چاند کی اترن پہنتے وقت خوب شور مچاتی اور دانتوں سے فراک پھاڑ دیتی تھی کیوں کہ چاند اور اس کی سہیلیاں مل کر اسے خوب چڑاتی تھیں۔ چاند کا خیال تھا کہ قیصر تانی کے ہاں بہت سی چیزیں چرا کر لے جاتی ہے۔ جبھی تو ایک بار اس کی ربن کھو گئی تھی اور ایک بار فاطمہ بیگم کے جاتے ہی رضیہ کے پرس میں ایک روپیہ کم تھا۔

مگر بتول بیگم اور بشیر بیگم کو رشک آتا تھا تو قیصر کے لمبے بالوں پر۔ بشیر بیگم نے چاند کے بال بڑھانے کے لیے تمام نسخے آزمائے اور آخر اپنے میاں کی بات مان کر اس کے انگریزی فیشن والے بال کٹوا دیئے۔ اس لیے بشیر بیگم بار بار فاطمہ بیگم کو ٹوکتی تھیں۔

اجی فاطمہ پھوپو! لوگاں بولتے کتے لمبے بال نحوست کی نشانی ہوتے ہیں۔ اس کے بال کٹواد و توتماہاریدلدر دور ” ہوجائیں گے۔“ کبھی وہ ہنس کر کہتیں۔۔۔۔۔ ”قیصر کی چوٹی خوب لمبی ہے نا شو ہر کو چوٹی پکڑکے نکالنے میں آسانی ہوگی۔“

ان کی بات پر دونوں بہنوں کو ہنسی آگئی۔ پھر بتول بیگم نے ہنستے ہنستے کہا۔

اور یہ قیصر ہے کیسی زبان دراز۔ دیکھنا ایک دن بھی سسرال میں نہ ٹکے گی۔ پھر وہ سنجیدہ ہو کر فاطمہ بیگم سے ” کہتیں۔

تم تو خود ہی دمڑی دمڑی کو محتاج ہو۔ اس کے اتنے بہت سے بالوں کے لیے کتنے کا تیل منگوانا پڑتا ہوگا۔ تھوڑے ” بال کاٹ دو۔“

مگر فاطمہ بیگم کسی بات کا جواب نہ دیتیں۔ سر پر پلو کھینچ کر چاولوں میں سے کنکر نکالے جاتی تھیں۔

تم نہیں کاٹتیں تو لاؤ میں کاٹ دوں۔“

بشیر بیگم ادھر ادھر قینچی ڈھونڈنے لگیں۔

واحد حسین دالان سے اٹھ کر کمرے میں آئے تو غالباً رضیہ کی طبیعت کچھ ٹھیک ہو چلی تھی۔ کیوں کہ بی بی اور لنگڑی پھوپو دالان میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اور بی بی سلارو سے جھگڑ رہی تھیں۔

”جب ٹماٹر چار آنے سیر تھے تو تم پانچ آنے سیر کیوں لائے؟“

زمانہ کدھر جا رہا ہے۔۔۔۔۔“ واحد حسین نے پانپ کا کش لگا کر سوچا۔“

”چلو جانے دو بھابی پاشا۔ دلہن کی طبیعت خراب ہے۔“

شور نکو کرو۔“ لنگڑی پھوپو نے کہا۔ ”

”مگر کیسے جانے دوں گو ہر بیگم، ایک آنہ پھکٹ آتا کیا۔۔۔؟“

بعض وقت بی بی کو بیگم بننے کا خبط سوار ہوتا۔ مگر ہمیشہ بے موقع ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ واحد حسین نے سوچا اور پھر انہیں اپنے دادا کی وہ کہانی یاد آئی جو خاندان کے بچے بچے کو زبانی یاد تھی کہ ایک دن دادا حضت نے اپنے مالی سے شرط

لگائی کہ گلاب کی یہ کلی فلاں دن تک کھلے گی۔ مقررہ دن جب نواب صاحب فجر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھتے ہوئے باغ میں آئے تو مالی نے آگے بڑھ کر کہا۔

”سرکار آج اس پھول کو ننیں دیکھے۔۔۔؟“

”ہوں اچھا ہے۔“

مگر اس دن سرکار شرط لگانے تھے کہ وہ جمعرات تک کھلے گا اور آج بدھ ہے (اس مالی کا قلم بھی اسی ڈیوڑھی میں بویا گیا تھا)

ارے ہؤ۔۔۔۔۔ ”سرکار رُک گئے۔“

”امیں تیرے سے کوئی شرم بھی تو لگایا تھا“

جی۔۔۔۔۔ جی سرکار۔۔۔۔۔ ”مالی ہاتھ جوڑ کر کھسیا گیا۔“

تو پھر کیا ہونا تجھے۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے لا پرواہی سے پوچھا۔

ہیں ہیں ہیں۔ سرکار مائی باپ ہیں۔ ”مالی کچھ نہ بولا۔“

”منشی صاب کو بلاؤ۔۔۔۔۔“

اتنے سویرے کی طلبی پر ہانپتے کانپتے منشی صاحب حاضر ہوئے۔

قلمدان میں کتنی رقم ہے۔۔۔۔۔؟“ سرکار تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

”جی سرکار کل ہی تحصیل کے روپے آگئے ہیں۔ میرا خیال ہے ساڑھے چار ہزار۔۔۔ پانچ ہزار۔۔۔۔۔“

وہ رقم مالی کو دیدی جائے۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا۔۔۔ مالی کے ساتھ ہی جو دوسرے نوکر اس حکم کے منتظر تھے۔ منتشر ہو گئے کیوں کہ یہ کوئی غیر معمولی بخشش نہیں تھی۔

گو ہر پھو پو جانتی تھیں کہ اس مالی کا بیٹا پڑھ لکھ کر کہیں نوکر ہو گیا اور اس کا پوتاملیشم راشد کے ساتھ انجینئر تھا اور اب راشد کے ساتھ ہی بزنس کرتا تھا۔ سامنے ہی نیا فیشن کا ان کا بنگلہ تھا۔ دونوں پہلے بار تھے کیوں کہ واحد حسین کے اس خاندان سے گہرے تعلقات تھے۔ ملیشم کے باپ کو واحد حسین ”راجہ“ کہتے تھے۔ بولی دیوالی اور دسہرے کے دن سب ملیشم کے ہاں جاتے تھے۔ راشد دیوالی کی رات ملیشم کے ساتھ ضرور جوا کھیلتا۔ بونال کی پوجا دیکھنے وہ دونوں ساتھ ساتھ سکندر آباد جاتے تھے۔ اس دن پوجا کے لیے آنے والی، نہانی دھونی سنگار پٹار کرنے والی عورتوں کو چھیڑنا اور ایک آدھ کو بہکا کر اپنے ساتھ لے آنا ان کے لیے ضروری تھا۔

ملیشم کا لڑکا نارائنا چاند کا کلاس فیلو تھا اور دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ چاند نارائنا سے کھیلنے کے لیے ہر چھٹی کے دن ”ایوان غزل“ آتی تھی۔

”اجی گوہر بیگم! کیا بیٹھے بیٹھے سو گئے۔؟“

بی بی نے انہیں جھنجھوڑا تو وہ چونک پڑیں۔

کیا ہے۔۔۔۔۔! کیا درد بڑھ گیا۔۔۔۔۔! ”وہ چونک کے اٹھ بیٹھیں۔“

”بتول بیگم کے سسرال سے اردلی آیا ہے۔“

”ایو۔۔۔ کیا خبر لایا ہے جانے۔۔۔؟“

پیش دالان میں لوگوں نے گھیرا سا ڈال لیا تھا۔ بیچ میں سفید وردی میں ملبوس، صافہ باندھے کمر پر ”الف لیلہ“ کی بیلٹ کسے، ایک سیاہ فام اردلی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مہر لگا ہوا ایک بڑا سا لفافہ تھا۔

بتول کی سسرال ”الف لیلہ“ میں لوگ اسی ٹھاٹ سے جیتے تھے۔ ہر بات میں اصول اور ضابطے اور وہ تمام قاعدے قرینے برتے جاتے تھے جو آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ان کے لکڑ دادا نے مقرر کیے تھے۔

بتول کے خسر الحاج مسکین علی شاہ طوطا چشمی کے ہاتھوں سے زمانے کی ہوائیں ساری روایتوں کو اڑالے لیے جارہی تھیں۔ ان کے باپ دادا ایک زمانے تک حیدر آباد کے نوابوں جاگیرداروں کی حاجتیں پوری کرتے رہے۔ کیوں کہ وہ درگاہ حضرت رحمت علی شاہ کے سجادہ نشین ہیں۔ یہ بہت بڑے بزرگ کا آستانہ تھا جہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ سر جھکانے آتے تھے۔

اس لیے یہ وہ دولت تھی جسے کبھی زوال نہیں آتا۔ سب دولت مندوں کی حاجت روائی اور جاگیرداروں کے بگڑے کام بنانے کا ٹھیکہ خود الحاج مسکین علی شاہ کے مبارک مشکل کشا ہاتھوں میں تھا۔ مگر جانے کیوں اب اس خاندان کے ہاتھوں میں وہ مسیحائی نہیں رہی تھی۔ اور اس درگاہ سے بھی حاجت مند خالی ہاتھ لوٹنے لگے تھے۔ مسکین علی شاہ طوطا چشمی یہ سوچ سوچ کر حیران تھے کہ روایتوں کے گرتے ہوئے ان ستونوں کو کیسے تھا میں! جدھر دیکھیے روایتیں، رکھ رکھاؤ اور ٹھاٹ باٹ کی محفلیں تتر بتر ہو رہی تھیں۔

اب یہ عالم تھا کہ اپنی چاروں بیویوں کو ان کے اٹھارہ بچوں سمیت انہوں نے ”الف لیلہ“ میں بند کر دیا تھا۔ اور خود آنکھیں بند کیے دل کے دوروں کو دبائے، درگاہ کے ایک حجرے میں پڑے رہتے تھے۔

درگا ”الف لیلہ“ کے احاطے ہی میں تھی۔ بلکہ درگاہ کو دنیا کے لہو ولعب سے بچانے کے لیے سرکار نے جو زمین عنایت کی تھی۔ مسکین علی شاہ کے دادا نے اس پر ایک شاندار حل ”الف لیلہ“ تعمیر کروادیا تھا تا کہ ان کی اولاد، درگاہ کو ہر قسم کی بلاؤں سے پاک رکھنے کے لیے اس محل میں بیٹھی رہے۔ کہتے ہیں ایک بار مسکین علی شاہ کے دادا کو ایک جھونپڑے میں پڑا دیکھا تو کہا

جا تیرے لیے ہم ایک الف لیلہ کی کہانی جیسا محل بنوادیں گے۔۔۔۔“ چنانچہ انہوں نے اپنی ڈیوڑھی کا نام ”الف لیلہ“ ہی رکھا۔

اب مسکین علی شاہ طوطا چشمی کا یہ عالم تھا کہ شہر میں کچھ ہو جائے، عزیزوں رشتے داروں میں موت ہو یا شادی۔ وہ کبھی درگاہ سے باہر نہ نکلتے تھے۔

اس درگاہ کے بارے میں مشہور تھا کہ رحمت علی شاہ ایک دن مسکین علی شاہ کے دادا کے خواب میں آئے اور کہا کہ فلاں جگہ میرا مزار کھود کر برآمد کیا جائے تو ان کی اولاد کبھی بھوکی نہ رہے گی۔ چنانچہ اس درگاہ کے فیض کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے خود سر یہاں آکر سر جھکا لیتے تھے۔

اب کوئی مسکین علی شاہ طوطا چشمی سے، باہر نہ نکلنے کی وجہ پوچھتا تھا تو وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے۔

”مجھے جو حکم ملتا ہے سو تعمیل کرتا ہوں۔“

اسی وجہ سے تو یہ بات مشہور تھی کہ مسکین علی شاہ کے تعویذ گنڈے وہ کام کرتے ہیں جو وکیلوں اور دلالوں کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

الف لیلہ“ کے ٹھاٹھاٹ کے بارے میں بڑی شاندار روایتیں مشہور تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ رحمت علی شاہ ہر رات ” مسکین علی شاہ کے سرہانے ایک ہزار روپے کی تھیلی رکھ جاتے تھے۔ مسکین علی شاہ جناتوں کو پڑھاتے ہیں جو روزانہ ایک تھیلیا بھر کے کونلے انہیں دیتے ہیں۔ مگر صبح کو وہ کونلے سونے کے ٹکڑے بن جاتے ہیں۔ کوئی ان باتوں سے انکار بھی کیسے کرتا ! کیوں کہ اس ڈیوڑھی کی عورتیں اور لڑکے وہ ٹھاٹھاٹ کرتے جو بڑے بڑے جائیگاہ والوں کو بھی نصیب نہ تھے۔

اسی لیے مسکین شاطوطا چشمی کی کرامتیں عورتوں میں بہت مشہور تھیں۔ کیوں کہ جس طرح امیروں اور غریبوں کے بازار اور سوسائٹی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ویسے ہی درگا ہیں اور مندر بھی بٹ جاتے ہیں۔

رحمت علی شاہ کے مزار کی سونے کی جالی، سچے موتیوں کا شامیانہ اور عالیشان عمارت کی ایک ایک اینٹ ان نامورسخی دا تاؤں کا نذرانہ تھی جنہوں نے سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی لیے بڑی بڑی بیگمات یہاں آ کر سجدے کرتی تھیں اور اپنی کسی سوکن کی موت کا فرمان لے کر اٹھتیں۔

بڑے بڑے جاگیر دار آتے اور اپنے حریف کی شکست کا اعلان لے کر جاتے۔ یہاں سے عورتوں نے گودیں بھریں اور مردوں نے تجوریاں۔ عرس ہوتا تو ایک ہزار مسکینوں کو مفت کھانا کھلایا جاتا تھا۔

مسکین علی شاہ بڑی مسکین صورت بنا کر کہتے تھے کہ ”فقیر تو خود دانے دانے کو محتاج ہے۔ اس کی بھلا کیا“ جرات ہو سکتی ہے کہ اتنے لوگوں کا کھانا کھلانے۔ یہ سب پیر و مرشد کی برکت ہے، ان کا کرشمہ ہے۔

اس لیے مسکین علی شاہ کا گورا چٹا رنگ، خضاب لگی سیاہ داڑھی والا چہرہ زلفوں کے بیچ چاند کی طرح دمکتا تھا۔ جس وقت وہ سیاہ زرق برق عمامہ پہنے، سر پر مشہد کا رومان باندھے، ہاتھ میں تسبیح لیے، اپنی سرخ سرخ بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کسی بی بی کو دُعا دیتے تھے تو عجیب سانور چاروں طرف پھیل جاتا تھا۔ ملائک ادھر ادھر اپنے نیل گوں لباس پر حریری پنکھے لگائے گھومتے۔ کہکشاں کا راستہ مسکین علی شاہ کے قدموں تلے سے ہو کر عرش بریں تک چمکتا نظر آتا تھا۔

پھر اپنا وجود غائب ہونے لگتا۔ گناہ گار بدن جہر جہر گرنے لگتا اور ننگی روح شرما کے چاہتی کے مسکین علی شاہ مینسماجائے۔

مسکین علی شاہ کو عورتوں کی اس بے پناہ عقیدت نے بڑا پریشان کیا تھا۔ سنا ہے مراد علی کی جوان لڑکی تو اس لیے پاگل ہو گئی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر مسکین علی شاہ کو پکارتی تھی۔ اس کی طویل بیماری سے عاجز آکر ایک دن مراد علی اپنی لڑکی کو لانے اور مسکین علی شاہ طوطی چشمی کے قدموں میں ڈال دیا۔

مسکین علی شاہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک نوجوان نامحرم لڑکی کو کیسے اپنے حجرے میں پڑا رہنے دیں۔ بالآخر ان کی اعلیٰ ظرفی کام آئی اور انہوں نے مجبوراً اس لڑکی سے نکاح کر لیا۔

الف لیلہ“ کا ایک کمرہ اس لڑکی کو دیدیا گیا۔ اب یا تھا! مسکین علی شاہ کی اس عنایت کی دھوم مچ گئی۔ سارے ” نوابوں، جاگیرداروں کی بیگموں کو ایک ستا نسخہ ہاتھ آگیا۔

ادھر لڑکیاں تھیں کہ اٹھتی جوانی کی سرشاری میں کھونے کی بجائے مسکین علی شاہ کی صورت دیکھتے ہی لوٹن کیوتر بن جاتی تھیں۔ اس طرح ”الف لیلہ“ کے احاطے میں نئے نئے کمروں کا اضافہ ہوتا گیا اور بچارے مسکین علی شاہ کو بہت سی پرانی وفادار بیویوں کو محض اس لیے طلاق دینا پڑی کہ اللہ میاں نے بیک وقت چار سے زیادہ نکاح جائز قرار نہیں دیئے۔

مگر نجات کی تلاش میں بھٹکنے والی یہ روحیں ان کمروں میں بھی یوں تڑپتی تھیں جیسے جال میں مچھلیاں۔ دیواروں سے سر پھوڑتیں۔۔۔ بچوں کو مارتیں۔ سوکنوں سے لڑتیں اور مسکین علی شاہ کی صورت دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی تھیں۔

لوگ کہتے تھے کہ مسکین علی شاہ کے ہاں اتنے ہیرے ہیں کہ ان کے ہاں ہر عورت ہیرا چاٹ کر مرتی ہے۔

واحد حسین نے بھی ”الف لیلہ“ کے ان شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے قصے سنے تو ان کی رال ٹپک پڑی۔ کیوں کہ جب سے جاگیر کی ناؤڈ گمگنائے لگی تھی تو وہ بچاؤ کے لیے چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ انہوں نے راشد کی شادی شہر کے سب سے بڑے بزنس مین کی لڑکی رضیہ سے کی تھی۔ بشیر بیگم اور بتول بیگم بھی اپنی صورت شکل میں ”ایوان غزل“ کی تمام روایتوں کو سمیٹ لاتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے بشیر بیگم کے لیے تو لندن پلٹ حیدر علی خاں منتخب کیے۔ کیوں کہ بشیر بیگم بے حد تیز مزاج خود سر اور تیز زبان تھیں۔ مگر بتول بیگم اپنی ماں کی صورت کے ساتھ ساتھ مزاج بھی وہیں لانی تھیں۔ چپ چاپ، اپنے آپ میں گم اور حالات کے آگے سپر ڈالنے کو تیار۔ اس لیے مسکین علی شاہ نے اپنے بیٹے ہمایوں علی شاہ کا پیغام بتول بیگم کے لیے بھیجا تو ”ایوان غزل“ میں چراغ جل اٹھے۔

بتول بیگم اب سرال سے میکے آتی تھیں تو ساتھ میں دو پہرے دار اور ایک لونڈی بھی آتی۔ میکے کے علاوہ انہیں اور کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی کہ یہ مرشدوں کا دستور تھا کہ لوگ ان کے آستانے پر حاضری دیں۔ وہ خود بھی اپنی چوکٹ نہ لانگیں۔ میکے جانے سے پہلے بھی بتول بیگم کو ایک عرضی مسکین علی شاہ کے دربار میں پیش کرنا پڑتی تھی تب احکام صادر ہوتے۔ یہ ضرورت یوں پیش آئی کہ مسکین علی شاہ کی کئی بیویوں نے یوں میکے جانے کے جھوٹے بہانے گڑھ کر راہ فرار اختیار کی تھی۔ اس طرح کئی دن دفتری کارروائی میں گزر جاتے۔ ”الف لیلہ“ میں ہر بات کا وقت مقرر تھا۔

مسکین علی شاہ کہتے تھے کہ فقیر کی کٹیا ہے جہاں پر قدم مولا کی مرضی لے کر اٹھانا پڑتا ہے۔

کسی جاگیردار کی ڈیوڑھی نہیں ہے کہ من مانی موج مناؤ۔

جب کبھی بتول بیگم اور ہمایوں علی شاہ واحد حسین کے یہاں آتے تھے تو کئی دن پہلے سے خط و کتابت شروع ہو جاتی۔ وقت مقررہ ہمایوں علی شاہ برآمد ہوتے۔ ہمر کی سرخ شیروانی، زریں شملہ، عطر میں مہکتے جھلملاتی پیرے کی انگوٹھیوں والے ہاتھ سے رومال منہ کو لگائے ہوئے جس کار سے اترتے اس پر ”الف لیلہ“ کا بورڈ لگا ہوتا۔ جن طرے پوشوں میں ان کے ساتھ میوا، مٹھائی آتی ان پر ”الف لیلہ“ کی چٹ لگی ہوتی۔ مسکین علی شاہ کہتے تھے کہ یہ ساری چیزیں درگاہ کی ملکیت ہیں کیوں کہ رحمت علی شاہ کی دین ہیں۔ اس لیے میرا کیا اختیار ہے۔

بتول بیگم کی شادی کو یہ پانچواں برس تھا اور اب وہ مسکین علی شاہ کے لیے تیسرا اسجادہ نشین پیدا کرنیوالی تھیں۔

الف لیلہ“ سے آج جو رقعہ آیا تھا وہ نہایت مسجع مقفی اُردو میں لکھا ہوا تھا۔ پہلے بی بی نے اسے غور سے دیکھا ” اور اندازہ لگایا کہ اس میں کیا لکھا ہوگا ! پھر وہ رقعہ رضیہ کے پاس پہنچایا گیا۔ اس نے اپنے پیٹ میں مجھے بوئے طوفان کو تھام کر بار بار پڑھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس نے میٹرک تک پڑھا تھا مگر پھر بھی اسے اُردو بس واجبی سی آتی تھی لیکن لنگڑی پھوپو کو تو عیب نکالنے کی عادت تھی۔ اس لیے وہ کئی بار دبی زبان سے کہہ چکی تھیں کہ دلہن کی پڑھائی کے بارے میں ہمیں صاف دھوکہ دیا گیا ہے۔

آخر راشد کو باہر سے بلوایا گیا۔

راشد نے میٹرک سے انجینئری تک کے تمام امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیے تھے۔ اس کے باوجود وہ رقعہ فرفر تو نہ سنا سکا۔ البتہ یہ مطلب نکال کر بتا دیا کہ دلہن بیگم تیسرے صاحبزادے کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں۔ لہذا دلہن بیگم کی والدہ محترمہ اور دیگر خواتین کو مطلع کیا جاتا ہے تا کہ سندر ہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔

یہ ” الف لیلہ“ کے کام ہیں۔ لنگڑی پھوپو نے کہا۔

”یہ رقعہ کل کا چلا ہوا ہوگا اور اب تک اصل خیر سے بتول بیگم کا بچہ بارہ تیرہ گھنٹے کا ہوچکا ہوگا۔“

”اللہ آمین۔“

فاطمہ بیگم سر پر پھٹی ہوئی ساری کا پلو کھینچتی ہوئی آئیں بھابی پاشا آپ نواسوں پوتوں میں کھیلیں۔ اللہ کرے زچہ بچہ خیریت سے ہوں۔ ”بھابی پاشا! کیا میں بھی چلوں آپ کے ساتھ بتول پاشا کو دیکھنے۔۔۔؟“ فاطمہ بیگم نے بڑے چار سے پوچھا۔

تم۔۔۔؟“ رضیہ نے ان پر ایک بھر پور نظر ڈالی۔ میلی ساری پھٹا ہوا کرتا۔۔۔ ننگے پاؤں فاطمہ بیگم کو ساتھ بھیجنے کا ” مطلب تھا کہ بی بی انہیں اپنا ایک پرانا جوڑا پہنے کو دیں۔ قیصر کے لیے بھی چاند کی ایک پرانی فراک ہو۔ پھر اس کے بالوں کے لیے تیل۔ بھلا ایسے لوگوں کو سمدھیانے لے جانے سے کیا رعب پڑے گا ؟

”اب تم کاں جاتے فاطمہ بیگم۔ سب کام چوپٹ ہو جائیں گے۔ آج دلہن بیگم کا مزاج بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

بی بی کو گھر میں آئے تیس برس ہو گئے تھے مگر ان کی ہر بات کا جواب لنگڑی پھوپو دیتی تھیں اور اب ان کی بہو نہٹ لیتی۔ وہ صرف دستخط ہی کرتی چلی جاتی تھیں۔

اچھا اچھا۔“ فاطمہ بیگم سہم کر دور ہٹ گئیں۔ انہوں نے بڑے جوش میں ایک بات تو کہہ دی تھی مگر یہ امید نہیں ” تھی کہ لنگڑی پھوپو اتنے رساں سے اس کا جواب دیں گی۔

امی امی ! میں بھی جاؤں گی“ گھر میں کہیں جانے کی چہل پہل دیکھ کر قیصر مچلنے لگی۔“

ممی دیکھیے قیصر بھی آپ کے اور بی بی کے ساتھ جانے کی ضد کر رہی ہے۔“ چاند نے اپنی ماں بشیر بیگم سے ” کہا۔

یہ اسے نہیں مانے گی ابھی جلتی لکڑی سے اس کی خبر لیتی ہوں۔“ بشیر بیگم مسی لگا کر چونے کی ڈبیہ پر لگے ” آئینے میں اپنا منہ دیکھنے لگیں۔

چپ چپ مردار۔“ فاطمہ بیگم جلدی سے اٹھیں اور قیصر کو گھسیٹ کر چولہے کی طرف لے جانے لگیں۔ مگر قیصر ” اور مچل گئی۔ اس پر بشیر بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔ ویسے بھی انہیں قیصر کے لمبے بالوں سے بڑی چڑ تھی اور وہ بات بے بات قیصر کی چوٹی پکڑ کے اسے خوب پیٹا کرتی تھیں۔

”ٹھہرو میں آتی ہوں۔“ بشیر بیگم نے اپنے کاندھوں تک لہراتے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا ان کے بال کسی بھی ”دوا سے نہیں بڑھے اس لیے چاند بھی قیصر کے لمبے بالوں سے بہت جلتی تھی۔ اکثر اپنی ماں کی گود میں لیٹ کر پوچھتی

”ممی میرے بالوں قیصر کے بالوں جیسے کب ہوں گے۔؟“

نام نکولو جی میرے سامنے اس اجاڑ صورت کا۔“ بشیر بیگم غصہ میں آ گئیں۔ ”میں بھی چھوٹا بچہ دیکھنے جاؤں گی۔“ قیصر ضد کیے جارہی تھی۔

اللہ میاں رحم کرو۔ میری بیٹی خیریت سے ہو۔“ بی بی منہ ہی منہ میں دُعائیں بد بدائی جانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

اری مردار کیوں اس وقت رو رو کر نحوست پھیلا رہی ہے تیری صورت کو انگار لگو۔“ فاطمہ بیگم قیصر پر دھڑا ”دھڑ کے برسانے لگیں تو اس کی چیخیں اور بڑھ گئیں۔

پھر بشیر بیگم تخت سے انہیں اور دوسرے لمحے انہوں نے غڑا آپ سے کوئی چیز آنگن میں پھینک دی۔۔۔۔ فاطمہ بیگم نے مڑ کے دیکھا وہ قیصر کی چوٹی تھی۔۔۔

لنگڑی پھوپو اور بی بی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ صرف چاندکا لمبا قہقہہ گونجتا رہا۔

میں پہلے ہی بولی تھی میرے سامنے ضد نکو کر۔ میرا غصہ برا ہوتا ہے۔“ بشر بیگم نے ہانپتے ہوئے قینچی پٹک دی۔

بی بی نے بڑی مشکل سے نگا میں اٹھا کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ انہوں نے خود ان سپولوں کو اپنا دودھ پلا کر پالا تھا۔ ! اور پھر انہوں نے پلٹ کر لنگڑی پھوپو کو دیکھا کہ وہ بتائیں اس وقت بی بی کو ہنسنا واجب ہے یا روتا

مگر لنگڑی پھوپو خود سر تھامے بیٹھی تھیں۔

ہمارے مرشدوں میں آج تک کوئی سنیمانیں دیکھا۔ مگر تمہاری یہ بیٹی ہمارے صاحبزادے کو بھی بھٹکار ہی ہے۔ وہ ”تو اپنی دلہن کی بات کو حدیث شریف سمجھتا ہے۔

باہر بتول بیگم کی ساس بڑبڑائے جارہی تھیں۔ اور اندر اندھیرے بغیر روشندان والے کمرے میں بی بی اور بشیر بیگم کا دم گھٹ رہا تھا۔ سامنے چوڑی سی مسہری پر بتول بیگم یوں نڈھال سی پڑی تھی۔ جیسے کئی پہلوانوں سے بیک وقت لڑنے کے بعد ہار چکی ہو۔ اس نے دانتوں سے ہونٹ کاٹ کاٹ کر لہو لہان کر لیے تھے۔ جب درد کی لہر کچھ مدھم ہوجاتی تو وہ کبھی اللہ کو پکارتی اور کبھی بی بی کو۔ اندھیرے میں جلتی ہوئی مومی شمع نے اندھیرے کے احساس کو کم کر دیا تھا۔

جلتی ہوئی مومی شمع نے اندھیرے کے احساس کو کم کر دیا تھا۔

جب وہ جادو گرانیوں کی صورت دایا تازہ دم ہو کر پھر بتول بیگم پر ٹوٹنے والی تھی تو بی بی نے اسے پکڑ کے کھینچ لیا۔

”ٹھہرو اس کے پاس مت جاؤ۔“

الف لیلہ“ اور ”ایوان غزل“ میں جو فرق تھا اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ ”الف لیلہ“ میں کبھی ڈاکٹر یا ڈاکٹر نی نہیں آئے تھے۔ وہ لوگ ڈاکٹروں سے علاج کروانے کے قائل نہ تھے اور نہ ابھی ہر ہر مرض کے لیے الگ الگ ڈاکٹروں کا فیشن شروع ہوا تھا۔

سینکڑوں انگریزی ناموں والے ان گنت مرض بھی ابھی رائج نہیں ہوئے تھے۔ اسی لیے یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ گاؤں میں کسی مرض کا علاج نہیں ہوسکتا کہ حیدر آباد مریض کو لے جائیں۔ ابھی ہارٹ اٹیک، بلڈ پریشر اور کینسر سے مرنے والوں کے بارے میں بہت کم سنا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ قدیم وضع دار خاندانوں میں ڈاکٹرنی کو دکھانا معیوب سمجھا جاتا تھا اور انگریزی دواؤں میں ”حرام شے“ کی ملاوٹ ضروری کبھی جاتی تھی۔ اس لیے بڑے بوڑھے مرتے مر جاتے مگر ان دواؤں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

مسکین علی شاہ کے ہاں بھی انگریزی دواؤں اور ڈاکٹرنی کا آنا بری بات سمجھا جاتا تھا۔ اور یہی پہلوان نما دایا مسکین علی شاہ کی نسل کا چراغ روشن رکھنے کی ذمہ دار تھی۔

اجی گوری بیگم۔ ذرا ایک لیمپ تو بھجوادو یہاں۔ اندھیرے میں دم گھٹ رہا ہے۔ انگلینڈ پلیٹ میاں کی بیوی، بنجارہ ہلز کے فیشن ایبل بنگلے میں رہنے والی بشیر بیگم نے منہ بنا کر کہا۔

نکو ماں۔ ہم لوگ اپنے بیٹیوں کو پہلی بار مٹی کے تیل کا چراغ نہیں دکھاتے ہیں۔“ بتول کی ساس نے باہر سے جواب دیا۔

اللہ تو بہ۔۔۔“ بشیر بیگم نے صبر کیا۔۔۔ ان کے ہاں ڈاکٹرنی نہیں آتی۔ انگریزی دوا نہیں دی جاتی۔۔۔ بچہ اسی تہہ خانے میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں بچے کے لکڑ دادا کے خواب میں رحمت علی شاہ آئے تھے۔ ساتھ ہی دلہن بیگم کو حکم تھا کہ خبردار جو! کسی نے باہر ان کی ہائے ہائے سنی۔۔۔

ہماری ساس تو پہلے سے جنادیتی تھیں کہ دیکھوں دلہن مجھے پوتا چاہیے۔ اگر چھوکری ہوئی تو میکے میں پھنکوا دوں گی۔ میں ساس کی نصیحت سنتی تھی اور اس پر عمل کرتی۔ بتول کی ساس کہہ رہی تھیں۔

کیسے۔۔۔؟“ بشیر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے خالہ جان کہ وہ بیٹا دے یا بیٹی۔۔۔ اور پھر “ہماری بتول بیگم کے تو ماشاء اللہ پہلے سے دو بیٹے موجود ہیں۔

اس سے کیا ہوتا ہے؟“ وہ بگڑ کے بولیں۔

مرشدوں کی بیٹی سے کوئی شادی نہیں کرتا۔ بیٹا ہوا تو سب اس کے ہاتھ چومتے ہیں۔ عزت کرتے ہیں۔ مجھے تو “تیسرا بھی پوتابی چاہئے۔ میں دلہن بیگم کو جتا رہی ہوں۔

انہوں نے انگلی اٹھا کر بڑی قہر آلود نظروں سے بتول بیگم کو گھورا اور باہر چلی گئیں۔

بشیر بیگم کو یوں لگا جیسے بتول کی ساس کوئی جادو گرہی ہیں جو شہزادیوں کو کیتا بنادیتی ہے۔ اور شہزادے اس کے سحر سے پتھر بن جاتے ہیں۔

اور مسکین علی شاہ کی دوسری یا تیسری بیوی کے ہاں لڑکیاں میلادشریف پڑھ رہی تھیں۔

جب باغ جہاں کے مالی نے کی دیکھا بھالی پھولوں کی

اک پھول کو سب میں چھانٹ لیا، تھی جتنی ڈالی پھولوں کی

اندر بھی بڑی دھوم مچی تھی۔ جیسے کوئی برات آنے والی ہو۔ ویسے تو مسکین علی شاہ کی درگاہ میں محفل سمع اور گانے کا رواج تھا۔ مگر ایسے خوشی کے موقعوں پر ڈھولک اور ہیجڑوں کا ناچ بھی ہو جاتا تھا۔ دروازے پر نوبت والے منتظر تھے کہ کب صاحبزادے بلند اقبال اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر چیخ ماریں اور طبل پر چوٹ مار کے ایک اور ستارے کے طلوع ہونے کی اطلاع مسکین شاہ کو دیں۔ بتول کی ساس اپنی تینوں بڑی سوکنوں کے مقابلے میں ہمیشہ نظر انداز کی گئی تھیں۔

بلکہ مسکین شاہ کی سب سے بڑی بیوی تو انہیں اپنے شوہر کی نکاحی بیوی ماننے پر تیار ہی نہ تھیں۔ ان پر کنوارپنے میں کسی جن کا سایا ہو گیا تھا۔ وہ حضرت کے پاس علاج کے لیے لائی گئیں۔ سایہ بڑا گڑا تھا او بچارے مسکین علی شاہ کو گھنٹوں ریاضت کرنا پڑتی تھی۔ اس لیے جب ہزار جتن کے بعد وہ اچھی ہوئیں تو انہوں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور مسکین علی شاہ کا دامن پکڑ کے بیٹھ رہیں۔ بعد میں جب ہمایوں کی پیدائش قریب آگئی تو مسکین شاہ نے باقاعدہ اعلان کیا کہ انہوں نے اس لڑکی سے نکاح کیا ہے۔ اس لیے مسکین علی شاہ کی نظروں میں اپنا کوئی بیٹا سمایا تھا تو وہ ہمایوں تھا۔ ان کی تینوں بیویاں خواہ کتنے ہی دلائل سے غلط ثابت کریں مگر انہیں سو فی صدی یقین تھا کہ ہمایوں ان کا اپنا بیٹا ہے۔ اس لیے اس گھر میں مرشدوں کی روایتوں اور حضرت کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی جرات تھی تو وہ صرف ہمایوں کی اماں میں تھی۔ ان کا ڈھیلا ڈھالا بدن چاروں طرف سے لٹکتا تھا۔ سر میں اکاد کا سفید بال بھی نظر آنے لگے۔ اور سامنے کے دو دانت غائب ہو گئے تھے۔ منہ کے اندر ایسی سیاہی تھی جیسے ان کی روح میں بھی آجالے کی کوئی رقمق باقی نہ ہو۔ وہ جس طرف سے گزرتی زیور یوں بجتے تھے جیسے ہاتھی چل رہا ہو۔ کوئی زیور ایسا نہ تھا جو ان کے پاس نہ ہو اور کوئی وقت ایسا نہ تھا جب وہ زیور اتارتی ہوں۔ صرف پیروں میں ہی پائلوں، پوگر اور پازیبوں کی ڈیڑھ سیر چاندی تھی۔ ہمایوں کہتا تھا کہ ایک بار اماں جان نے پیروں میں سے تمام زیورا تا رڈالے تھے تو لڑکھڑا کے گر پڑی تھیں۔ کانوں میں سونے کے تنکے اور جھمکے، گلے میں ٹھسی، ست لڑا، چندن ہار اور کالی پوت کا کچھا، جو سہاگ کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ہر وقت مسی سرمے سے آراستہ رہا کرتی تھیں۔ چاند انہیں زیور کی پہاڑی کہا کرتی تھی۔ اس لئے جب بھی بشیر بیگم اپنی بہن سے ملنے ”الف لیلہ“ جاتی تھیں چاند ضرور ان کے ساتھ جاتی۔

اماں اماں میں مرجاؤں تو اچھا ہے۔“ بتول بیگم نے پوری قوت سے بی بی کو پکڑ لیا تھا۔

اوئی ایسی کیا دُنیا سے نرالی تکلیف ہے۔ کوئی پہلوٹھی کا بچہ تو ہے نہیں۔“ بشیر بیگم جانتی تھیں کہ ایسے وقت زچہ کے دلار کرنے سے تکلیف اور بڑھ جاتی ہے۔

چپ چپ۔۔۔“ بی بی نے لرز کے کہا۔ وہ بھی ایک عورت تھیں۔ ہر عورت کو انسان کی تخلیق کا اختیار اللہ میاں سونپ دیتے ہیں۔ مگر کوئی عورت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے بطن سے اسی کی طرح مجبور اور بے بس پستی جنم لے۔ اگر اللہ عورت کو یہ اختیار دیتا، اگر بتول کی ساس یہ سمجھتی تھی کہ اس وقت اپنی عاقبت سنوارنا خود اس کی بہو کے ہاتھ میں ہے تو بتول یہاں لیٹی مرنے کی دُعائیں کیوں مانگتی، انہیں لرزہ کیوں چڑھتا۔ بتول کی ساس اپنی سب سوکنوں پر حکمرانی کیوں کرتی؟ دُنیا میں صرف مرد ہوتے جو اپنے مزے میں جی رہے ہوتے۔ نہ عورتوں کی طرح ہائے ہائے نہ بچوں کی چیخ پکار۔۔۔ زندگی کیسے ! مزے میں گزرتی

ہمایوں دِلان میں ٹہل رہا تھا۔ سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جاتا۔ اس کے قدم بڑی ست رفتاری سے اٹھ رہے تھے مگر دماغ نوے میل فی منٹ کے حساب سے دوڑ رہا تھا۔

بتول پر اس نے پہلی نظر نہ جانے کس وقت ڈالی تھی کہ پھر ہٹا ہی نہ سکا۔ زندگی کے ستائیس برسوں میں اس نے صرف دو کام کئے تھے۔ ایک تو ابا حضور کی آرزو پر ساتواں درجہ پاس کر لیا تھا۔ اور پھر بتول سے شادی کی۔ شادی سے پہلے وہ دن بھر رحیم میاں کے ساتھ رمی کھیلتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار رحیم میاں کے بہکاوے میں آکر وہ دونوں کہیں اپنا کوئی اور شوق پورا کرنے چلے جاتے تھے۔ مگر جس دن سے اس نے بتول کا گھونگھٹ اٹھایا تو بس وہیں چپک کر بیٹھ گیا۔ رحیم میاں گھنٹوں مردانے میں سوکھتے نئے نئے اور تازہ مال آنے کی خوش خبریاں اندر بھجواتے۔ مگر ہمایوں (جواب دولہا پاشا ہو گئے تھے) کبھی نہ نکلتے۔

جو سنتا، بتول کی قسمت پر رشک کرتا۔ اللہ نے کیسا محبت کرنے والا دولہا دیا ہے۔ آخر بتول کی بے زبانی اور صبر شکر والی طبیعت کا پہل اسے مل گیا۔ کیا مجال کہ بتول پل بھر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ پھر بتول نے اسے ایاز دیا۔ اور دادا دادی نے اس کی پیدائش پر اتنا شور مچایا کہ کہ ہمایوں اپنے رقیب کی آمد پر گھبرانا بھول گیا۔۔۔ دوسرے ہی سال شہزاد

آ گیا۔۔۔ رفتہ رفتہ ہمایوں بتول سے دور سر کتا گیا۔۔۔

اور ہمایوں کے کلیجے پر کسی نے فرہاد کا تیشہ کھینچ مارا۔

اس نے یوں اپنی سالی کو دیکھا جیسے اس نے ایک لاکھ کی تھیلی بے ایمانی سے چھپالی ہو۔

پوتی مبارک ہو۔۔۔ پوتی مبارک ہو۔۔۔ یہ خبر ”الف لیلہ“ میں یوں پھیلی جیسے ایک بھیانک آندھی چراغ بجھاتی چلے۔۔۔

باہر نوبت نقاروں والوں نے پیدائش کی خبر سنی تو بغیر سوچے سمجھے تڑا تڑا نوبت پر ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔

”اوئی یہ میری موت پر نگارے کیوں رہے ہیں۔۔۔؟“

ہمایوں کی ماں بیچ آنگن میں دل تھام کر بیٹھ گئی۔ ”الف لیلہ“ میں جب بیٹی پیدا ہوئی تو اپنے ساتھ ستر بلا لائی ”

”ہے۔

خالہ جان داماد مبارک۔۔۔“ بشیر بیگم نے اقبالی مجرموں کے انداز میں خالہ جان کو داماد کے خوش آئند تصور سے ”

خوش کرنا چاہا۔ پھر بھیا نک خاموشی چھا گئی۔

ہمایوں کی بہن جلدی جلدی ہیچڑوں کو چپ کرانے لگی۔ اور دیوار کے اس پار سے قہقہے بلند ہونے لگے جس طرف ہمایوں کی سوتیلی مائیں رہتی تھیں۔

خانقاہ کے اندھیرے کمرے میں دونوں ہاتھوں میں سر کو تھامے مسکین شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اس لڑکی کا ہر کیسے ملے گا۔ مرشدوں کی بیٹی کو بیا بنا بڑا مشکل کام تھا۔

ممی ممی۔۔۔ تو کیا یہ بچی بھی بڑی ہو کر شیریں کی طرح کلیجے میں چھری مارے گی۔۔۔“ چاند نے شیریں کی طرح ”

خوبصورت سی ننھی بچی کو دیکھ کر اپنی ماں سے پوچھا۔۔۔

چپ، چپ بولی ہو گئی ہے کیا۔۔۔؟“ بی بی نے اسے ڈانٹ دیا۔

چاند اس وقت سات برس کی تھی۔ مگر اسے ہر فلم کی پوری کہانی یاد ہو جاتی تھی۔ سب ہی چلتے ہوئے فلمی گیت اسے یاد تھے۔ وہ لیلاچٹس کی شیدائی تھی۔ ڈانس کرنے پر اسے گود بھر بھر انعام ملتے تھے۔ جو بشیر بیگم کو اپنے میکے والوں سے چھپانا پڑتے تھے۔ چاند کی ددھیال یوں تو زیادہ دور نہ تھی مگر پھر بھی ذہنی طور پر صدیوں کا فاصلہ درمیان تھا۔

جب ”ایوان غزل“ کی بیٹیاں موٹروں میں پردے لگا کر سوار ہوتی تھیں تو چاند کی پھوپھیاں اپنے میاؤں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سکندر آباد کلب ڈانس کرنے جاتی تھیں۔ بغیر آستینوں کا بلاؤز، بوتھوں کی سرخی اور اونچی ایڑی کے سینڈل کا فیشن پہلے پہل حیدر آباد میں اسی گھرانے سے نکلا۔ لڑکے تو خیر اور خاندانوں میں بھی پڑھنے کے لیے ولایت جاچکے تھے لیکن بال کٹا کر فراکیں پہنے اسی گھرانے کی لڑکیاں پہلی بار کرسٹانوں کے اسکولوں میں بھیجی گئیں۔ اور پھر آگے بھی ان کے کارنامے لوگ سنا کرتے۔ کوئی ہوا خوری کو نینی تال گئی اور وہیں کسی گورے سے نکاح کر لیا۔ کوئی باپ دادا کے سامنے دولہا پسند کرتی اور ماں باپ تالیاں بجا کر اس کے انتخاب کی داد دیتے تھے۔ وہاں کے قصے بشیر بیگم سے سن سن کر لنگڑی پھو پوخود ہی تو یہ کرتی تھیں۔

بشیر بیگم کی سسرال تھی کہ کسبیوں کا اڈا۔ دُنیا کانوں پر ہاتھ دھرتی۔ اس لئے بشیر بیگم میکے کم آتی تھیں، کیوں کہ نندوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی ٹیڑھی مانگ نکال کر کجن بائی کے انداز میں پٹیاں جمانے لگی تھیں۔ اور مسی کے بجائے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا تیں۔ ساڑھی بھی کمر پر کس کس کر باندھتیں۔ البتہ بغیر آستینوں والے بلاؤز کے نام سے اٹھی تھر تھری چھوڑتی تھی۔ اس کے باوجود ان کے میکے میں اعتراضوں کا پتہراؤ ہوتا تھا۔ کوئی ان کی ترچھی مانگ پر اعتراض کرتا، کوئی چاند کی ننھی ٹانگوں پر۔ اس لیے وہ بتول بیگم کی سسرال تو بہت کم جاتی تھیں۔ بس کسی ایسے ہی موقع پر آنا پڑتا تھا جیسے آج آنا پڑا۔

اس کا نام غزالہ رکھنیے خالہ جان۔ بڑی خوبصورت آنکھیں ہیں۔ ماشا اللہ ”بشر بیگم نے شاعر کی بیٹی ہونے کا ثبوت“ پیش کیا۔

ہاں کچھ بھی نام رکھو نام میں کیا دھرا ہے۔۔۔“ خالہ جان نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دوسرے دن واحد حسین اپنی نئی غزل کا مصرعہ گنگنائے ہوئے اندر آئے تو ان کے ہاتھ میں ”الف لیلہ“ کا مخصوص بھاری بھر کم لفافہ تھا۔۔۔ لنگڑی پھوپھو جانماز پر سیدھی بیٹھ چکی تھیں۔ اور لاحول پڑھ کر کانوں کو ہاتھ لگانے ہی والی تھیں کہ واحد حسین کو دیکھ کر ہاتھ نیچے چھوڑ دیے۔

”کیوں بھائی پاشا! خیریت تو ہے؟“

کیا نام رکھا بچی کا۔۔۔؟“ خالہ بیگم نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

غزل۔۔۔ غزل۔۔۔“ انہوں نے لا پرواہی سے کہا اور پھر اپنا ادھورا مصرعہ گنگنائے لگے۔۔۔ محبوب۔۔۔ محبوب۔۔۔“ مجنوب۔۔۔ اور جانے کون سا قافیہ رہ گیا ہے جو وہ بھول رہے تھے۔۔۔ کل سے وہ قافیے کو طرح طرح سے گھیر رہے تھے مگر وہ ایک شورخ محبوبہ کی طرح کسی طور ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ آج اس معشوق کی آمد ہے جس سے بازاروں میں جنس و فاسنتی ہو جائے گی۔ دل و جان والے دامن بچاتے پھریں گے۔۔۔ کیسانیا مضمون ہے۔۔۔ کیا آمد ہے۔۔۔

اوئی یہ ”غزل“ کیا نام ہوا۔۔۔؟ پھوپھو نے ناک پر انگلی رکھ کر راشد سے پوچھا۔۔۔ راشد بھی شیو کرتے کرتے رک گیا۔

”غزل۔۔۔؟ کس نے رکھا ہے یہ نام۔۔۔؟ ابا جان نے؟ خوب۔۔۔“

(وہ بڑے طنز کے ساتھ پھر آئینے کی جانب مڑ گیا)

”چلیے اچھا ہوا۔۔۔ ایوان غزل تھا مگر کوئی غزل نہیں تھی ہمارے ہاں۔۔۔“

راشد اس خاندان کا پہلا فرد تھا جسے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور اس بات پر واحد حسین بڑے شرمسار تھے کہ ان کا اکلوتا بیٹا اپنے خاندان کی روایتوں کو توڑ رہا تھا۔

مگر شریف لڑکیوں کا ایسا نام۔۔۔؟“ بی بی نے سر پر پلو سنبھال کر کہا۔۔۔

غزل تو عشق و عاشق کی باتوں کو کہتے ہیں۔“ انہوں نے کچھ شرما کر اور کچھ گھبرا کر ان غزلوں کو یاد کیا جو ”ان کے میاں صرف انہیں کو چپکے چپکے سنایا کرتے تھے۔

ہاں۔۔۔“ راشد نے منہ ٹیڑھا کر کے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ استرے والا اس کا ہاتھ گالوں پر یوں لپ جھپ ”دوڑ رہا تھا۔ جیسے قصائی بکرے کی کھال اتار رہا ہو۔

فارسی میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ غزل اس کرب کو کہتے ہیں جو زخمی ہرنی کی آنکھوں میں مرتے وقت ہوتا ”

”ہے۔

رہنے دیجیے اپنی تنقید۔“ راشد کی بیوی رضیہ نے اپنے پیٹ کی ہل چل کو تھام کر کہا۔

”اچھا خاصا نام ہے۔۔۔ غزل تو عورتوں کی باتوں کو کہتے ہیں۔۔۔ ہم نے میٹرک میں پڑھا تھا۔“

تو ٹھیک ہے۔۔۔“ لنگڑی پھوپھو نے اطمینان کی سانس لے کر دوبارہ نماز کی نیت باندھ لی۔ اگر چہ دلہن کا میٹرک والا ”دعویٰ انہوں نے بالکل نہیں مانا۔

راشد نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور باہر بھاگا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی عمارت، شہر سے دور اڈی کمیٹ میں بنائی جارہی تھی۔ راشد کو بھی ایک بڑا کنٹریکٹ ملا تھا۔ اس کام کو بہت جلد پورا کرنا تھا۔ اس لیے بھی کہ اعلیٰ حضرت کی خواہش تھی اور اس لئے بھی کہ کنٹریکٹ کا روپیہ ملے تو ”ایوان غزل“ کو قرق ہونے سے بچایا جائے۔ کیوں کہ وہ ان انجینئروں میں شامل تھا جو جامعہ عثمانیہ کا نقشہ بنانے کے لیے پورے یورپ اور مڈل ایسٹ کا دورہ کرنے بھیجے گئے تھے۔

”دالان میں پہنائے ہار کیا خوشنما لگا کے۔“

قالین پر بیٹھی ہوئی میراثیں حلق پہاڑ پہاڑ کر چلا رہی تھیں۔

بڑے دالان میں تخت پر سرخ مخمل کی کار چوبی مسند بچھی تھی اس کے اوپر پھولوں اور قمقموں کا منڈوا پڑا تھا۔ شریر بچے اس کی پھولوں والی جھالریں نوچ نوچ کر بھاگ رہے تھے۔ ڈیوڑھی مہمانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ڈیوڑھی کے پچھلے حصے میں پیاز، لیمو اور لہسن کے چھلکے بکھرے پڑے تھے۔ بڑی بڑی دیگیں اور برتن ادھر سے ادھر گھسیٹے جارہے تھے۔ چولہے جل رہے تھے۔ گوشت، چاول، گھی اور مسالوں کے ڈھیروں کے آس پاس باورچیوں کے ساتھ غلام رسول دوڑتا پھر رہا تھا۔۔۔ کوئی ادھر سے چلاتا۔۔۔ ”غلام رسول پانی“ کوئی ادھر سے چلاتا۔۔۔ ”غلام رسول پان“ پھر بیگم سب دباڑا تیں۔۔۔ ”غلام رسول جو تے۔۔۔؟“

مہمان کبھی کے آنا شروع ہو چکے تھے۔ باہر دالان میں شامیانے تے دریوں پر سفید چاندنیاں بچھی تھیں اور اس پر ایرانی قالین بچھائے گئے تھے بیچ بیچ میں چاندی کے ورق لگی گلوریوں کے خاصدان رکھے تھے۔ باہر مردانے میں جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ گورے چٹے اونچے پورے، بنستے مسکراتے احمد حسین جھک جھک کر لوگوں کا استقبال کر رہے تھے۔ آج انہوں نے تنگ مہری کے پاجامے پر ہمو کی شیروانی پہنی تھی اور ترکی ٹوپی کا پھندا ان کے ماتھے پر جھول رہا تھا۔ بار بار انہیں مہمانوں کو رسیو کرنے کے لیے گیٹ یک آنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھار پروانگی کار کو دیکھ کر وہ ہاتھ سے اشارا کر دیتے تھے۔

”زنانہ سواری ادھر لے جاؤ۔۔۔“

کام دھندے میں بولاتی ہوئی اجالا بیگم۔ اپنی زریں جارحٹ کی ساری سنبھالتی پھر رہی تھیں۔ بار بار ان کے جھلملاتے ہوئے چہرے پر بجلیاں کی کوند رہی تھیں۔ اجالا بیگم شادی بیاہ اور تقریبوں کا انتظام کرنے میں مشہور تھیں۔ اس کے باوجود آج ان کے خوبصورت چہرے پر بڑی تھکن ہی تھی۔ آج وہ بار بار کچھ نہ کچھ بھول جاتیں۔ لونڈیاں چھو کریاں تو خیر ہمیشہ کی کام چور ہیں۔ کام کے وقت سب غائب ہو جاتیں گی وہ اکیلی ہی باورچیوں کی نگرانی بھی کر رہی ہیں اور مہمانوں کا استقبال بھی کر رہی ہیں۔ برابر والیوں سے ہنسی مذاق، اور بچوں کو قالین پر کیچڑ بھرے پیروں سے آنے سے روکنا یہ سارے کام بیک وقت نبٹانا اجالا بیگم نے اپنی دادی سے سیکھا تھا۔۔۔

وہ اونچی پوری لحیم شہیم خاتون تھیں۔ چالیس کو پار کر چکی تھیں۔ اس کے باوجود ان کا سبک سبک ناک نقشہ اور چقدر کی طرح سرخی آمیز گورا رنگ اس پر کہیں کہیں جھلکتی ہوئی ایرانی حسن کی جھلک۔ وہ اب بھی کسی کو مار ڈالنے والی صلاحیت رکھتی تھیں۔ ان کے بے پناہ حسن اور رعب داب نے بھی اتنا اضافہ نہیں کیا تھا، جو جادوان کی زبان میں تھا۔ وہ ایک ایسی زبان کی مالک تھیں جس نے شکست کھانا نہیں سیکھا تھا۔

ڈیوڑھی کے مختلف کمروں میں خواتین گروپ بنائے ہوئے ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔ پھولوں اور عطروں کی خوشبو، باہر سے آنے والی بریانی بگھارے بیگن اور کبا بوں کی خوشبو پر چھائی جارہی تھی۔

جدھر باورچی پکا رہے تھے، اس پچھلے راستے سے خواتین اندر آ رہی تھیں۔ سارے میں دیگیں، برتن، ترکاریوں اور انڈوں کے چھلکے پڑے تھے۔ باورچیوں نے پانی بہا بہا کر چھپ چھپا کر دی تھی۔ اس لیے جو بی بی موٹر یا شکران سے اترتی، اجالا بیگم اسے خبر دار کر دیتیں۔۔۔

”اچی گوری ماں، ذرا ساری او پر اٹھا کر آؤماں، یہ مردار باور چی چوطرف پانی پھیلا دیے ہیں۔“

بڑے بڑے چولہوں کا دھواں چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ اور چولہوں کے درمیان شیخو میاں ڈنڈا ہاتھ میں تھامے ہوئے، اجلے کپڑے پہنے باورچیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔

دیکھوں میٹھے میں کتنی شکر ڈالی ہے۔۔۔“ وہ ذرا سامیٹھا چکھتے۔

یہ ٹوٹے ہوئے انڈے ادھر دے دو۔۔۔“ جلدی جلدی انڈوں کو منہ میں رکھتے ہوئے وہ دوسری طرف مڑتے۔“

ذرا دکھا نالقمی خستہ تو بے نا۔۔۔؟“ وہ سالم لقمی کومنہ میں رکھ کر اس کاخستہ پن محسوس کرتے۔“

بجے چاند نیوں اور قالبینوں پر آنکھ مچولی کھیلنے پھر رہے تھے۔

دالان کے اس کونے میں جہاں سب جوتے اتار کر اندر جا رہے تھے۔

آباؤں کا ایک پورا گروپ روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کی بجائے اپنی باتوں میں مگن تھا۔ اور اسی جگہ بیٹھ کر بی جان کو پان بنا نا رہ گیا تھا۔ آتے جاتے اجالا بیگم نے کئی بار ٹو کا۔

“اری مردار تیرے کانوں کو آج کیا ہو گیا ہے۔ کتنی بار بولی کہ راستے میں نکو بیٹھ اب پیر سے چپل نکالوں کیا۔۔۔؟“

مگر وہاں بیٹھنے والی سب آیا ٹینیہ دیکھ کر حیرا رہ گئیں کہ بی جانی نے بیگم صاحبہ کی بات پر کوئی کان نہ دھرا اور اسی طرح بیٹھی پان کے بیڑوں پر چاندی کے ورق لپیٹتی رہی۔

مردانے حصے سے کئی بار احمد حسین کو زنانے کی طرف آنا پڑ رہا تھا۔ کئی بار وہ کسی اشد ضروری کام سے اندر آتے اور بھولے سے کسی بنارسی ساری سے ٹکرا کر باہر بھاگتے۔ اندر ایسی موہنی صورتیں جمع ہوں تو ان کا بے قرار ہونا لازمی تھا۔

اس کے باوجود وہ نہایت صبر و اطمینان سے کسی نئے مہمان کا استقبال کرنے اٹھتے۔ خمیدہ ہو کر قدم بوی عرض کرتے۔ اپنے ہاتھوں میں مہمان کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگاتے اور پھر ہاتھ جوڑ کر کہنا پڑتا۔۔۔“ تشریف رکھنے خبلہ۔۔۔“

واحد حسین، احمد حسین کے اس خاکسارانہ انداز پر بہت ہنستے تھے۔ مگر تحصیلداری کی رشوت سے شہر میں ٹھاٹھ کرنے اور گاؤں میں جاگیردار بن کر رہنے میں بڑا فرق تھا۔ واحد حسین تحصیلدار تھے۔ مگر تعلقدار بن کر بات کرتے۔ احمد حسین اپنے نانا خسر کی بے انتہا دولت کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ مگر اپنے سے چھوٹوں کے آگے جھکنا پڑتا۔

آج واحد حسین اور بی بی کی کمی اندر باہر سب نے محسوس کی تھی۔ ایسی خوشی کے موقعوں پر اپنے عزیز بہت یاد آتے ہیں۔ اسی لئے تو اجالا بیگم نے بڑے جاؤ سے اپنے بیٹے کے چہلے میں اپنے جیٹھ اور جٹھانی کو بلایا تھا۔ اب وہ لوگ نہ آنے کا کوئی بہانہ کریں مگر اجالا بیگم جانتی تھیں کہ واحد حسین، احمد حسین کا وارث کس دل سے دیکھتے۔۔۔! وہ تو اجالا بیگم کی کل دولت کا وارث راشد کو سمجھے ہوئے تھے۔

با ہر احمد حسین کے اونچے فہقے سن سن کر اجالا بیگم مسکرائے جارہی تھیں۔ آج انہوں نے احمد حسین کی معصومیت پر ایک اور بھر پور وار کیا تھا اور اب گھبرائے جارہی تھیں۔ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اور اس گھبراہٹ نے ان کی خوب صورتی کو اور نکہار دیا تھا۔ گہری او دی بنارسی ساری پر کارگے کا کلی دار کرتا بڑی بہار دکھا رہا تھا۔

گلے میں جڑاوی لچھا، ست لڑا اور چندن ہار چمک رہا تھا اور ہاتھوں میں بیرے کے کنگنوں کے آگے سچی چمکیوں کا جوڑا تھا۔ یوں تو نگوں کا جوڑا ہر گوری کلانی پر اچھا لگتا ہے۔ مگر اجالا بیگم کے ہاتھ تو بس اس قابل تھے کہ انہیں دیکھے ہی جاؤ۔

یہ بھی ان کی خوبصورتی اور ضد کا قصور تھا کہ وہ کسی شہزادے کے محل کی بجائے احمد حسین کی معمولی سی ڈیوڑھی میں آگئیں تھیں۔ ان کے نانا مناسب جنگ صدر المہامی تک کر چکے ہیں۔ وہ اپنے خاندان میں جدت پسند مشہور تھے۔ ہمیشہ وہ کیا جو کسی نے نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ اپنے خاندان کی کسی نخریوں پیٹی لڑکی کو چھوڑ کر انہوں نے ایک مشہور زمانہ کا فرادا ایرانی حسینہ سے بیاہ رچایا۔ یہ اجتہاد اپنے وقت پر اتنا بڑا تھا کہ ان کی جاگیر بھی دہل کر رہ گئی تھی۔ کیوں کہ ابھی شاہی خاندان میں غیر ملکی بہو ٹیں لانے والے شہزادے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اور خاندان کے ہر نوجوان پر فرض تھا کہ

شاہی فرمان پر عمل کرے اور اس لڑکی کو اپنے لئے قبول کر لے جو افیون کی پنگ میں حضور والا سے ایمان جنگ منظور کروائے تھے۔ اس لیے ایمان جنگ تخمی اور قلمی آموں کے پیوند ہی نہیں لگائے۔ بلکہ گلاب کی خوبصورت ٹہنی پر بیول کی شاخ تک سجا ڈالی۔ مگر وہ شاخیں ہمیشہ ہری رہیں۔ یہ اور بات تھی کہ اس پیڑ پر شگوفوں کے ساتھ ساتھ مقدمے بازیوں اور خاندانی رقابتوں کے کانٹے بھی اگتے رہے جنہوں نے پہلے تو اوپر ہی اوپر دلوں کو جھنجھوڑنا شروع کیا اور اس کے بعد سلطنت اصفیہ کی بنیادیں سازشوں کے زلزلوں سے دہلنے لگیں۔

یوں دیکھتے تو اس وقت زندگی بڑی پر سکون تھی۔ موسیٰ ندی کے کنارے کنارے شہر میں پھیلی ہوئی بے چینی کی لہریں ڈیوڑھیوں سے بہت دور تھیں۔ حضور کی ہتھنی کے بیاہ میں سارا شہر خوشیاں مناتا تھا۔ کیوں کہ سرکار کی ناراضگی قہر الہی سے کم نہ تھی۔ طاعون اور چیچک کی وبائیں پھوٹتیں تو کالی ماتا کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ بندگان عالی کی خفگی بھی شامل ہوتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز سر پر ڈنڈا لے کھڑا تھا۔ اور اس ڈنڈے کا رُخ سب سے پہلے والیان ریاست کی جانب موڑ دیا جاتا تھا کہ یہاں سے عموماً بغاوت کے چھوٹے چھوٹے فتنے سر اٹھایا کرتے ہیں۔ عوام بہت نیچے اور دیے ہوئے تھے اور اوپر سے بالکل نظر نہیں آتے تھے۔ ان دنوں ریاست کے عہدے ایسے مہنگے نہ تھے کہ ان کے لئے ولایت کی بادہ پیمانی کی جائے۔ اس لئے مناسب جنگ کہ ابھی مناسب علی بیگ کہلاتے تھے، بس یوں ہی کسی بڑے عہدے کی تاک میں لگے بیٹھے تھے کہ ایران سے یہاں بود و باش اختیار کرنے ایک نیا قافلہ اورنگ آباد آ کر مقیم ہوا۔ اورنگ آباد عام طور سے سب سے زیادہ ٹھنڈا اضلع کہلاتا تھا۔ اس لئے خود حضور عالی گرمی کے چند مہینے یہیں گزارتے اور عموماً باہر سے آنے والے غیر ملکی بھی قیام کے لئے اورنگ آباد ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ یوں تو عارف بیگ ایران سے اپنے ساتھ علم و ادب کا ایک بڑا پشٹا را سمیٹ کر لایا تھا کہ یہاں اپنی ادبی دھاک جمائے۔ لیکن یہ افواہ عام تھی کہ وہ دراصل اپنی کا فر ادامہ پارہ لڑکی خوش جمال کو حضور کی نذر کرنے لایا ہے، تا کہ اپنی دال روٹی کا بندو بست کر سکے۔ خوش شکل لڑکیوں کی بدولت اس وقت بہت سے والدین اپنی کئی کئی نسلوں کی قسمت منور کر چکے تھے۔ وہ لڑکی چند مہینے حضور پر نور کی توجہ خاص کی مستحق رہتی اور پھر عنبری باغ کے ایک تاریک کمرے میں یوں گم ہو جاتی کہ اسے سب بھول جاتے، سوائے اسٹیٹ کے اس محکمے کے جس کے ذمہ ان عورتوں کو تینوں وقت کھانا اور مہینے میں ایک جوڑا کپڑے بھیجا تھا۔

عارف بیگ نے بھی کامیابی کے مراحل بڑی جلدی جلدی طے کئے اور سنا ہے اس لڑکی کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد ہی حضور پر نور رات بھر استراحت نہیں فرما سکے۔ اب پیشی میں رہنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ہر قیمت اور ہر شرط پر عارف بیگ کی دختر کومحل میں پہنچانے کا انتظام کر دیں کہ مناسب علی بیگ جو غارت بیگ کے پڑوسی تھے۔ بیچ میں آن کو دے تھے۔ اور اپنے خاص باورچی سے بریانی پکوا کر اس میں جانے کیا چیز خوش جمال کو کھلا دی۔ دکن کا جادو تو مشہور تھا ورنہ کیا تک تھی کہ بادشاہ کے محلوں کے خواب دیکھنے والی حسینہ ایک جاگیردار پر مر مٹی۔ سنا ہے مناسب علی بیگ کے والد اس وقت اپنے ہونے والے سمدھی سے گھوڑے جوڑے کی رقم پر تکرار کر رہے تھے جب ایمان جنگ نے ضروری کاغذوں پر دستخط لے کر حضور کے گوش مبارک تک یہ بات پہنچادی۔ چنانچہ مناسب علی کے خاندان پر سخت عتاب ہوا۔ اچانک ان کی اسٹیٹ پر انکوائری کمیٹی بیٹھی۔ دوڑ دھوپ کر کے مناسب جنگ نے جاگیر تو بچالی مگر ان کے وہ بھائی بہن منہ دیکھتے رہ گئے جن کے مقدر الطاف خسروانہ سے چمکنے والے تھے۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ خوش جمال نے اپنی چالاکی سے شرف باریابی حاصل کیا اور مناسب علی بیگ اچانک نہ صرف مناسب جنگ بن گئے بلکہ انہوں نے اپنی ڈیوڑھی میں نادر اشیا کا بے مثال اسٹاک جمع کر کے پھر حضور پر نور کو زک پہنچائی۔

تو خیر۔۔۔ اجالا بیگم پیدا ہوئیں تو بالکل اپنی ایرانی دادی کی شکل صورت، وہ غصہ اور غرور۔۔۔ اکلوتے بیٹے کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اس لئے مناسب جنگ نے اپنی ڈائری میں لکھوالیا تھا کہ وہ ہر جمعہ کی نماز کے بعد ضرور حالا بیگم کو شرف باریابی بخشا کریں گے۔ مگر عمر کے بوجھ کے ساتھ ساتھ کثرت حوادث نے قویٰ کو مضحمل کر ڈالا تھا۔ اس لئے اب یہ حال تھا کہ ادھر چوب دار اطلاع دیتا کہ اجالا بیگم شرف ملاقات چاہتی ہیں اور ادھر ان کا ذہن کسی جی سے اتری ہوئی طوائف کی طرف جانکتا۔ ایک ساتھ انہیں کئی باتیں یاد آتیں۔

اعصابی قوت والا خمیرہ گاؤ زبان پھر سے استعمال کرنا چاہیے۔ کئی دنوں سے خضاب نہیں لگایا ہے۔ کبھی کبھار نماز پڑھنا چاہیے۔

وہ بڑ بڑا کے اٹھتے۔ موجهوں پر تاؤ دیتے۔ سینہ تان کر کھڑے ہوتے کئی نوکروں کی مدد سے جلدی جلدی چوڑی دار پاجامہ اور سرخ ہمو کی شیروانی پہنتے۔ تب آیا پانچ سال کی اجالا بیگم کو لے کر اندر آئی۔

او ہو۔۔۔ آپ تشریف لائے ہیں۔۔۔؟ وہ فوراً طوائف کے تصور کو جھٹک کر دادا بننے کی تیاری شروع کر دیتے۔ اپنی ”سفید موجهوں سمیت انہیں پیار کرتے جو اجالا بیگم کے اچانک منہ بٹا لینے سے آیا کے حصے میں آجاتا۔ وہ گھبرا کے اجالا بیگم کو نیچے اتار دیتی۔

”دادا حضرت میں اب سفید گھوڑے پر نہیں بیٹھوں گا۔ وہ سائیں کا چھوکرا اجاڑ صورت اس گھوڑے کو چھولیا۔“

ٹائیں ٹائیں بی بی پاشا۔ گالیاں نہیں بکتے۔“ وہ پیار سے سمجھاتے۔

آن، پھر وہ اجاڑ صورت میرے گھوڑے کو پیار کیوں کرتا؟“

دا داخلت مجھے اپنی بندوق ذرا دیجئے نا، میں اس مردار کو مار ڈالوں گا۔۔۔“ اور وہ اجالا بیگم کی معصومیت پر بے ساختہ بننے لگتے۔

”آدمیوں کو نہیں مارنا یا گناہ ہوتا۔“

گناہ بولے تو کیا بات دادا حصت۔۔۔؟“ وہ گردن اٹھا کر پوچھتیں۔۔۔

”اللہ میاں اپنے سے خفا ہو جاتے۔۔۔“

”آن۔۔۔ آپ سے تو سب لوگ بھوت ڈرتے کتے۔“

چنانچہ یہی ہوا۔۔۔ داداحضت کی دھاک جما کر اجالا بیگم من مانی کرتی رہیں۔۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی دادا حضرت کی بندوق لے کر باغ میں نکل گئیں۔ اور ادھر ادھر تڑا تڑا نشانے لگانا شروع کر دیے۔ اب وہ سولہ برس کی تھیں۔

وہ تو اپنی دانست میں چڑیوں کا شکار کر رہی تھیں کہ پرتاب کرن کا مالی ان کے نشانے کی زد میں آ گیا۔ پرتاب کرن ریڈی سے مناسب جنگ کی پڑوسیوں کے ناطے ایک زمانے سے بگڑی چلی آ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اڑنگا لگانے کی فکر میں رہتے تھے۔ چلو مان لیا کہ ضلع پر مناسب جنگ کی عملداری تھی مگر یہ وہ زمانہ تھا جب پر کا کو اپنا کر انگریز رینڈینٹ کے آگے جاگیر داروں کے کارنامے رکھے جا رہے تھے۔ اگر چہ انہوں نے جہانگیر کی طرح انصاف کے گھنٹوں کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا۔ مگر اجالا بیگم کسی کی نور جہاں بیگم نہیں بنی تھیں۔ جو کوئی مالن کے آگے اپنی جان پیش کرتا۔ باغ کے سب مالی اس واقعہ کی شہادت دینے کے لیے باہر کھڑے تھے۔ اندر دیوان خانہ میں کسی مقدمہ کی سفارش کے لیے احمد حسین آئے بیٹھے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک مناسب جنگ کو کونسا مرض اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ وہ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے ہیں۔ بڑے اصرار کے بعد جب مناسب جنگ نے اپنی مشکل بیان کی تو احمد حسین نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ اگر احمد حسین کی بند کار میں پردے لگا کر ا حالاً بیگم کو اورنگ آباد سے کہیں دور بھیج دیا جائے تو یہ مالی کتنا ہی سر پیٹیں کوئی شہادت نہیں مل سکتی۔ اور پھر وہ اجالا بیگم کو اپنی کار میں چھپا کر یوں بھاگے کہ دو گھنٹے بعد ساٹھ میل دور اجنا کے غاروں میں راج کمار سدھارت ہوس اور بے بسی کے ایک کھیل کو دیکھ کر اپنی آنکھیں جھکائے بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر جلا بیگم کے ہاتھ بندوق کو تڑپتے رہے اور ان کی گھٹی گھٹی چپخیں اندھیری گھاٹیوں میں گونج کر رہ گئیں۔ مگر احمد حسین بچارے کا کیا قصور ! آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں بھائیوں کے سامنے کوئی لڑکی آئے اور وہ بیل کی طرح اس پر منہ نہ ماریں اور پھر اجالا بیگم کے بے پناہ حسن سے فرشتے بھی نہیں بچ سکتے تھے۔

کئی مہینے بعد جب پرتاب ریڈی بر طرح کی دوڑ دھوپ کر کے ہار گئے تو اجالا بیگم پھر دادا حضرت سے بندوق کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک بار پھر اجالا بیگم زار و قطار روتی ہوئی احمد حسین کی دلہن بنی رخصت ہو رہی تھیں۔

ان کی کار اس بار پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ان کے ساتھ ساتھ مناسب جنگ کا وقار، ان کی دولت اور اجالا بیگم کا غرور بھی احمد حسین کے آگے ہاتھ جوڑے چل رہے تھے۔

باتھی مر کے بھی سوالکھ کا ہوتا ہے۔ مناسب جنگ کی پوتی تک آتے آتے بھی جاگیر کی آمدنی اتنی تھی کہ احمد حسین کے سات پشتیں ٹھاٹ کر سکتی تھیں۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ واحد حسین کی شاعرانہ ہٹ نے بی بی سے شادی کر کے جو خاندان کی لٹیا ڈبونی تھی، احمد حسین اسے پھر سے نکال لائے۔ یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا کہ احمد حسین کی شادی کی خبر سن کر تھوڑی دیر کے لئے تو واحد حسین بھی چکرا گئے کہ ان کا کھنڈرا بھائی مناسب جنگ تک آخر کیسے پہنچ گیا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا واحد حسین نے دیکھا کہ مناسب جنگ کی دولت منہ اٹھانے ان کی طرف چلی آ رہی ہے۔ کیوں کہ اجالا بیگم ایسی بنجر زمین تھیں جس میں کوئی کونیل نہ پھوٹی۔

کئی بار گھبرا کر انہوں نے میاں کو شادی کے لئے ٹٹولا۔ مگر احمد حسین کچھی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ جی بہلانے کے لئے عورتوں کی کوئی کمی تھوڑی تھی۔ اور وہ تو ایک ہی بیوی کے مارے اپنی جان مصیبت میں ڈالے ہوئے تھے۔ اچھا ہی ہوا جو بچوں کا بکھیرا نہیں ہے دور نہ راجہ اندر کے سے عیش وہ کیسے کرتے۔ ادھر بیوی کے سامنے الگ چوبیس گھنٹے کی دھونس تھی۔ کیا مجال کہ وہ ان کے کسی بھی نئے عشق اور نئی محبوبہ کے بارے میں چوں کر سکیں۔۔۔ انہیں پہلے ہی ذرا اسی بات ناگوار گزرتی۔ گھر میں تن پھن آتے تھے۔

اجالا بیگم بھی پلٹ کر یہ پوچھنے کی جرات کرسکیں کہ اتنا روپیہ کہاں خرچ ہوتا ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ احمد حسین کی اکلوتی بیگم بنی بیٹھیں تھیں اور اتنی بڑی ڈیوڑھی پر راج کر رہی تھیں۔ کہیں کسی نے سنا ہوگا کہ اتنی دولت کا مالک کوئی نواب محض بیوی کی خاطر اولاد سے محروم بیٹھا رہے! لوگ اجالا بیگم کی قسمت پر رشک کرتے کہ کیسا عاشق مزاج شوہر ملا تھا۔

اجالا بیگم کو صورت تو اپنی دادی کی ملی تھی اور دماغ وہ مناسب جنگ کا لائی تھیں۔ چنانچہ ایک دن اسی صوبہ داری دماغ سے انہوں نے ایک بہت بڑی اسکیم بنا ڈالی۔ اور اتنی کامیاب کہ آج ان کے یہاں خوشی کے نقارے بج رہے تھے۔ بعض وقت یہ لے پالک لونڈیاں چھو کر یاں بھی کیسا اہم رول ادا کر جاتی ہیں! اب اجالا بیگم کو قطعی یاد نہ رہا تھا کہ بی جانی کو ان کی ماں نے جہیز میں دیا تھا یا وہ پلیگ کے کیمپ سے آنے والی لڑکیوں میں سے تھی! ایک ہو تو کوئی ان کے بارے میں سوچے۔ ان کی ڈیوڑھی میں تو دس بارہ لڑکیاں پل رہی تھیں۔ بی جانی میں بھی اور چھو کر یوں کی طرح ساری کمینی خصلتیں موجود تھیں۔ قیمتی برتن چھنا چھن توڑنا، ایک ہار کے پکارنے پر کبھی جواب نہ دینا اور ایک ہی چھڑی کے مار پر ساری حویلی سر پر اٹھا لینا۔ لیکن اس کی سب سے زیادہ جو بری عادت تھی وہ عشق بازی تھی۔ اجالا بیگم یوں تو ان تمام چھوکیوں کے بے لگام جوانی کے آگے بندھ باندھتی پھر تیں اگر بی جانی نے تو ان کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اور عشق بھی کرتی تو کس سے! اس احمق بے وقوف غلام رسول سے، جو فاطمہ بیگم کا شوہر تھا۔ مگر احمد حسین کے قرض کی بدولت رہن پڑا تھا۔۔۔ احمد حسین چاہتے تھے کہ اسے جلد چھٹکارا دلا دیں کہ فاطمہ بیگم آخر ان کی منہ بولی بہن تھیں، مگر وہ اپنی ایسی ہی حماقتوں کے چکر میں پڑ کر اپنی معیاد بڑھوانے چلا جاتا تھا۔

بی جانی کے ساتھ اس کے چونچلے دیکھ کر کئی بار جا بیگم نے بی جانی کو ڈانٹا۔

اری اجاڑ صورت وہ کون سا ان بیابا ہے! فاطمہ بیگم اور اس کی لڑکی قیصر تیری جان کو روئیں گے!“ مگر بی ” جانی بے حیائی لا دے ہر وقت تقاضے کرتی کہ اس کا نکاح غلام رسول سے کر دو۔ اجالا بیگم کو اب اس کھیل سے نفرت ہو گئی تھی۔ انہوں نے کئی لڑکیوں کا بیاہ گڈے گڑیوں کی طرح بڑے ارمانوں سے کیا تھا۔ سچ مچ کے رقعے تک چھپوائے تھے۔ ایک

بار تو تحصیلدار کے چپر اسی کے لئے وہ سونے کی انگوٹھی تک لے گئیں تھیں۔ مگر وہ سب کم بختینکتیا کی طرح صرف بچوں کی پلٹنیں بڑھانے میں جٹ گئی تھیں۔ ان کی کاہلی بڑھتی جارہی تھی۔ ان کے دولہے الگ سودے سلف میں سے پیسے مارنے کی فکر میں رہتے تھے اور دن بھر اپنی بیویوں سے عشق بازی میں مشغول رہتے۔ کام کے نام پر اب ان کی جان نکلتی تھی۔

چنانچہ ایک رات موقع پا کر غلام رسول بی جانی کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا۔ اور تنگ آباد کے پرندے بھی احمد حسین کے حکم کے بغیر کہیں نہیں جاسکتے تھے تو بی جانی کی کیا مجال تھی

مگر اصل بات یہ تھی کہ اجالا بیگم اس دن خود حواسوں میں نہ تھیں۔ ضلع کا نیامہتم پولیس عیسائی تھا۔ اور اپنے ساتھ ایک حرافہ سالی کو بھی لگایا تھا۔ وہ مس جولی بمبئی کے کسی کالج میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ مگر یہاں آکر اس نے احمد حسین کو جانے کیسی پٹی پڑھائی کہ وہ تو بس کلب ہی کہہ رہے۔ آٹھ آٹھ دن گھر نہ آتے۔ آتے بھی تو جولی ساتھ اپنے ساتھ اسے اپنی جاگیر دکھانے لے جا رہے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے بنانا کر اسے کھانے کھلا رہے ہیں۔

اجالا بیگم نے زندگی بھر شوہر کی رنگ رلیاں برداشت کی تھیں۔ مگر اس بار کچھ اور ہی آثار تھے۔ باہر تو یہ خبریں اڑ رہی تھیں کہ احمد حسین جولی سے نکاح کر رہے ہیں اولاد کی خاطر۔ مگر اندر وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتے۔

”ہونہ۔۔۔ ہم مریں گے تو جانے کون فاتحہ کرے گا ہماری۔“

”یہ ساری جائیداد بھی سے کسی یتیم خانے کے نام لکھنا چاہیے۔“

ایسی باتیں اجالا بیگم نے اپنے میاں سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ عین اس موقع پر جب غلام رسول اور بی جانی پکڑے ہوئے آئے تو بی جانی کو مارتے مارتے انہوں نے اپنی لات کھینچ لی۔ کیونکہ اس کے چہرے پر ایک ایسا نکھار تھا جوا حالا بیگم کے اپنے چہرے پر کبھی نہیں آیا تھا۔ مگر جسے پہچانتے دیر نہیں لگتی۔

اس دن انہوں نے بہت کچھ سوچا اور اس رات بہت دنوں کے بعد جب احمد حسین نے اجالا بیگم کو سونے کے لئے بلوایا تو اجالا بیگم نے سر پر پلو سنبھال کر قبلہ رو ہو کر ایک خواب سنانا شروع کیا۔۔۔ رات رحمت علی شاہ نے انہیں خواب میں ایک بہت بڑی بشارت دی ہے کہ احمد حسین کا وارث بی جانی کے پیٹ سے پیدا ہوگا۔ لہذا انہوں نے کہا کہ اس چھوکری سے اگر وہ عقد کر لیں تو اجالا بیگم کے نہ تو حقوق متاثر ہوں گے اور نہ کوئی اور مسئلہ پیدا ہوگا۔ صاحبزادے کو وہ اپنا ٹا بنا کر پالیں گی۔ چلو سارے مسائل سلجھ جائیں گے۔ اجالا بیگم نے یہ خواب سنانے سے پہلے ہی باہر والے کمرے میں قاضی صاحب کو بلوالیا تھا۔ جو اپنے سامنے رکھی چھوڑے، بادام اور مصری کی بڑے پر سے مکھیاں اڑا رہے تھے۔ احمد حسین کو اس مسئلے پر سوچنے کی مہلت نہ ملی۔ رحمت علی شاہ سے انہیں اتنی عقیدت رہی تھی کہ آج تک ان کی ہر مراد وہیں سے پوری ہوئی تھی۔ اس لئے اس وقت بھی وہ آگے کچھ نہ سوچ سکے۔ جب قاضی صاحب احمد حسین کا نکاح بی جانی سے پڑھا رہے تھے تو بی جانی پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہی تھی۔ جیسے اجالا بیگم اسے کسی دھڑ چمار کو تھمائے دے رہی ہوں۔

اس رات، جب احمد حسین نے اس چھوٹی سی لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ زخمی چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی، لرز رہی تھی۔ ساری رات اس کی چیخیں اور سکیاں اجالا بیگم سن سن کر اپنے آنسو پونچھتی رہیں۔

دو تین مہینے اور ستر پتر درمیاں سے گزر بی گئے۔ اور عین اس زمانہ میں جب جولی مسز احمد حسین بننے کا پورا ارادہ کر چکی تھی ایک دن مبارک سلامت کے نقاروں میں احمد حسین نے سنا کہ وہ ’والد بزرگوار‘ بن گئے ہیں۔ اب وہ رحمت علی شاہ کی کرامات کے قائل نہ ہوتے تو کیا کرتے! مجبور اُوہ جولی کو بھول بھال کر رحمت علی شاہ کی درگاہ پر چڑھا دے اور بکرے لے جانے کی تیاریوں میں کھو گئے۔

اجالا بیگم نے چولی کے اندر سے دس کا نوٹ نکال کر تین بار بچے کے اُپر سے وارا اور پھر تھوکر کے بی جانی کی طرف بڑھا دیا۔

کھانے کی ہر بونگ کم ہوئی تو سرخ مدرے کے دسترخوان ہٹا کر وہیں چاول اور چکنائی کے دھبوں پر میراثنیوں نے ڈھول سنبھال لیا اور حلق پہاڑ پہاڑ کر گانے لگیں۔

دالان میں پہنائے بار کیا خوشنما لگا کے

مالی نے لا یا سہرا مالن نے لائی بار

اماں نے پہنائے بار کیا خوشنما لگا کے

بوڑھی حضرت بیگم نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اجالا بیگم کو سرخ بنارسی ساری پہنائی اور عطر لگا کے گھونگھٹ نکال کر مسند پر بٹھا دیا۔

سات ماؤں کو بلاؤ۔۔۔ حضرت بیگم نے عینک سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے ہجوم کو دیکھا۔۔۔ ان کے آس پاس تمام محفل کی خواتین کھڑی تھیں اور پھول پہنانے کی رسم دیکھنے کے لئے دھکم پیل کر رہی تھیں۔ حضرت بیگم پھول پہنانے اور رسمیں ادا کرنے میں استاد تھیں۔ کیوں کہ وہ خاندان کی سب سے بزرگ بوڑھی سہاگن اور نواسوں اور پوتوں والی خوش نصیب بی بی تھیں۔

وہ ہر رسم کی جزئیات سے واقف تھیں۔ اس لئے بی بیایں ہمیشہ ان ہی کو آگے بڑھا تیں۔

”صنڈل کہاں ہے۔ کھوپرے اور میوے کا تھال کدھر گیا؟“

صدقے کے روپے کہاں رکھ دیے۔“ حضرت بیگم نے عینک لگا رکھی تھی مگر بدحواسی میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ادھر عورتوں کا ہجوم الگ شور مچا رہا تھا۔ پچاسیوں مائیں تو ان کے سر پر سوار تھیں اور وہ تھیں کہ سات سہاگن ماؤں کو ڈھونڈ رہیں تھیں۔ صنڈل دے کر پان اور چھالی سے ان کی گود بھرنا چاہتی تھیں۔

تھیں اور وہ تھیں کہ سات سہاگن ماؤں کو ڈھونڈ رہیں تھیں۔ صنڈل دے کر پان اور چھالی سے ان کی گود بھرنا چاہتی تھیں۔

”احمد میاں کو تو بلاؤ۔۔۔“

یہ سن کر آدھا ہجوم باہر کی طرف ڈھل گیا۔ اور بڑی مشکل سے عورتوں کو ٹکراتے بچتے بچاتے احمد حسین اندر آئے۔ نظریں جھکائے، منہ پر دولہا والی حیا آمیز جھجک اور ایک نئے نویلے باپ کا غرور آمیز اطمینان۔ ان کے بال کچھ کچھ سفید ہو رہے تھے۔ چہرے کی لکیریں گہری ہو چکی تھیں۔ اور وہ بڑی تیزی سے موٹے ہوتے جارہے تھے۔

آتے ہی ان کا سر منڈوے کی بیلوں میں الجھا اور ٹوپی لڑکھڑا کے مسند پر آگری۔ وہ گھبرا کے سنبھلے اور خاص خاص بزرگ خواتین کو جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔

اجالا بیگم نے جانے کن کن خالاؤں اور چچی اماؤں کے آگے انہیں جھکنے کا حکم دیا اور وہ بیٹھے کے نصیب وہ ہونے کی دُعائیں لیتے لیتے ہانپ گئے۔

پھر خوشبوؤں میں بسی ہوئی، ٹھنڈی ٹھنڈی ریشمیں ساریوں والی خواتین نے ہنس ہنس کر انہیں اجالا بیگم کے پاس مسند پر بٹھا دیا۔ اس موقع پر سب ہی خواتین احمد حسین سے پردہ کرنا بھول چکی تھیں۔ بلکہ الٹا ان ہی کو حکم دے دیا گیا کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

اگر یہ بیٹا اجالا بیگم کے پیٹ سے ہو جاتا تو۔۔۔!“ عورتیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔“

اچانک اجالا بیگم کی نگاہ اپنی خالی گود پر گئی اور وہ چلانے لگیں۔

”اری بی جانی، نصیر نواب کو ادھر لاؤ۔“

سب کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اے لو بچہ ہی نہیں ہے اور حضرت بیگم ہیں کہ بیٹھی پھولوں کے بار سلجھائے جارہی ہیں۔

اندھیری کوٹھری میں بی جانی روتے ہوئے بچے کو چھاتی سے لگائے تھپک رہی تھی اور غلام رسول اس کے پیچھے جھنجھنا لئے ٹہل رہا تھا۔

”اوئی یہ تماشہ دیکھو۔ سب کام دھندا چھوڑ کر بچے کے پیچھے گھوم رہا ہے۔“

بچے کو وہاں بلا رہی ہیں۔“ ایک عورت نے بی جانی سے بچہ چھینا اور لے کر اندر بھاگی۔

حضرت بیگم نے بچے کو اجالا بیگم کی گود میں ڈال کر ان کا پلوٹر کاری، میوہ، مصری اور روپیوں سے بھر دیا۔ بچہ کا صدقہ اتارا۔ اجالا بیگم اور احمد حسین کو پھول پہنا کر منہ میٹھا کیا اور اس کے بعد وارن پھیرن کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خاندان کی ہر بی بی نے چاندی کے روپے ان کے سر پر سے وار کر چٹ چٹ دونوں کی بلانیں لیں۔ پھر اجالا بیگم اور احد حسین نے اٹھ کر ساری محفل کو سلام کرنا شروع کر دیے۔

بہت پیچھے کھڑی بی جانی چپ چاپ یہ تماشہ دیکھتی رہی۔

اجالا دلہن، دیکھو ہمیشہ بی جانی کا خیال رکھنا۔ اب اللہ رسول کی طرف سے اس کو خوش رکھنا تمہار کام ہے۔“ حضرت بی بی نے بی جانی کے چہرے پر جانے کیا دیکھا کہ لرز کرہ گئیں۔

ہو جی، بیجاری نے پیٹ کی اولاد آپ کی گود میں ڈال دی ہے۔۔۔“ کسی اور نے تائید کی۔

اوئی تو کیا میں حق نہیں دوں گی؟ اجالا بیگم نے برامان کر کہا۔۔۔“ آج ہی اس مردار کو نئی ساڑی اور کرتا دیا ہے۔۔۔“ بی جانی۔۔۔؟ اری چڑیل، نئے کپڑے پہن کر سب کو سلام کیوں نہیں کرتی؟

جھینپی شرماتی، بی جانی آگے بڑھی، دہلی پتلی، پندرہ سولہ برس کی سانولی سی لڑکی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس کا بچہ اجالا بیگم اپنی گود میں لئے بیٹھی تھیں، ورنہ کوئی یقین نہ کرتا کہ یہ ٹانگ برابر کی چھوڑی ایک بچہ کی ماں ہے۔ اس نے اپنی کلف لگی بینڈ لوم ساری کا پلوسر پر ڈال کر پہلے حضرت بیگم کے پاؤں چھوئے، پھر سب معزز بیگمات کی قدم بوسی کر کے وہ اجالا بیگم کے مہندی لگے سونے کی پازیبوں والے گورے پانوں پر گر کر رونے لگی۔

چل چل بٹ۔۔۔“ انہوں نے گھبرا کے اسے پیچھے ڈھکیلا۔ ادھر پھولوں کی ٹھنڈ سے گھبرا کے بچے نے رونا شروع کر دیا تھا اور احمد حسین ابھی تک سر جھکائے نئی دلہنوں کی طرح بیٹھے تھے۔

اری یہ رونے کی بدشگونی کیوں کر رہی ہے! تیری تو آج قسمت جگی ہے۔ دُعا مانگ کہ تیرا بچہ اپنے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائے۔ تو اب عمر بھر کے لئے روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہوگئی۔

حضرت بیگم نے بی جانی کو ڈانٹ دیا۔

یہ حرافہ کیا سکے گی!“ اجالا بیگم نے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر کہا۔

”اس کا دل ڈیوڑھی میں کہاں لگتا ہے۔۔۔ اسے تو طرح طرح کے سیر سپاٹے چاہیں ہر وقت۔۔۔“

مگر جب تک بچہ دودھ پیتا ہے اس چڑیل کے پیروں میں زنجیر باندھ کر رکھنا۔۔۔۔۔“ کسی بی بی نے مشورہ دیا۔ ”

کچھ آپ بھی تو بولئے ابا جان۔۔۔“ احمد حسین کی کسی رشتے کی سالی نے انہیں چھیڑا۔ ”

”مجھے بولنے کی اب کیا ضرورت ہے! میں جاتا ہوں باہر۔۔۔ آداب عرض ہے۔۔۔“

بچے کا نام کیا رکھا ہے احمد میاں؟“ کسی نے پوچھا۔ ”

”نصیر حسین خاں۔۔۔۔۔“

”اللہ مبارک کرے بہت اچھا نام ہے۔“

”اجی تابا حضرت اور تائی اماں نہیں آئے بھیج کو دیکھنے۔۔۔۔۔؟“

کسی بیگم نے رجز پڑھنا شروع کیا اور اجالا بیگم نے بند کا پہلا بول اٹھالیا۔

کیسے آتے ممانی بیگم۔ ہمارا گھر آباد ہوا تو ان کے کلیجے پھٹ گئے نا۔۔۔ میری سسرال میں تو سب انتظار کر رہے ”
”تھے کہ میں مرجاؤں تو سب میری جائیداد پر قبضہ کر لیں۔

بس بس اب چپ رہو نا۔“ احمد حسین نے انہیں ہلکے سے ڈانٹ دیا اور باہر جانے لگے۔ عورت خواہ کوئی ہو اپنی ”
!سسرال کی برائی کس تندہی سے کرتی ہے

یہ اتنا کیوں رو رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ بچے کی چیخوں سے اجالا بیگم پریشان ہونے لگیں۔ ”

لائے مجھے دے دیجیے۔“ اس سے قبل کہ کوئی اور بچے کو لیتا بی جانی نے بیچ میں سے بچے کو جھٹ لیا اور ”
بھاگی اپنی کوٹھری کی طرف تھوڑی دیر بعد چند عورتوں نے کوٹھری میں جھانک کر دیکھا کہ بی جانی پلو میں بچے کو
چھپائے بڑے اطمینان سے دودھ پلا رہی ہے۔ اور غلام رسول اس کے پاس بیٹھا جھن جھن بجائے جا رہا ہے۔

کیسی بدذات ہوتی ہیں یہ چھوکریاں۔ اس کی عمر تو دیکھو۔۔۔ ہماری لڑکیاں اس عمر میں سر پر ڈوپٹہ سنبھالنا بھی ”
نہیں جانتیں۔۔۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔۔۔“ استانی ماں نے سر پر پلو سنبھال کر اپنے گالوں پر تھپڑ مارے۔۔۔

اللہ احمد نواب کو دین دُنیا میں سرخرو کرے۔ بچارے کیسے سیدھے ہیں۔ تیس برس تک اولاد کے لئے صبر کیے ”
”بیٹھے رہے۔ اور اب بی بی کے کہنے سے ایک چھوکری کے ساتھ نکاح کر لیا۔

”دیکھنا بیٹا بھی باپ کی طرح سعادت مند ہوگا۔ اجالا بیگم تو اسے بڑے ٹھاٹھاٹ باٹ کا نواب بنا ئیں گی۔“

کیا ہو رہا ہے یہاں۔۔۔۔۔؟“ اجالا بیگم سب کو چیرتی پھاڑتی بی جانی کی کوٹھری میں آئیں۔ آج سرگوشیوں پر جانے کیوں ”
ان کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ ہر شخص کو شبہ بھری نظروں سے تک رہی تھیں۔

کتنی بار تجھے بولی کہ یہاں نوکروں کی کوٹھی میں چھوٹے نواب کو نکولایا کر۔۔۔!“ اور پھر غلام رسول کی جانب ”
مڑیں۔

کیوں رے ماٹھی ملے، تو یہاں کیوں مر رہا ہے۔ آج سب سے ضروری کام یہی ہے کہ تو چھوٹے نواب کے سامنے ”
”!بیٹھ کر جھن جھن کھیلے۔۔۔۔۔

غلام رسول کھسیا کے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ وہ نرا احمق تھا۔ ہونقوں کی طرح ہر وقت منہ کھولے رکھتا۔ گھٹی ہوئی چند یا چاندی کی طرح چمکتی۔ صاحب کی قمیص کا دامن اس نے ہاتھ پونچھ پونچھ کر سیاہ کر ڈالا تھا۔ اسے سب پاگل کہتے تھے۔ اور وہ اپنے اس خطاب پر بھی ہنسنے جاتا تھا۔ کوئی اس کے سامنے فاطمہ بیگم اور قیصر کا نام لے دیتا تو وہ شرم سے سر جھکا لیتا تھا۔ جیسے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ ہو۔۔۔ مگر یہی غلام رسول جانے کیسے بی جانی کے آگے پیچھے پھرنے لگا تھا۔ استانی ماں کہتی تھیں اجاڑ صورت سے اپنی جوانی نہیں سنبھلتی۔ اجالا بیگم نے اسے دھکا دے کر ہٹایا تو وہ بڑی دیر تلک کھڑا آنکھیں جھپ کا تاربا۔ پھر اس نے جھک کر جھن جھن اٹھایا اور بڑی عقیدت سے بڑے احترام سے اجالا بیگم کے سامنے پیش کر دیا۔

اجالا بیگم اپنی ایک سہیلی سے بچے کو چپ کرانے کے گر پوچھ رہی تھیں۔ غلام رسول کو یوں جھن جھنالیے دیکھا تو پہلے تو گھبرا گئیں اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

دیکھا بہن کیسا پگلا ہے یہ غلام رسول۔ جانے کہاں سے خرید کر یہ دو پیسے کا جھن جھنالا یا ہے چھوٹے نواب کے ”
”لئے۔۔۔ اسے بڑی محبت ہے میرے بچے ہے۔

”ہاں بہن اس وقت سے بچے کے پاس بیٹھا تھا جیسے اس کا اپنا بچہ ہو۔۔۔“

ہاں اس بیچارے کی بھی تو ایک لڑکی ہے حیدر آباد میں۔“ اجالا بیگم نے کہا۔۔۔ لڑکی کے نام پر غلام رسول دلی ”
مسرت سے ہنسا اور شرماتا ہوا ہاں چلا گیا۔

”اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔“

وہ جانے کب گنگناتے گنگناتے اونگھ گئے۔

رضیہ کا چہلہ ہونے والا تھا۔ چاند کے ساتھ محلے کی جانے کون کون لڑکیاں دالان میں ڈھول لئے بیٹھی تھیں۔

سہیلی میری بھولی ممو لا میراوا ہی لیاماں

ان کے گانے کی آواز میں بابر ”ایوان غزل“ کے پھاٹک تک سنائی دے رہی تھیں۔ تخت کے اوپر بی بی عینک لگائے ننھے ننھے کپڑے ہی رہی تھیں۔

نیچے فرش پر بادام، اخروٹ اور ناریل، مسری کشٹیوں میں رکھی ہوئی تھی۔ اور لنگڑی پھوپوز چہ کے لئے اچھوانی تیار کر رہی تھیں۔

بابر ”بیت الغزل“ میں بیٹھا ہوا راشد بیٹی ہونے کی خوشی میں دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا۔ باورچی خانے سے ماہی قلعے کے بگھار کی خوشبو مہکی اور چاند نے دوسرے گیت کا بول اٹھایا۔

گاؤ مبارکبادی ماں جم جم نت نت۔

اس گھر میں کیسا سکون تھا۔۔۔ کتنا اطمینان۔۔۔ ہر طرف لوگ اپنی ذات میں مگن تھے۔۔۔ اب سردیاں آجائیں گی تب رات بری نہ لگے گی۔ واحد حسین کو رات کبھی بھی بری نہ لگتی تھی۔ رات جو اپنے ساتھ سنہرے رو پہلے خواب لاتی ہے۔۔۔ ساری دنیا کی فکروں سے دور لے جاتی ہے۔

اندر رضیہ کی ننھی سی بچی اور ہی تھی۔۔۔ یہاں کیسا سکون تھا۔۔۔ اس گھر کے اندر کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ دنیا میں کہیں ایک بہت بڑا شہر بیروشیما ایٹم بم سے تباہ ہو چکا ہے۔

دنیا آگ اور خون کے ایک بھیانک کھیل میں گھری ہوئی ہے۔۔۔

ہندوستان میں آزادی کی جنگ تیز ہو رہی تھی۔ انسان بھیڑیے بنے دوسرے انسانوں کا تعاقب کر رہے تھے۔۔۔ موت۔۔۔ تباہی، ہر طرف بابا کار مچی ہوئی تھی۔۔۔ یہ بابر کی دنیا واحد حسین سے بہت دور تھی۔ مگر وہ اس دنیا سے اپنا نا تا نہیں توڑ سکتے تھے۔ ان دو دنیاؤں کے بیچ۔۔۔ وہ گھرے بیٹھے تھے۔۔۔ ایسے وقت انسان پائپ میں پناہ لیتا ہے یا غالب میں۔۔۔

اور واحد حسین سوچ رہے تھے کہ شاعری کی اہمیت زندگی میں کم سمجھی جاتی ہے۔ مگر اکیلا غالب کہاں کہاں ان کا ساتھ دیتا ہے۔۔۔ جب وہ بے سہارا ہو جاتے۔

بالکل تنہا رہ جاتے تھے تو غالب کو تھام لیتے۔۔۔

انسان کہاں کہاں اپنی محبت کھو جتا پھرتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے۔۔۔ دنیا کے سارے فن کار، سائنس داں اور دانش ور صرف ایک ہی چیز کو پانے کی جستجو کرتے ہیں۔۔۔

محبت جو زندگی سے دور انسان کی آخری منزل۔۔۔ آخری پناہ۔۔۔ جسکے لئے انسان موت کو قبول کرتا ہے۔

چلو آج لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔۔۔ انہوں نے اطمینان سے اخبار کو اپنے سامنے سے ہٹایا۔۔۔ بیروشیما کے سارے بچے ”جو ابھی پیدا ہوئے تھے۔۔۔ ان بچوں کی آمد پر خوشی منانے والی مائیں۔ نانیاں دادیاں۔۔۔

بنی پوسے کیا کیا واروں ماں۔۔۔ یہ عورتیں کتنی رجائی ہوتی ہیں۔۔۔ ہر نئے بچے کی آمد پر جانے کتنے خواب سجالیتی ہیں۔۔۔ کتنے محل کھڑے کر لیتی ہیں۔

اڑا اڑا دھم۔۔۔ ایک ایٹم بم نے سب کو خاموش کر دیا۔ نجات کہاں ہے۔۔۔ مذہب اور خدا کا تصور۔۔۔ خدا ہے مگر وہ اپنی خدائی میں دخل کیوں نہیں دیتا۔۔۔

کئی بار واحد حسین مسکین علی شاہ طوطا چشمی کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بحث کرنے نہیں آتے ہیں۔ مذہبی مسائل پر۔ بلکہ صرف علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔۔۔

مگر علم کی انتہا کہیں نہیں تھی۔ علم فلسفے میں الجھا ہوا تھا۔ صدیوں کے تجربوں اور شخصیتوں کی اپنی مصلحتوں اور فائدوں میں۔۔۔ واحد حسین اور الجھتے گئے۔

آخر انسان کون سے نظریے کو قبول کرے۔ کس مکتبہ فکر سے اپنے آپ کو وابستہ کرے؟

گھبرا کے وہ بھی اپنی غزل کی طرف لوٹ آئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی مشاعرے میں بیٹھتے ہیں اور چاروں طرف سے لوگ داد پھینک پھینک انہیں ممنون و مشکور کر رہے ہیں۔

وہ چونک پڑے سچ مچ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ چاند سے لے کر بی بی تک ہلڑ بازی میں مصروف تھے۔ جب آدمی کے پاس کچھ سوچنے کے لئے نہ رہے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ ان کے آس پاس سب وہی لوگ بنس رہے تھے جنہوں نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ وہ صرف آج کے لئے جی رہے تھے۔

زندگی کی اس دوڑتی اچھلتی رو سے بہت دور بیٹھے ہوئے واحد حسین اپنے خیالی معشوق کے پیکر کوکو سے جارہے تھے۔

اس سڑے بسے موضوع پر انہوں نے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں غزلیں تو لکھ ڈالی ہوں گی۔ بس ذرا سی ردیف قافیے کی تبدیلی کرنا پڑتی۔ یہی کہ معشوق ان کا کلیجہ بھون کر کھا رہا ہے۔ ادھر رقیب روسیہ ہیں کہ ٹڈی کی طرح ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ مگر پھر بھی سیکڑوں بار کی چوڑی ہوئی ہڈی کو دوسرے کے منہ میں دیکھ کر پانی بھر آتا۔

لیجئے جناب غزل تیار ہے۔۔۔

مگر آج جانے کیوں اس ستم پیشہ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یا پھر راشد کی کم آمدنی اور قرض کی بلاؤں کو دیکھ کر وہ دور ہی سے دھتا بتانے لگا ہے۔

دالان کے شور سے گھبرا کے واحد حسین نے عینک نیچے سرکائی اور گھومنے والی کرسی کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

یہ سب ان کے کون ہیں۔۔۔؟ انہوں نے اپنی ذات کو فراموش کر کے سوچا۔۔۔ یہ شریر بچے۔۔۔

بے رحم رشتہ دار۔ نا فرمان اولاد۔ اور خودسر بیوی۔۔۔ ان ہی لٹیروں نے تو ان کے ذہن کی جولانی، ان کا خوبصورت بدن اور معشوقوں کے ہجوم۔۔۔

سب ہی کچھ چھین لیا تھا۔

عورت کے بغیر انہوں نے زندگی کی کسی خوبصورتی کو مکمل نہیں سمجھا تھا۔ ”ایوان غزل“ کے باسی ہمیشہ کسی نہ کسی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے تاکہ ان کی شاعرانہ حس بیدار رہے۔ واحد حسین نے بھی اٹھتی جوانی کے ساتھ ہی ادھر ادھر دل پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ ہر روز وہ ایک نئے محبوب کے عشق میں گرفتار ہوتے۔ ساری رات ان کے آنسوؤں سے تکیہ بھیگ جاتا اور صبح ہوتے ہوتے ایک غزل تیار ملتی۔

لیکن یہ بھی ایک عورت ہی تھی۔۔۔ انہوں نے دوبارہ کرسی گھما کر سامنے بیٹھی ہوئی بی بی کو دیکھا۔۔۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ بیٹھی ننھے تھے کپڑے سی رہی تھیں۔ جیسے ان کی زندگی کا اصل مقصد یہی تھا۔۔۔ وہ دُنیا کے سارے ہنگاموں سے اور واحد حسین کے منتشر دماغ سے ، ان کے تشنہ بدن سے بالکل ہی نا واقف تھیں۔۔۔ یہی وہ لا پرواہ عورت تھی جس نے محبوبہ بن کر ان کی زندگی میں سارے رنگ بکھیر دیے تھے اور بیوی بن کر زندگی کا ہر رنگ پونچھ ڈالا۔۔۔ آج یہ عالم تھا کہ عدالت میں کئی کئی مقدموں کے سلسلے میں ان کا نام پکارا جا تا تھا۔ دونوں لڑکیاں اپنی اپنی سرال میں سسک رہی تھیں اور انہیں پنشن کیا ملی کہ نہ جانے کتنے مرض اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ صرف پچپن برس کی عمر میں کوئی ڈاکٹر بتا تا پریشر بڑھ رہا ہے، کوئی حکیم کہتا صرف اختلاج قلب ہے۔ اور گوہر پھوپھو ہر جمعرات کی شام پیلے چاولوں کے اوپر لیمبو ، بھلا ویں اور دہی ڈال کر صدقہ اتارتیں کہ سر شام باغ میں ٹہلنے سے کوئی سایہ ہو گیا ہے۔

ورائٹے کے ایک کونے میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھے یہ سب دیکھا کرتے۔۔۔ یہی کہ ہوا بند ہے۔ گرمیاں شروع نہیں ہوئیں مگر بلا کا امس ہے۔ رات کو جانے مچھر کاٹتے ہیں یا بچوں کا شور سونے نہیں دیتا۔ باغ میں تمام درخت بھی اداسی کا لبادہ اوڑھے کھڑے ہیں اور ٹپ ٹپ ان کے آنسو ز دہ پتوں کی طرح گر رہے ہیں۔

اخبار بھی چکرا دینے والی خبروں کے بوجھ سے میز پر پڑے پڑے کانپ رہا ہے۔

اعلیٰ حضرت کا پھر عتاب نازل ہوا۔ شاہی مطبخ کے منتظم پر۔ خانہ زادوں کو دیے جانے والے ٹماٹر کے سالن میں گھی کم کیوں ڈالا جاتا ہے! انتظام پخت و پز اتنا خراب کیوں ہے؟

یہ بات کنگ کوٹھی کے مطبخ سے نکل کر چار مینار کے چائے خانوں تک پہنچ گئی ہوگی۔ پانچ پیسے کی چائے کی پیالی سامنے رکھے دمے کے مریض ، شہر کے بڈھے شاعر ، افیمی، چرس اور سیندھی پینے والے، ڈیوڑھیوں سے نکالے ہوئے آوارہ گرد، وقت کے مارے ہوئے نواب اور سازشوں میں ادھر ادھر دوڑنے والے ”ہندوستانی“ وہ سب آج چائے خانوں میں اسی مسئلوں پر بحث کر رہے ہوں گے کہ آج حضور کی تیوریوں پر بل ہے خدا خیر کرے۔۔۔

جنگ ختم ہوگئی۔۔۔ گاندھی جی اب بدیشی چیزوں کا بائیکاٹ کریں گے۔ اپنے آشرم میں برت رکھیں گے۔۔۔ انسا کے زور پر اب ہندوستان کو آزاد کیا جائے گا۔۔۔

یہ ”ہندوستان“ دکن سے بہت دور تھا۔۔۔ دہلی طور پر وہاں کا تصور کرتے ہوئے بھی واحد حسین تھک جاتے تھے۔

ہاں آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔۔۔ اپنا بادشاہ۔۔۔ اپنی ریاست۔۔۔ اپنا ملک۔۔۔ واحد حسین کو اپنے شہر سے، اپنے گھر سے بڑی محبت تھی۔ اس لئے وہ باہر کی خبریں بہت کم پڑھتے تھے۔۔۔ آج کی اہم خبر۔۔۔ خانہ زادوں کے سالن میں۔۔۔ اور چو سے محلے کے کسی دربار میں ایک تھے۔۔۔ شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے

ضم کے رخ منور پر جو ایک تل سا چمکتا ہے

گویا خدرت کے منشی نے خلم جھٹکا سو نقطہ ہے

واہ وا“ کے شور سے چھتیں اڑ رہی ہیں۔

محبوب کی مہندی میں پھولوں کے گجرے بک رہے ہیں اور کوٹھے پر ایک گلاب کی کلی جیسی نازک اندام طوائف سے کیدار میں داغ کی غزل گا رہی ہے

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

پتھر گئی کے سامنے سالار جنگ کا عالی شان محل کھڑا ہے۔ بے شمار کمروں میں دُنیا کے نادر الوجود عجائبات اکھٹے کرنے کے بعد وہ نہایت لا پرواہی سے بیٹھے ایک کرم خورہ مخطوطے کو عدسے کی مدد سے پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کا سب سے اہم شوق قیمتی اور نایاب کتابیں جمع کرتا ہے۔

کنگ کوٹھی کے پھاٹک سے بھوئی خاصے کے خوان پوش لئے باہر نکلے ہیں۔۔۔ آج جانے کس کی قسمت جگی۔۔۔ ؟

کون خاصے سے سرفراز کیا گیا۔۔۔ یہ محض اتفاق ہوتا کہ حضور کی نگاہ کسی جانب اٹھ گئی۔ کسی کے دروازے پر کنگ کوٹھی کی تین لمبی چوڑی کاریں رکیں۔ دس پہرے دار برآمد ہوئے۔ چار بھوٹیوں نے مل کر ایک خوان پوش اتارا۔ آدھا کلچہ ایک آم۔ ایک طشتری میں بالائی۔ مگر اس کے پیچھے نوازشوں کا ایک لمبا سلسلہ ہوتا۔۔۔ بڑا عہدہ۔۔۔ جاگیر۔۔۔ خطاب۔۔۔ آنے والی نسلوں کا مستقبل اس آدھے کلچے میں چھپا ہوتا۔

اونچی حویلی کے دیوان خانے میں قالین پر چنو نواب تان پورہ لئے بیٹھے ہیں اور ساری دُنیا سے بے خبر آنکھیں بند کئے گارے ہیں۔

پھلوا میں گند میکا بسنت

ہر داموں لے دے دے

اُٹھو چنو نواب اُٹھو۔ بہار کا موسم کب کا بیت گیا۔

پھولوں کی خوشبو جاتی رہی۔ اب تو ہر سوخزانکا سوگ چھایا ہوا ہے۔ پھول ابھی اپنی ننھی ننھی کونپلوں میں چھپے آرام کر رہے ہیں۔ گلاب کی کیاریاں کٹنگ کے بعد کیسی بری لگتی ہیں۔ جیسے میت اٹھ جانے کے بعد گھر پر اداسی چھا جاتی ہے۔ آج مالی سوکھے پتے اٹھانے کے لئے دھوبیوں کو بلا کر لایا ہے۔ اب فنا کی آگ ہر چیز کو جلا پھینکے گی۔۔۔ پھر گلاب میں نئی کلیاں اُٹیں گی۔۔۔ نئے شگوفے مسکرائیں گے۔

مگر میرا ذہن کیسا اڑیل ٹٹو ہو گیا ہے اب۔ سارا دن ڈھل گیا۔ مگر ایک بھی پھڑکنا ہوا شعر پیدا نہیں ہوا۔

کبھی بی بی بی تھیں جن کے تصور پر غزلوں کا سیلاب سا آجاتا تھا۔ مگر اب وہ انگور کی اس بیل کی طرح بے مصرف ہو چکی تھیں جس کے پھل اتار لئے گئے ہوں۔

تئیس برس ہو گئے انھیں بی بی کا انتظار کرتے ہوئے۔ لیکن آج انھوں نے غور کیا کہ بیوی فولاد کی طرح اپنی جگہ جمی ہوئی تھیں۔ البتہ خود ان میں جگہ جگہ نشیب فراز آ گئے تھے۔۔۔ بی بی اب ان کی معشوقہ نہیں رہی تھیں بلکہ جنگ کی بی بی بن چکی تھیں۔

بڑی ڈیوڑھی، خاندان کی اونچی ناک، واحد حسین کا عاشقانہ مزاج، راشد کے ترقی پسند خیالات اور چاروں طرف روئے جھگڑتے ان کے نواسے پوتے۔

یہ سب کام بی بی نے ان کے جلانے کے لئے کئے تھے۔ جیسے وہ دور کھڑی انھیں ٹھینگا دکھا رہی ہوں۔

سامنے تمباکو سے بھرا پائپ رکھا ہے اور بار بار آسمان کی وسعتوں کو دیکھ کر گنگنا رہے ہیں

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو ع

ہائے ہائے۔۔۔ یہ غالب بھی کیا کیا کہہ مرا۔۔۔ ما تم ایک شہر آرزو۔

انھوں نے اپنی کٹی پھٹی غزل کو اُٹھا کر پٹک دیا۔ اور پائپ اٹھا کر پھر قافیہ کی تلاش میں کھو گئے۔

گڑتا پورا کر کے بی بی نے نظریں اٹھا نیں اور گم سم بیٹھے ہوئے واحد حسین کو دیکھا۔

بی بی اس گھر میں یوں رہتی تھیں۔ جیسے کسی نے صحرا میں گلاب کا قلم لگا دیا ہو، اور اسے زبر دستی پھلتا پھولتا بھی دیکھے۔

تینیس برس گزرنے کے باوجود ان کی جڑیں اس زمین میں پیوست نہیں ہوئی تھیں۔۔۔ وہ اس چڑیا کی طرح رہتیں جسے یقین ہو کہ ایک دن پنجرہ کا دروازہ کھلے گا اور وہ کسی پھولوں سے لدی شاخ پر جا بیٹھیں گی۔

بی بی کے والد واحد حسین کی ڈیوڑھی میں منشی تھے۔ منشی گیری کرنے کے بعد وہ بیگم صاحب کو خوش کرنے کے لئے بی بی کی اماں سے بنوا کر پاپڑ، بڑیاں اور اچار لے جاتے تھے۔ کیوں کہ اپنے مالکوں کی خوشنودی حاصل کرنا ان کے خون میں شامل تھا۔ اس لئے ”ایوان غزل“ میں منشی صاحب کی بڑی او بھگت ہوتی۔ کوئی تقریب ہوتی تو ساری ذمہ داری کے کام انہیں کو سونپ دیے جاتے۔ ڈیوڑھی کی بیگمات اپنی ساسوں اور سوکنوں سے چھپ کر جوز یور یا کپڑا خریدنا چاہتیں وہ منشی ہی لا کر دیتے تھے۔ اس ہیرا پھیری میں دو چار آنے بے ایمانی سے بچا کر جب وہ گھر جاتے تو اپنی اکلوتی بیٹی کو ان ڈیوڑھیوں کے ٹھاٹھاٹ کے حیرت انگیز قصے سناتے تھے۔ بی بی منشی صاحب کی جھونپڑی میں پیدا ہوئی تھیں۔ مگر وہ حسن لائی تھیں، قصے کہانیوں کی محل والیوں شہزادیوں جیسا۔ جو ان کی صورت دیکھتا دیوانہ ہو جاتا تھا۔ مگر جب منشی صاحب اپنی بیٹی کو دیکھتے تو گھبرا جاتے تھے۔ ایک تو عورت ذات اور پھر اتنی حسین۔

اللہ ہی اس کا بیڑا پار لگائے گا۔

منشی صاحب تو ڈیوڑھی کے ان دونوں بھائیوں سے اچھی طرح واقف تھے جنہیں عشق بازی کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی ڈیوڑھی میں نہ لے گئے تھے۔

رات کو جب وہ بیوی کو سناتے کہ ”ایوان غزل“ میں روز پانچ سیر گوشت پکتا ہے تو بیوی حیرت کے مارے اچھل پڑتیں تھیں۔ کیوں کہ خود ان کے ہاں مہینوں آدھا پاؤ گوشت بھی نہ پکتا تھا۔ وہ پھر ڈیوڑھیوں میں ہونے والے ظلم و ستم کے قصے سن سن کر کانپ جاتی تھیں۔

اس لیے بی بی کے چھوٹے سے معصوم دل میں نوابوں اور جاگیر داروں سے خوف کے ساتھ ساتھ شدید نفرت بھی بڑھتی گئی جو بیک وقت چار چار بیویاں کرتے ہیں پھر لونڈیوں اور داشتاؤں کی تعداد ان کے علاوہ ہوتی ہے۔ ان کے ہاں اولاد کی محبت خون کے رشتے سے نہیں ہوتی بلکہ مصلحت کی جاتی ہے۔ بی بی کو ان لوگوں سے جتنی نفرت تھی اتنا ہی ان کا جی چاہتا کہ ایک بار ان قصے کہانیوں والے کسی محل کو دیکھ آئیں۔ مگر منشی صاحب نے ہمیشہ ان کی بات کو ٹال دیا۔ اور پھر جب وہ چودھویں برس میں آئیں اور ایک پولیس کانسٹیبل کا پیغام ان کے لیے آیا تو بیوی کی صلاح سے منشی صاحب بی بی کو ڈیوڑھی لے گئے ایک دن، تا کہ بیگم صاحب کو سلام کروا کے بیٹی کی شادی کے لئے کسی بخشش کے طلب گار ہوں۔

اس طرح ڈرتی کا نپتی حیران پریشان کی بی بی ایک دن ”ایوان غزل“ میں داخل ہو گئیں۔

سفید ہرک کا پاجامہ، گلابی ململ کا رنگا ہوا کھڑا دو پٹہ، کلی دار کرتا اور لمبے بالوں میں اوپر سے نیچے تک ہرا اور سرخ ”کوڑلا“ پڑا ہوا۔

واحد حسین کی خالہ اماں نماز کی نیت باندھ چکی تھیں۔ مگر سامنے سورج کی طرح دمکتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھ کر انہیں نیت تو رُنا پڑی۔۔۔ الہی خیر۔۔۔ اس چھوکری کو سلامتی سے گھر پہنچائیو۔

خالہ اماں کوششی صاحب کی عقل پر رونا آ رہا تھا۔ اس گلاب کی کلی جیسی چھو کری کو یہاں کیونلے آیا۔۔۔؟ کیا جانتا نہ تھا کہ احمد حسین اور واحد حسین بے ننھے بیلوں کی طرح چاروں طرف منہ مارتے پھرتے ہیں۔ آئے دن ان کی عشق بازی سے سارا گھر عاجز تھا۔ احمد حسین نے اپنے خاندان کی روایت کے مطابق شاعری نہیں کی تھی۔ اس لئے وہ تو کسی ہیر پھیر کے بغیر دھپڑ نی چمار نی تک کو پکڑ لاتے تھے۔ گھر کی لونڈیاں چھو کر یاں تو بے چاری ہر وقت کی ہی چیز تھیں۔ مگر واحد

حسین کیوں کہ شاعر تھے اس لئے وہ کئی کئی دن کا روگ پالتے تھے۔ اس وجہ سے سب ہی کی جان مصیبت میں رہتی تھی۔ ان دونوں کی ناک میں نکیل ڈالنے کی بڑے حُضت کو بڑی فکر تھی۔ وہ گھنٹوں خاندان کے بزرگ خواتین وہ حضرت کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھتے۔ مگر کہیں خاندان نیچا ہوتا تو کہیں جہیز کم ملنے کی امیدیں۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو۔ کاش

دوسرے کمرے میں واحد حسین گنگناتے پھر رہے تھے۔ اور اپنی خالہ زاد بہن کے پیچھے پڑے تھے کہ وہ اپنی سہیلی زمانی بیگم کو بلا بھیجیں۔

بس بس اب اور پیچھا نکرو بھائی جان زمانی کا۔ اس کی ماں کوئی اچھا پیغام ڈھونڈ رہی ہیں۔ بچاری بچی کی ”
”زندگی کا بے کو چپ خراب کرتیں۔

اور پھر چند منٹ بعد ان کی بہن پردے کے پاس آکر بولی

”بھائی پاشا۔۔۔ ادھر آئیے ذرا یہاں سے جھانک کر دیکھئے۔ آپ نے اتنی خوبصورت لڑکی بھی کبھی دیکھی ہے۔“

واحد حسین نے پردے کا کونا اٹھا کر دیکھا۔۔۔ سامنے فرش پر جوتوں کے پاس ایک ہیرے کی کئی جیسی لڑکی دمک رہی تھی۔ سر پر دوپٹہ سنبھالے چاروں طرف یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی جیسے کسی عجائب خانے میں چلی آئی ہو۔

واحد حسین نے اس قیامت کے فتنے کو دیکھا اور جیسے سینما کی متحرک تصویر چلتے چلتے اچانک رُک جاتی ہے، یوں ساکت ہو گئے۔

کئی منٹ گزر گئے تو ان کی بہن نے گھبرا کے کہا۔

”بھائی پاشا، ہٹ جائیے۔ اور ہر گوشہ ہے۔“

اور پھر وہ آگے بڑھ کر بی بی کے سامنے کھڑی ہو گئیں کہ کہیں واحد حسین ان کی سحرانگیز آنکھوں کو بھی نہ دیکھ لیں۔

پھر دروازہ بند کر کے انہوں نے کہا۔

منشی صاحب کی بچی آئی ہے۔ بچارے غریب لوگ ہیں۔ صورت شکل کی کیا اچھی ہے بول کے۔“ انہوں نے اپنی ”
غلطی پر گھبرا کے بی بی کی اہمیت کم کرنا چاہی۔

مگر واحد حسین نے کچھ نہ سنا۔ انہیں تو یوں لگا جیسے وہ اندھے ہو گئے ہوں۔ ان کے سامنے ایسی چکا چوند ہوئی تھی کہ اب چار سواند ہیرا سا نظر آ رہا تھا۔ اس گھور اندھیارے میں کیسی زمانی بیگم اور کہاں کی طوائفیں۔۔۔ واحد حسین ساری رات بے قراری سے ٹہلتے رہے۔ ان کی بہن ڈر رہی تھیں کہ اب وہ منشی صاحب کی بیٹی کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ شروع کریں گے۔ مگر وہاں تو سخت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کھانا پانی بند تھا۔ دوستوں کے ساتھ قہقہے اور ہر ہفتے کی رات کو مشاعرے کی چیخ و پکار۔ ہر طرف اوس پڑ گئی تھی۔ واحد حسین کو یوں لگا جیسے یہی وہ معشوق تھا جس کے انتظار میں ”ایوان غزل“ کے ہر شاعر نے شاعری کی تھی جیسے یہی اس کے تصور میں غرق تھے۔۔۔ اور پھر جب ان کی ایک بھانجی نے اسکول میں کلاس فیلو ہونے کے ناطے واحد حسین کی مدد کرنا چاہی تو عجیب و غریب اطلاعات ملنے لگیں۔

اسے سوکھنے سے نفرت ہے۔ وہ نوابوں جاگیر داروں سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اسے ڈیوڑھیوں میں رہنا بالکل پسند نہیں۔ نوابوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ چند دن میں بدل جاتے ہیں۔

شاعری اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔

واحد حسین ہر روز ایک نئی بات سنتے۔ اور ان کی آتش شوق اور زیادہ بھڑک اٹھتی۔ وہ تو اپنی دانست میں پورے فرہاد بن گئے تھے کہ جوئے شیر بہانے کو تیار کھڑے تھے۔ ادبران کے ابا حضرت داغ کی صحبتوں میں بیٹھے غزلیں سناتے رہے اور واحد حسین اور احمد حسین کے لئے رشتوں پر غور کرتے رہے۔ لیکن ہوا یہ کہ آخر کار پانچ ہزار نقد کے لالچ نے منشی صاحب کو پگھلا دیا۔ ”ایوان غزل“ کے سب سے بڑے ہال ”بیت الغزل“ میں بی بی دلہن بنی اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔ جب چار مضبوط عورتوں نے مل کر نکاح کے اقرار کو ان کی گردن پکڑ کر ہلائی تو وہ بے ہوش ہو گئیں۔ اور دولہا کے بدلے سب سے پہلے ان کی صورت حکیم نے دیکھی۔ ادھر واحد حسین کے ابا کا غم سے برا حال تھا۔ کیوں کہ اپنی پسندیدہ عورتوں سے بعد میں چاہے نواب لوگ کتنے ہیں نکاح چھپ دب کر کر لیں۔ مگر پہلی بار سہرے جلوے کی دلہن کسی بڑے خاندان کی عزت والی لڑکی ہوتی تھی۔

بی بی کی ساس اس بیان کی راوی تھیں کہ بی بی دن رات اس خوف کے مارے رویا کرتیں تھیں کہ ایک دن انہیں ڈیوڑھی کی کسی دیوار میں چنوا کر واحد حسین ایک اور عقد کر ڈالیں گے۔ انہوں نے کبھی واحد حسین کو دل سے اپنا شوہر نہیں مانا۔ بلکہ ایک ضدی لٹیرا سمجھا جو زہر دستی انہیں اپنے محل میں لے آیا تھا۔ بچ نکلنے کے راستے مسدود تھے اس لئے بی بی نیک چلن قیدیوں جیسی زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ کئی مہینے تک آنکھیں بند کئے سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جدھر ان کی ساس کہتیں چلی جاتیں۔۔۔ واحد حسین جو بات کہتے مان لیتیں۔ ”ایوان غزل“ میں بریانی کھانے سے انہیں متلی ہوتی تھی۔ زیور کانتوں کی طرح چبھتے۔۔۔ بنارسی ساڑھیوں سے وحشت ہوتی تھی۔

فرمان برداری کے پسند نہیں۔ مگر بی بی کی خاموشی سے واحد حسین کو ڈر لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بھکاریوں کی طرح در در کا مزہ چھکنے والے واحد حسین سب نگاہوں سے تو بہ کر کے بیٹھ رہے تھے۔

اگر بی بی آتے ہی زریں ساریوں اور ہیرے موتیوں کے زیوروں میں کھو جاتیں تو وہ بھی ان سے سیر ہو کر کسی اور طرف رُخ کرتے۔ مگر بی بی تو غزل کا وہ معشوق تھیں جو خوشبو کی طرح چار سو پھیلا ہوا تھا۔ واحد حسین محسوس کرتے تھے مگر انہیں چھو نہ سکتے۔ تین بچوں کے باپ بننے کے باوجود انہیں یوں لگتا جیسے بی بی آج بھی ان کے لئے اجنبی ہیں اور وہ ازلی پیا سے بنے ہاتھ نہ آنے والی سونے کی چڑیا کے لئے جال بچھائے بیٹھے تھے۔

پھر راشد کے بڑھتے ہوئے قد نے ان کی فکریں اور بڑھا دیں، بشیر اور بتول کی ننھی ننھی شرارتیں بڑھنے لگیں۔ بی بی کے چہرے پر دمکتا ہوا سورج ڈھلنے لگا۔ اور پھر ایک وہ دن آیا جب بی بی نے اپنے ہاتھ سے راشد کے سر پر سہرا باندھا۔ بشیر بیگم کو دلہن بنایا اور ننھے شاہین کو سینے سے لگا کر اپنی ہر شکست بھول جانے کی کوشش کی۔

ان تئیس برسوں کے پھیلے ہوئے دنوں میں بی بی نے ان سے کبھی شکایت کی، نہ جھگڑا کیا۔ انہوں نے واحد حسین کی ہر بات مانی۔ خاندان کے سارے چھوٹوں اور بزرگوں کو خوش رکھا۔ کسی کی بات میں دخل نہ دیا۔ ان کی آواز ”ایوان غزل“ کے درودیوار نے بہت کم سنی۔ وہ کپڑے کی گڑیا بنی واحد حسین کے ہاتھوں میں کھیلتی رہیں۔ مگر کسی کو آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ انہیں گاجر پسند ہے یا مولیٰ! وہ مٹھائی شوق سے کھاتی ہیں یا کھٹائی۔

کیسی کینہ پرور تھی یہ عورت! کسی نے سچ کہا ہے کہ وہ جاگیرداروں سے نفرت کرتی ہے۔ اسے ڈیوڑھی میں رہنا پسند نہیں ہے۔ جوں جوں بی بی پیچھے ہٹتی گئیں، واحد حسین تشنہ کام عاشقوں کی طرح آگے بڑھتے گئے۔ انہیں پانے کی آرزو میں پیچھا کئے گئے۔

اسی لئے تو اس ستم گر معشوق کے بیان میں انہوں نے سات بیاضیں سیاہ کر ڈالی تھیں۔

مگر بی بی آج بھی بڑے سکون کے ساتھ بیٹھی نواسوں پوتوں کے کپڑے سی رہی تھیں۔ وہ دنیا کے ہر مسئلے پر ہنستیں باتیں کرتیں، مگر گھر کے ہر اہم مسئلے پر چپ ہو جاتی تھیں۔ جیسے اس سے ان کو کوئی تعلق نہ ہو۔ انہوں نے واحد حسین کی تیز و تند خواہشوں کو بھی برداشت کیا اور ان کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے بڑھا پے کو بھی سہا۔ مگر انہوں نے واحد حسین کو کبھی اپنا کہہ کر مخاطب نہ کیا۔

تمہارے نانا۔۔۔ تمہارے ابا۔۔۔ تمہارے بھائی۔۔۔ تمہارے دادا۔۔۔ وہ واحد حسین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوگوں کو سونپتی رہیں۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

واحد حسین نے ٹھنڈی سانس لے کر پھر پائپ سلگایا۔

آج حضرت داغ کے یہاں وہ ماہانہ طرحی مشاعرہ تھا جس میں حیدر آباد کے تمام اہم، قابل احترام شاعر شرکت کرتے تھے۔ فانی بدایونی اور جلیل مانک پوری سے لے کر ڈیوڑھیوں کے وہ تمام شاعر جن کی کمر سے تلوار بندھی ہوتی، سر پر دستار ہوتی اور پتلی پتلی مینا جیسی ٹانگوں پر پاجامہ چڑھا ہوتا۔

اور آج بھی واحد حسین کی غزل پوری نہیں ہو رہی تھی۔

واحد حسین یوں تو رنگ داغ کی پیروی کرتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی کبھی کبھار سنجیدہ مسائل پر لکھنے لگے تھے۔ کیوں کہ جب اقبال کی بانگ در اچھپی تھی اور ٹیگور نے دھیمے دھیمے سروں میں انسان دوستی اور فلسفیانہ مسائل پر گیت گانا شروع کئے تھے، اکثر شاعر خود بخود امیر مینائی، وحشت، چکبست اور اقبال کی پیروی کرنے لگے تھے۔

شمالی ہند میں یہ وہ دور تھا جب حالی اپنا مسدس سنا چکے تھے اور اس مسدس سے متاثر ہو کر ہر مسلمان کی آنکھ نم تھی۔ جذبات بھڑک اٹھے تھے، اب ہر طرف اقبال کا پیغام گونج رہا تھا۔

قوالوں نے ”پیا تو مانت نا ہیں“۔۔۔ اور ”چھارہ پی کالی گھٹا جیا سور امور الہرائے ہے“ گانے کی بجائے ”منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی“ اپنا شروع کر دیا تھا۔ پریم چند کی ”سوز وطن“ جل چکی تھی اور اس سے بھڑکنے والے شعلوں کی آنچ ہر ہندوستانی کے دل میں سلگ رہی تھی۔

ان ہی دنوں کا قصہ ہے کہ ایک دن اخبار میں واحد حسین نے ”جلیان والا باغ“ میں قتل عام کی خبر پڑھی اور لرز کر رہ گئے۔ وطن کے لئے جان قربان کرنے کے قصے انہوں نے بہت سنے تھے۔ مگر کبھی اس جذبہ کا تجربہ نہیں کر سکے جو اٹھنی عمر کے لڑکوں کو ہر بات بھلا دے۔ کیا بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی کوئی محبوبہ نہیں تھی! اس نے کبھی بدلتے موسموں کے سحر کو محسوس نہیں کیا تھا! عورت کا حسن، نغمے کی کشش۔۔۔ شعر کی لذت۔۔۔ اپنے گھر میں رہنے کا سکون۔۔۔ زندگی میں کتنے رنگ تھے۔۔۔ کتنے بندھن تھے۔۔۔ واحد حسین پچپن سال سے زیادہ کے ہو گئے تھے۔ مگر مرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ انہیں تو موت کے نام سے خوف آتا تھا۔ وطن کے لئے بھی کیا زندگی سے ہاتھ دھوئے جاسکتے ہیں

وطن کو آزاد کرانے کے لئے سیکڑوں لوگ مر گئے۔۔۔ یہ ہندوستان کب آزاد تھا۔۔۔؟ پہلے کہیں سے آریہ دشت نوردی کرتے ہوئے گھس آئے۔۔۔ پھر مسلمانوں نے ہر چیز کو درہم برہم کر دیا۔ اب انگریز قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔۔۔ انگریز جانیں گے کانگریس کا راج ہو جائے گا۔ پھر کچھ مائی کے لال اٹھیں گے کمیونسٹ بن کر عوام کے حقوق۔۔۔ مساوات، جمہوریت۔۔۔ اس گورکھ دھندے سے نجات کا راستہ کہاں ہے۔؟ جہاں انسان بچ بچ آزاد ہو۔

واحد حسین کو یوں لگتا جیسے آزادی کا تصور کسی قوم سے وابستہ ہے نہ ملک سے بلکہ صرف ایک نسل سے دوسری نسل کا ذہنی فاصلہ ہے۔

دو عمروں کا ٹکراؤ، روز ذہنوں کا تضاد۔۔۔ جب ہی تو گاندھی جی کی بنائی ہوئی کانگریس کی پالیسی نہرو کے یہاں نیا رخ اختیار کرتی ہے اور بھگت سنگھ کی جوان موت کو للکارتی ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اس لئے واحد حسین اخبار میں صرف مقامی سیاست کے مدوجزر دیکھتے تھے۔ یوں بھی حیدر آباد کے اُردو اخبار حکومت برطانیہ کی صوبائی خود مختاری اور پارلیمانی جمہوریت کے اعلان جیسی خبروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ البتہ پنڈت نہرو جونئی نسل کے ہیرو تھے، جب فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کے بارے میں کچھ کہتے تو اس خبر کو کسی کونے میں جگہ مل جاتی تھی۔

اخباروں پر سخت پابندی تھی کہ باہر کی سیاسی خبروں کو اہمیت نہ دی جائے۔ کیوں کہ حیدر آباد میں اس وقت بڑا سکون تھا۔ یہاں بھی کانگریس کی کوئی سیاسی اہمیت تھی نہ کسی دوسری سیاسی تنظیم نے سراٹھایا تھا۔ عوام اعلیٰ حضرت کے وفادار تھے اور تا ابد اس ریاست کو قائم ہونے کی دعاؤں میں شریک رہتے تھے۔

حیدر آباد کی اس مشترکہ تہذیب کی بنیاد قلی قطب شاہ رکھ گیا تھا۔۔۔ اس نے بھاگ متی کو ملکہ بنا کر، ہندوستانی لباس پہن کر، ہندوستانی تیوہار منا کر اور تلگو میں شاعری کر کے ہندوستانی تہذیب کو ملانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی تھی، بلکہ وہ اس کلچر میں رنگ جانے پر مجبور تھا جو اس کے آس پاس تھا۔ یوں ہی جیسے اکبر غیر شعوری طور پر ہندوستانی تہذیب میں رنگتا چلا گیا۔۔۔ واجد علی شاہ نے بولی کھیلی اور کتھک تاج پر اپنے پیر بلائے۔۔۔

اور آج کنگ کوٹھی کی ایک کرم خوردہ کرسی پر میر عثمان علی خان بیٹھے تھے۔ میلا اٹنگا پاجامہ، پرانی بد رنگی شیروانی اور میل خوری ٹوپی اوڑھے وہ ایک بہت بڑی یونیورسٹی کے لئے کئی لاکھ روپے خرچ کرنے کی اسکیم بنا رہے تھے جہاں ان کی رعایا اپنی مادری زبان میں تمام علوم حاصل کر سکے گی۔ یہ وہی نظام تھے جنہوں نے اپنی تخت نشینی کے دن گر جانے والی چونی کو ڈھونڈنے میں ایک گھنٹہ صرف کیا تھا۔ انہوں نے جاگیر منصب اور خطاب دیتے وقت بھی ہندو اور مسلمان کی اصطلاح میں نہیں سوچا تھا۔ حیدر آباد کے برہمن شیروانی پرتہ کی ٹوپی پہنتے تھے اور اردو اخبار پڑھنے سے کبھی ان کا دھرم خطرے میں نہیں جا پڑتا تھا۔

بہت کی ہندو عورتیں ڈیوڑھیوں میں بیگمیں بنی بیٹھی تھیں مگر کسی ہندو کی غیرت کو ٹھیس نہیں لگتی تھی۔

چیچک کی وبا پھیلتی تھی تو مسلمان عورتیں دیوی پر چڑھاوے چڑھاتی تھیں اور درگاہوں کے عرس مینہندوؤں کی جانب سے نذروں کے خوان آتے۔ بی بی کے علم پر مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی جانب سے شربت کی سبیل لگتی چاندی کے چاند اور پنجے چڑھاتے تھے۔ رمضان میں ہندوؤں کے ہاں سے مسجدوں میں افطاری بھیجی جاتی تھی۔

ریاست کا ہر مسلمان تلگو جانتا تھا۔ تمام ہندو لڑکے اُردو میڈیم سے پڑھتے تھے، مگر انہیں کبھی مادری زبان کی جانب سے کوئی خطرہ نظر نہیں آتا تھا۔ کیوں کہ ابھی ان کے دلوں میں شک و نفرت کی ایسی آگ نہیں بھر کی تھی جو خلوص کے ہر پھول کو جلاڈالتی ہے۔

اسی لئے حیدر آباد کے لوگوں کی کابلی، لا پرواہی اور تن آسانی کئی صدیوں کے ذہن اور جسمانی سکون کا نتیجہ تھی کہ عام طور پر حیدر آباد کے ہر گھر میں نو بجے صبح ہوتی، گیارہ بجے ناشتہ ہوتا اور رات بارہ بجے سے پہلے کسی گھر میں نہ آتی۔

ایک بار شمال سے آنے والے ایک شاعر نے کسی موقع پر واحد حسین سے مذاق کیا۔

یار تم جاگیرداروں نے حیدر آباد میں صرف تین کام کئے ہیں۔ بریانی کھائی، ڈیوڑھی بنائی، اور نسل آدم کو فروغ دیتے رہے۔

یہ سن کر واحد حسین بھڑک اٹھے۔ کیوں کہ انہیں ایک خالص دکنی ہونے کی وجہ سے باہر سے آنے والے ان تک چڑھے شاعروں سے بڑی چڑھ تھی۔ جو بات بات پر دکنی تہذیب کا مذاق اڑاتے تھے۔ شمالی ہند کی اُردو کو معیاری سمجھتے، وہاں کے علم و ادب کو مستند مانتے۔ اسی لئے واحد حسین نے جل کر اس شاعر سے کہا۔

”نہیں۔ ہم لوگاں ایک کام اور کرتے ہیں۔ دروازے پر مانگنے والوں کو خیر خیرات دینا۔“

سنا ہے اس شاعر نے اس بات کو بڑے معنی پہنائے اور دور تک لے گیا۔ یہ کشن پرشاد کے عروج کا زمانہ تھا جو اپنے محل کے مشاعرے میں غزل سناتے تھے۔

میں ہوں بندو میں ہوں مسلمان

ہر مذہب ہے میرا ایمان

انہوں نے بڑی گنگا جمنی تہذیب اختیار کی تھی کہ وہ بندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ شمالی ہند کے ادب اور شاعری کو بھی آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور دکنی تہذیب پر بھی ناز کرتے۔ انہوں نے دکن کی تہذیب و تمدن کو عروج پر پہنچانے میں اہم حصہ لیا تھا۔ ان کی باریک کی آواز، چھوٹے سے قد اور نرم لب و لہجے میں ایسا سحر تھا کہ بڑے بڑے حاضر جواب سازشی ذہن کانپ جاتے تھے۔ مگر واحد حسین کو یہ پالیسی کبھی پسند نہ آتی۔

چنانچہ انہوں نے حضور کی پیشی میں رہنے والے جائے صاحب کے ساتھ مل کر ایک ایسا گروپ بنالیا تھا جو باہر سے آنے والے ہر عالم اور شاعر کو کشن پرشاد کی ہزار سفارشوں اور کوششوں کے باوجود حضور کے دل سے اتارنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ وہ کہیں پہنچ بھی جاتے تو ان کی کوئی سنوائی نہ ہوتی۔ دو چار برس تک ہاتھ پاؤں مارنے اور پھر ایک دن حضرت باغ کے مشاعرے میں رو رو کر غزل سناتے تھے۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

اس طرح کئی شاعروں پر سخت عتاب نازل ہوا۔ اور کچھ موقعہ کی نزاکت دیکھ کر یہ کہتے ہوئے بھاگ گئے کہ شاعروں کے لئے ہر جگہ زمین سخت اور آسمان دور ہوتا ہے۔

واحد حسین سپوٹے تلے کرسی پر بیٹھے جانے کیا کیا سوچے جارہے تھے۔

بس غزل تیار ہونے کی دیر تھی۔ فوراً ”بیت الغزل“ کے وسیع ہال کو جھاڑنا پونچھنا شروع کر دیا جاتا۔ کرسیاں ہٹا کر سفید چاندنی کا فرش ہوتا، بیچ میں جناب صدر کی کار چوبی مسند پچھتی۔ ایک بڑا سا شمعدان یا چھت پر لگے فانوس روشن ہو جاتے۔ اگر بتیاں سلگانی جاتیں، چاندی کی تھالیوں میں چاندی کی ورق لگی گولیاں، چاندی کے اگالداں، بہترین قسم کی چائے، مٹھائی، بسکٹ اور تمکین بادام۔

بیت الغزل “کی الماریوں میں رکھے ہوئے نایاب مخطوطوں قلمی نسخوں اور کتابوں میں چھپی ہوئی چھپکلیوں اور ” جھینگروں کو اس رات بڑی بے آرامی سے ادھر ادھر بھاگنا پڑتا۔ داد کی بے ہنگم آوازوں سے ان کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ بلکہ ایک چھپکلی کو تو ضد تھی کہ جب واجد حسین کے کسی پھڑکتے ہوئے شعر پر واہ واہ کا شور اٹھتا تو وہ چلا کر کہتی۔

چہ۔۔۔۔۔ چہ۔۔۔۔۔ چہ۔۔۔۔۔

اور صبح اٹھ کر وہ ڈانڈائے چھپکلیوں کو مارنے پہنچ جاتے تھے۔

ادھ سلگا پائپ سامنے رکھا تھا اور وہ آسمان کی طرف دیکھ کر گنگنا رہے تھے۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

ما تم ایک شہر آرزو۔۔۔۔۔ ہائے ہائے۔۔۔۔۔ یہ غالب بھی کیا کیا کہہ مرا۔

انہوں نے اپنی ادھ لکھی غزل اٹھا کر پٹک دی اور پائپ منہ سے نکال کر اپنے آس پاس کی دنیا کو بچانے لگے۔

دالان میں کھیلتے کھیلتے اچانک چاند کا جی اکتا گیا۔ اس لئے اس نے نارائنا اور سلیم کو بھگانا چاہا۔ وہ ہمیشہ کھیل کو بیچ راستے میں چھوڑ دیتی تھی۔ لیکن نارائنا کھیل ختم کرنے پر راضی نہ ہوا۔ کیوں کہ اب چاند کے چور بننے کی باری تھی۔

کہہ جو دیا اب ہم نہیں کھیلتے۔“ وہ اپنے کٹے ہوئے کھلے بالوں کو سمیٹ کر پھر ربن میں باندھنے لگی۔ اس کے بال بال بالکل سنہرے تھے اور اس وقت اس کے گلابی تمتماتے ہوئے گالوں پر یوں دمک رہے تھے کہ تیرہ چودہ سال کا نارائنا جانے کون سے جذبے سے مسحور ہو کر اس کے پاس آیا اور اس کے گال پر کاٹ لیا۔

اوئی اللہ.... بد معاش۔ بے شرم....“ وہ اتنے زور سے چلائی کہ ڈر کے مارے نارائنا کھڑکی کے پیچھے جا چھپا۔

کیا ہوا... کیا ہوا... سارا گھر دوڑ پڑا۔

نارائنا بڑا بد معاش پوٹا ہے.... چھچھورا....“ وہ ہنس ہنس کر ٹھنکنے لگی۔

”ہاتھ توڑ کے پھینک دوں گی اس دھیمڑ کی اولاد کے“

”آپ اب بڑے ہوئے چاند پاشا، سیانے لڑکوں میں نکو کھیلو۔“

لنگری پھوپو نے سمجھایا۔

یہ بن کر کھڑکی میں دبکے ہوئے نارائنا نے سر اٹھایا اور چاند کا منہ چڑا دیا۔

چاند پھر ہنس پڑی اور پھر بھاگی اسے مارنے۔

یہ بتاؤ نارائن نے کیا کیا تھا؟“ اولین ممانی نے پوچھا تو وہ شرمائی۔ دلہن ممانی سے اس کی خوب بنتی تھی۔

ان ہی کو رجھانے کے لئے وہ اتنی خوبصورت فراکیں پہن کر روز شام کو نا ناحضت کے ہاں آجاتی تھی۔ راشد ماموں اور دلہن ممانی اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

چھی....“ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپالیا۔ یہ ادا اس نے لیلا چٹنس سے سیکھی تھی۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر وہ بہت کچھ جان گئی تھی۔ دس بارہ سال کی عمر میں ہی اسے اپنے حسن کا پورا پورا احساس تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو غیر معمولی لڑکی سمجھتی تھی۔ وہ بہت بڑے دادا کی پوتی ہے۔ بہت قابل باپ کی بیٹی ہے اور غیر معمولی حسن و جمال کی مالک ہے۔ اس لئے اسے خاندان کی فرسودہ روایتوں سے ہٹ کر چلنا ہے۔ اسے للچائی ہوئی نظروں کو ٹھینگے بتانا ہیں۔ کتاب پڑھتے پڑھتے وہ اچانک ہوا میں اڑنے لگتی۔ ایک اشوک کمار کی صورت کا شہزادہ اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا۔

جب راشد ماموں گوری گوری دلہن ممانی بیاہ کر لائے اور وہ دونوں ساری دنیا سے بے خبر دن رات چونچلوں میں مصروف رہتے تھے تو چاند چھپ چھپ کر ان کی حرکتیں دیکھتی تھی۔ تب اچانک اسے بھی بیاہ کا شوق ہوا تھا۔ لیکن ایک ناخوشگوار واقعہ نے اسے بیاہ سے نفرت دلا دی۔ ہوا یہ کہ بتول خالا کا وہ رنگ رنگیلا چھیل چھیلایا، شہزادوں جیسا لباس پہنے والا دولہا اسے دل و جان سے پسند آ گیا تھا۔ جب کبھی وہ بتول خالا کے ساتھ آتا تھا تو وہ کسی نہ کسی بہانے اس کے آس پاس گھومے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ بتول خالا کے کمرے میں پہنچ جا تا تو لنگڑی پھوپو کسی نہ کسی بہانے اسے زبردستی وہاں سے بلا لیتی تھیں۔

مگر ایک دن لنگڑی پھوپو کے وہ رشتہ دار، دنیا بھر کے آوارہ پیوٹ شیخو میاں آنکلیے۔ حسب عادت بتول خالا ان سے خوب ہنسی مذاق کرتی رہیں۔ شیخو میاں ہر وقت سیندھی کے نشے میں دھت رہتے اور بڑی گپیں مارا کرتے تھے۔ اس لئے گھر کے بچے اور بڑے انہیں فوراً گھیر کر بیٹھ جاتے۔ کوئی ان کی شادی کرانے کا وعدہ کر کے پیسے اینٹھ لیتا۔ کوئی سیندھی کے دھوکے میں مٹی کا تیل پلا دیتا تھا۔ مگر اس دن شیخو میاں گئے تو بتول کے دولہا ہمایوں نے سارا گھر سر پر اٹھالیا کہ بقول

کیوں کہ کسی کی بات سنا اس کی فطرت میں شامل نہ تھا، بشیر بیگم کبھی اس کے لئے اپنی پسند سے کلی دارگرتاسی دیتی تھیں تو وہ کبھی نہ پہنتی۔ اسکے باوجود وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ دادا حضرت اپنے دوستوں کو اس سے انگریزی نظمیں اور فلمی گیت سنواتے تھے۔ پپا کے ساتھ وہ سوئمنگ پول اور رائڈ نگ کلب جاتی تھی۔ شام کو شامل دیوی کے ہاں کلاسیکل میوزک سیکھنے جاتی۔ اور کانونٹ میں کوئی فنکشن ہوتا تو آئینہ شکا ہوا رنگین لہنگا چولی پہن کر، ہاتھوں میں رنگین چوڑیاں پہنے وہ ننھی سی بنجارن کا سوانگ بھر کے اسٹیج پر ڈانس کرتی۔

گنگی گاؤں کو جاتی، گنگی شام کو آتی

تحصیلدار کا ڈیرا، بڑے گاؤں کا پھیرا

گنگی صاحب کا ڈر، گنگی چوروں کا ڈر

اس وقت بھی اکتا دینے والی بیکاری سے گھبرا کر وہ ورائڈے کی کرسیوں پر لوٹنے لگی۔

سپوٹے کے پیڑ تلے اکیلے بیٹھے ہوئے نا ناحت کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ نانا حُصت کی شاعری چاند کو بہت پسند تھی۔ جس وقت اپنی گر جدار آواز میں ہاتھ لہرا کر بھویں تان کر شعر سناتے تھے تو باغ میں بیٹھی ہوئی چڑیاں پھر سے اڑ جاتیں تھیں۔ چاند کو اس وقت گم سم بیٹھے ہوئے نانا حُصت کا چہرہ دیکھ کر اسکول کا ایک ڈرامہ یاد آ رہا تھا۔ جس میں ”کنگ لینر“ بالکل نانا کی صورت کا تھا۔ یوں ہی بھاری بھر کم، گورا چٹا، ذرا سی سفید اور کالی داڑھی اور پھر ایسا ہی اداس اداس، کھویا کھویا۔۔۔ معصومیت، جستجو اور تشنگی میں ڈوبا ہوا چہرہ۔۔۔ شاید سب ہی انسان بڑھاپے تک پہنچ کر جانے کیا کیا کھودیتے ہیں؟ جانے کس چیز کا انتظار کئے جاتے ہیں۔ جانے کس کس کو پکارتے ہیں؟

نا نا حصت چاند کو بہت چاہتے تھے۔ ناشتے پر انڈا کھاتے وقت اس کی سفیدی چاند کو دے دیتے تھے۔ اپنی سب میٹھی معجونوں اور ٹانکوں میں اسے ضرور شریک کرتے۔ باغ میں ٹہل رہے ہوں اور چاند بہت ضد کرے تو کبھی کبھار ایک آدھ نارنگی توڑ کر وہ اسے دے دیتے۔

(حالانکہ یوں وقت بے وقت پہل توڑنے کے وہ بہت مخالف تھے۔)

لیکن رنگ برنگ پھول کو چھونے کی اجازت کسی بھاؤ نہ ملتی۔۔۔ کیا غضب کے پھول کھلے تھے ”ایوان غزل“ میں!۔
یوں لگتا جیسے کسی نے ٹوکروں سے رنگ برنگ پھول لاکر ڈھیر کر دیے ہوں۔ نا ناخصت صبح شام ان پھولوں کے درمیان
ٹہلتے۔ ایک ایک شاخ کی نوک پلک درست کرتے اور بڑے اطمینان سے ان کے مرجھانے کا تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ اس کے
برخلاف چاند کی ددھیال میں درختوں کو چھوڑ، کوئی آدمیوں کا بھی پرسان حال نہ تھا۔ سارے گھر میں افرائفری مچی رہتی تھی۔
سارا کام نوکروں کے سپرد تھا۔ اس لئے کوئی بات ڈھنگ سے نہ ہوتی۔ چاند کی پھوپیاں اور چچی وغیرہ دن رات میک اپ میں
غرق، کلبوں اور پارٹیوں میں مصروف رہتیں۔ بچے آیاؤں کی گود میں چلایا کرتے۔ چاند اپنے دادا کے سر پر چڑھ کر نا چتی
تھی، وہاں شور مچانے، شرارتیں کرنے اور ناچنے گانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ کیوں کہ اس کے ڈیڈی خود بھی دن رات
دوستوں میں گھرے، شراب پیتے اور زور زور سے چیختے چلاتے رہتے تھے۔ یہ لوگ جانے کیوں دنیا بھر کی باتوں پر غور
کرتے اور چلاتے تھے۔ چاند کے باپ کے سارے ہی دوست ایسے تھے۔ جو دنیا کے غم میں، ہر خوشی میں خود حصہ لینے بیٹھ
جاتے تھے۔ چاند ذرا دیر کے لئے وہاں جاتی تو پالیٹیکس، گاندھی، سوشلزم اور فاشزم کے نام سنتے سنتے بور ہو جاتی۔ اور
جس دن سے نانا حضت نے کہا تھا کہ حیدر علی خاں کو پولیس پکڑ کر لے جائے گی تو وہ کئی بار ڈیڈی کو سمجھا چکی تھی
کہ دنیا میں کچھ ہو آپ کی بلا سے۔ آپ کیوں ان کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔

ڈیڈی کے برخلاف اس کی ماں تھی کہ دنیا کی ہر بات میں دلچسپی لیتی۔ بشیر بیگم کو زندگی سے بے حد پیار تھا۔ وہ ایک سے ایک قیمتی ساری پہنتیں۔ طرح طرح کے زیوروں کا کپڑوں سے میچ ملاتیں، مہندی بھی لگاتیں اور لب اسٹک بھی۔۔۔ دن رات سہیلیوں میں گھری بیٹھی ہیں اور ہنسی مذاق ہوتا رہا ہے۔ حیدر علی خاں چاہے کیسے ہی سنجیدہ مسائل میں الجھے رہیں، ان کے پاس آتے تو وہ نئی دلہنوں کے سے نخرے دکھاتیں۔ عطر میں ڈوبی پھولوں میں چھپی۔ ہر رات وہ مسہری پر تازہ پھول بکھیرتیں۔۔۔ ہر رات پھولوں کا گہنا ان کے لئے ضرور آتا۔

جب میرے بیٹا ہوگا اور اس کی بہو گھر آجائے گی تو میں اپنا سنگار کرنا چھوڑ دوں گی۔ وہ کسی کے ٹوکنے پر ” کہتیں۔

چاند کے بعد ان کے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ان کا زیادہ وقت اولاد کے لئے دوائیں کھانے اور تعویذ گنڈے کروانے میں گزرتا تھا۔ دوسرے تیسرے مہینے حیدر علی خاں کبھی ان کے تکیے کے نیچے سے کوئی تعویذ نکال کر چھینکتے اور کبھی وہ پانی اٹھ کر پھینک دیتے تھے جس میں عود اور لوبان کی خوشبو لگی ہوتی تھی۔

آج واحد حسین کے ایک پرانے دوست آگئے تھے، دولہا نواب۔ اور آتے ہی حسب عادت خرگوش کی طرح باغ کی روش سے ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ اٹھا کر اکڑوں بیٹھ گئے تھے۔ حالانکہ واحد حسین خود حوض کے کنارے پر چڑھے بیٹھے تھے۔ وہ اکثر باغ میں آنے والے دوستوں کے ساتھ یوں ہی کہیں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ دولہا نواب کی پرانی ہمرؤ کی شیروانی میں یاقوت کے بٹن لگے تھے۔ زربفت کی سلی چیکٹ دستار تھی۔۔۔ مغلنی پاجامہ اور سفید گل مجھے۔ جو بات کرتے وقت تھرتھر کانپتے تھے۔ دولہا نواب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سوتے وقت بھی دستار نہیں اتارتے تھے۔ لنگڑی پھوپھو کہتی تھیں کہ دولہا نواب کا تعلق پانیگاہ والوں سے تھا اور ان کی پولیس تک علاحدہ تھی۔ مگر دولہا نواب کے والد نے ساری دولت رنڈی بازی اور کیمیاء بنانے میں ختم کر ڈالی۔ شرابی نکھٹو لڑکوں، بیوہ بیٹی اور ان کے بے شمار بچوں کے ساتھ ڈھنڈار حویلی میں پڑے رہتے تھے۔ جو کچھ منصب ملتا اس پر گزر بسر ہوتی۔ مگر اس کے باوجود ان کی وہی آن بان تھی، وہی جاہ و جلال۔ لوگ کہتے تھے دولہا نواب کی حویلی میں خدمت گار اور لونڈیاں باندیاں نہیں رہیں مگر وہ بات بات پر گلشن اور گل بدن کو پکارتے اور پھر خود ہی اٹھ کر اپنا حکم بجاتے تھے۔

وہ ستر پچھتر کے ہو رہے تھے۔ مگر شاعری میں انہوں نے واحد حسین کو اپنا استاد بنایا تھا۔ خالص دکنی زبان میں شعر کہتے تھے اور اپنے شعر پر سب سے زیادہ داد بھی خود ہی دیتے۔ واحد حسین کہتے کہ وہ جابل مطلق ہیں۔ اور شعروں کا وزن چھوڑ قافیے تک صحیح نہیں ملا سکتے۔ مگر ان سے دو فائدے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہر روز اپنی تازہ غزل سنانے کے لئے وہ سب سے موزوں آدمی تھے۔ دوسرے منصوبے بنانے اور نئی نئی چیزوں کی تجارت کے خواب دیکھنے میں وہ واحد حسین سے بہت آگے تھے۔

جب سے جاگیروں اور منصبوں میں گھن لگنا شروع ہوا تھا۔ دولہا نواب نے تجارت کی ٹھانی تھی۔ خاص طور سے ملکی مصنوعات سے دنیا کو روشناس کروانے کی کوشش میں وہ اب تک پچاس ہزار روپیہ گنواچکے تھے۔ آج کل وہ واحد حسین کے ساتھ مل کر کچی بریانی اور بگھارے بیگن، ولایت کو سپلائی کرنے کی اسکیم پر غور کر رہے تھے۔ ایسی اچھوتی اسکیموں پر ان کا بیٹا راشد کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس بات کا واحد حسین کو بڑا دکھ ہوتا۔

اجی قبیلہ، ابن تو اب بڑھے ہو گئے ہیں۔ لیکن ہمارے تجربے کار ذہن سے فائدہ اٹھا کر نو جوان کچھ کرنا ہی نہیں ” چاہتے ہیں نا۔

”کیا بتانا حضت، ہمارے صاحبزادے بھی ایسے ہی پاچی نکل گئے۔“

دولہا نواب تائید کرنے لگے۔ ”میں بولتاؤں کہ ہم سو ب کریں گے۔ آپ کے راشد نواب کا قحط اتاکام ہے کہ اپنے علم سے کوئی ایسی ترکیب نکالنا کہ بریانی ولایت کو جانے تک گرم رہے۔“

وہ کونسی مشکل بات ہے، ”واحد حسین نے قریب سے لیمو کا ایک پتا توڑ کر اسے مسلا اور سونگھتے ہوئے ہوئے۔“

اجی فرعون کے زمانے کی لاشیں اب تک جاں کوو اں رکھی ہوئی ہیں تو کیا پندرہ بیس دن بریانی گرم نہیں رہ ”
”!سکتی

مگر ہمارے صاحبزادے تو انجینئری پڑھ کر دین دنیا سے گئے۔

”حالاں کہ تجارت اللہ میاں نے مسلمانوں کے لئے حلال بتائی ہے۔ گھر بیٹھے ہزاروں کی آمدنی ہونے لگے گی۔“

بگھارے بیگن کی ایک ترکیب میرے پاس ایسی ہے کہ آپ کے ولایت والے ہونٹا چاٹنا۔“ دولہا نواب وہ ترکیب جیب ”
سے نکالنے لگے۔

فرض کیجئے ایک سیر بریانی پر ڈیڑھ روپیہ خرچ ہوتا ہے اور ہماری کمپنی اس پر ایک روپیہ منافع لیتی ہے۔ اب ”
”اگر روزانہ ایک ہزار ڈبے بکنے لگے۔ تو منافع کتنا ہوا۔۔۔

واحد حسین حوض کی منڈیر سے اتر کر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اور سرخ مورم پر انگلی سے حساب کتاب لکھنے لگے۔

آمدنی کے نام پر دولہا نواب نے ادھر ادھر کسی کو نہ پا کر اطمینان کر لیا۔

اب جو چاند نے کھڑکی کھول دیکھنا واحد نواب۔۔۔ ہماری اس اسکیم کو بھی کوئی نہ کوئی چالو آدمی لے اڑے گا۔“
کر باغ کی طرف دیکھا ہے تو نا نا حضرت لیمو تھے حوض کی منڈیر پر بیٹھے نظر آئے۔ مگر جانے کیوں اس وقت چاند کو
دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، اینٹ پر بیٹھے دولہا نواب بڑے مسخرے سے نظر آ رہے تھے۔ نانا حضرت غزل سنانے کی دھن
میں یہ بھی بھول گئے تھے کہ دولہا نواب کے لئے ایک کرسی ہی منگوائیں۔۔۔ مجبوراً چاند خود ہی ایک کرسی دولہا نواب کے
لئے لے گئی۔

”شاباش۔ جیتے رہو بیٹا۔۔۔ یہ بشیر بیگم کی صاحبزادی ہیں۔“

دولہا نواب جلدی سے اچک کر کرسی پر بھی یوں ہی اکڑوں بیٹھ گئے جیسے اب بھی اینٹ پر ہی نکلے ہوں۔

”ماشا اللہ بالکل اپنی والدہ کی طرح خوبصورت ہیں۔“

سلام کیا دادا حضرت کو۔؟“ واحد حسین نے چاند کو گھورا۔

وہ کھسیا گئی۔ لو بھلا اب وہ ان دولہا نواب جیسے خرگوشوں کو بھی سلام کرتی پھرے گی۔

ہاں ہاں کیا تھا۔۔۔“ بات ٹالنے کے لئے دولہا نواب صاف جھوٹ بول گئے۔“

نہیں کیا۔۔۔“ اس نے جھٹ صفائی پیش کی۔“

ہیں ہیں ہیں۔۔۔“ دولہا نواب کھسیا کر ہنسنے لگے۔“

خیر تو میں کہ رہا تھا۔۔۔“ واحد حسین نے پائپ منہ سے نکال کر دوبارہ بات کا سلسلہ جوڑا۔“

کہ خوبصورت عورتاں تو اللہ میاں ہمارے بہلانے کو بنائے ہیں۔ مگر حضرت اللہ میاں نے عورت کو زبان اور ذہن ”
”دے کر اس کا آدھا حسن کھو دیا ہے۔

بات جانے کس طرح بریانی سے ہوتی ہوئی عورت کے حسن کی طرف آنکلی تھی۔

جی ہا۔ عورت تو اللہ میاں نے آدم کا جی بہلانے کے لئے ہی پیدا کی تھی نا۔ اسی واسطے تو غزل کے معنی ” بھی عورتوں سے باتاں کرنا ہے۔ “دولہا نواب اپنی بات پر خود ہی زانو پیٹ پیٹ کر ہنسنے لگے۔

تو۔۔۔ تو نانا حضرت عورتیں گونگی ہوتیں۔۔۔“ چاند نے گھبرا کے نانا سے پوچھا۔ ”

ہاہاہا۔۔۔ ہو ہو۔۔۔“ دولہا نواب پھر چاند کی بات پر ہنس پڑے۔“

!دیکھا حضت ، آپ کی نواسی انگریزی پڑھ رہی ہے بول کے۔ کیا پوچھ رہی ہے۔۔۔“

اس واسطے بولتے کہ بہو بیٹیوں کے سامنے شاعری نئیں کرنا۔ آخر حویلیوں میں مردانے اور زنان خانے اسی لئے ”بنوائے گئے ہیں نا۔

ہو ہو ہو۔۔۔ واحد حسین بھی اس کی بات پر نہایت مصنوعی پن سے ہنسنے انہیں دل کھول کر ہنسنے کبھی نہیں آیا تھا۔ ” کیوں کہ عمر بھر تحصیلداری کرتے رہے جس میں ہنسنے کی بالکل ضرورت نہیں پڑتی۔ یا سگار پی پی کر شاعری کرتے رہے ایسے وقت کسی بچے کی شرارت پر چونکے تو ہنسنے کی بجائے رقیب روسیہ نظر آیا۔

اگر چہ شہر کے تمام ادبی حلقے جانتے تھے کہ نواب واحد حسین المتخلص بہ واحد ایک نامی گرامی یگانہ روز گار شاعر حیدرآباد میں موجود ہے مگر کسی نے انہیں کبھی مشاعرہ کی صدارت تک نہ سونپی۔

البتہ ضلع میں جب کوئی نیم سرکاری تقریب ہوتی تو مشاعرہ بھی ضرور ہوتا اور اس مشاعرے کی صدارت واحد حسین خود سنبھال لیتے تھے۔ ایسے موقع پر وہ عموماً چار پانچ غزلیں سامعین کے کانوں میں انٹیل کر ہی دم لیتے تھے۔ کس میں دم ہوتا کہ سننے سے انکار کرے۔

”کیا سلا رُود والے آیا۔۔۔؟“

واحد حسین بار بار چونک کر پوچھتے۔

اس وقت ناحق بھیجا اسے بازار۔ اعلیٰ حضرت کی سواری مادر دکن کو سلام کرنے جاتی ہے۔ اس وقت سڑکیں سب ”بند ہو جاتی ہیں۔“

رضیہ نے سلاز کو حمایت میں کہنا شروع کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آج اس کے خسر کا پارہ بہت چڑھا ہوا تھا۔ اور کسی نہ کسی نوکر کی شامت پکار رہی تھی آج۔

”سب غلط۔۔۔ آج جمعہ ہے۔ آج اعلیٰ حضرت باغ عام گئے ہو نگے۔ اس وقت نماز پڑھے۔“

”تو پھر بیگم صاحب دواؤں کی دوکان میں گھس گئی ہوں گی۔“

رضیہ نے سلاز کو کے لئے دوسرا بچاؤ کیا۔

بیگم صاحب، دن بھر وہ بازاروں، سڑکوں پر، پردہ لگی کار میں گھومتی پھرتیں، جہاں چاہتیں کار کو روک لیتیں۔ جس خوانچہ والے کو چاہتیں لوٹ لیتیں، جس دوکان میں گھس جاتیں تو من مانی چیزیں لے جاتیں۔ یہ سب قانون شکنی وہ اعلیٰ حضرت کو جلانے کے لئے کرتی تھیں۔ کیونکہ کنگ کوٹھی میں ان کے بجائے کوئی اور حسینہ منظور نظر بنی ہوئی تھی۔۔۔

”آپ کا بس چلے دولہن بیگم تو پورے شاہی خاندان کو سلاز کو کے سامنے لا کھڑا کر دیں۔“

واحد حسین کی بات پر سب ہنس پڑے۔ اخبار پڑھتا ہوا راشد، پان کھاتی ہوئی بیوی، بچی کو دودھ پلاتی ہوئی رضیہ اور چھالیہ کانتی ہوئی لنگڑی پھوپھو۔

چلو یہ اچھا ہوا کہ اجالا بیگم کو اولاً مل ہی گئی۔“ موضوع بدلنے کے لئے لنگڑی پھوپھو نے نوحے کا پہلا بول اچھالا۔“

واحد حسین نے پائپ نیچے کھ دیا اور بڑے صبر کے ساتھ گو ہر بیگم کو دیکھنے لگے۔

اجالا بیگم کچھ کرے مگر قانون تو اسے احمد میاں کا بیٹا نہیں مانے گا۔ کیوں راشد میاں۔؟“ انہوں نے بڑی امید بھری ”نظروں سے راشد کی طرف دیکھا۔ کوئی ان سے پوچھتا کہ زندگی بھر کیا کیا۔؟ تو وہ راشد کو پیش کر دیتے۔ دوسرے جاگیرداروں کو دیکھنے سے سات سات بیٹے ہیں اور نکٹھو بنے جوتیاں چٹختے پھرتے ہیں۔ عدالتوں میں گھسیٹے جاتے ہیں۔ اسی دیمک لگی جائداد کی آس میں جی رہے ہیں۔ اور ایک راشد تھا کہ اس کی قابلیت کو مان کر خود حکومت نے انجینئر ی پڑھنے ولایت بھیجا۔۔۔ اونچا پورا۔۔۔ شاندار سوٹ پہنے، اپنی چھوٹی سی کار میں گھومتا ہے۔ دنیا اس کی قابلیت کو مانتی ہے۔ اس نے حیدرآباد میں ایسی ایسی خوبصورت عمارتیں بنوائیں کہ شہر جگمگا اٹھا اور پھر مزاج ایسا سادہ کہ جاگیرداری کا غرور چھو کر نہیں گیا۔ مصلحت پسند ایسا کہ ہمیشہ دور کی بات سوچتا تھا۔ باپ کا ہر وقت خیال، ماں کی دلداری اس پر فرض۔ رشتہ داروں، عزیزوں میں وہ مقبول۔ بیوی پر فدا۔

اس کی ان ہی خوبیوں کی بنا پر واحد حسین نے اس کے لئے جاگیرداروں کی بجائے رضیہ ڈھونڈی۔ رضیہ کے دادا نے چھوٹے سے پیمانے پر ایک سگریٹ فیکٹری قائم کی تھی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں روپیوں کا سامان پیدا کرنے لگی۔ اب اس کا باپ ایک دن میں اتنا کما تا تھا۔ جتنا ایک پائیگاہ والا جاگیردار ایک مہینے میں بھی نہیں پاسکتا۔ رضیہ راشد کے گھر آئی تو ساتھ میں ایک کارلائی، ایک بنگلہ، سوتو لے سونا، ایک لاکھ نقد۔ اب واحد حسین ایسی بہو کوسر آنکھوں پر نہ بٹھاتے تو کیا کرتے۔؟

احمد حسین کے وارث کی پیدائش پر بھی راشد بار بار یہی کہتا۔۔۔۔۔ ”اس بات پر شور مت مچائے اس وقت بابا۔ خدا چچا ابا“ کو سلامت رکھے ان کے بعد نبٹ لیں گے اجالا چچی سے۔

”سنا ہے اجالا بھابی بچے کو مولوی بنا ئیں گی۔ انہوں نے رحمت علی شاہ کے مزار پر یہی منت مانی تھی۔“

تو پھر ابھی سے بچے کو داڑھی لگا دیں۔“ رضیہ ہنسنے لگی۔ رضیہ لکھ پتی باپ کی بیٹی تھی اس کے باوجود اجالا ”بیگم کی جائیداد ہاتھ سے نکل جانے کا غم آج کل اسے پاگل بنائے ہوئے تھا۔

پہلے تو شریف خاندانوں میں ہر مرد داڑھی رکھتا تھا۔ ہمارے خاندان میں بھی سب نے داڑھی رکھی۔ بس ایک احمد ”میاں نے یہ روایت توڑی کہ داڑھی رکھی نہ شاعری کی۔“ گو ہر پھوپھو نے کہا۔

اور ہمارے خاندان میں تو۔۔۔۔۔ ”واحد حسین دوا کا انتظار بھول کر اٹھ بیٹھے۔“

ہمارے خاندان میں ہر مرد نے شاعری کی اور داڑھی رکھی۔ ہمارے دادا حضرت مرحوم ، اللہ انہیں کروٹ کروٹ ”جنت نصیب کرے، بڑے وضع دار انسان تھے۔۔۔ کیا آن بان تھی۔۔۔ مجھے کل کی سی بات یاد ہے۔

انہوں نے خلا میں دور کہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

دادا حضرت ہمیشہ مشجر کی شیروانی اور زریں دستار پہنتے تھے۔ صبح بیت الخلاء کو جاتے تو پہلے حقہ وہاں جاتا۔ ایک تپائی پر بیاض اور قلم دوات رکھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی سب مشہور غزلیں اسی طرح لکھی تھیں۔ صرف ہمارے تا یا حضرت گو ہر بیگم کے والد صاحب کو شاعری سے بڑی چڑ تھی۔ کہتے تھے اس خاندان کو شاعری کی ہائے کہا گئی۔ نحوست کی پوٹ ہے۔ ادبار کی نشانی ، ساری عمر ، دولت ، شراب ، طوائف اور مشاعروں میں بہہ جاتی ہے۔

ٹھیک تو کہتے تھے ”بی بی نے پھر پاندان کھول کر کہا۔“

سچی سب ہی کچھ اجڑ گیا اس خاندان کا“ گوہر بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ راشد اور رضیہ بڑے غور سے ان باتوں ”کو سن رہے تھے۔

بڑے سمجھ دار تھے تا یا حضرت۔ دادا جان خاندان میں کسی پر اعتبار کرتے تو صرف ان ہی پر“ گوہر بیگم اپنے ابا ”کا ذکر سن کر آنسو پو چھنے لگیں۔

واحد حسین کے چہرے پر اس وقت یادوں کے بہت سے چراغ لو دے رہے تھے۔

”اور پھر جب زوال ہوا ہے تو اس رات دا یا حضرت نے شراب کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا تھا۔“

زوال۔۔۔ کیسا زوال ہوا۔۔۔۔۔ راشد نے اخبار کھ کر بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

”در اصل انگریز ریڈیٹنٹ سے کسی بات پر دادا حضرت کی چل گئی تھی اور پھر یہ بات بگڑتی ہی گئی۔“

ریڈیٹنٹ نے الزام لگایا کہ حضور کی حرم سرا میں عورتوں پر بڑا ظلم و ستم ہوتا ہے۔ تحقیقات کے لئے ایک کمیشن آیا۔

تو کیا ظلم و ستم ہوتا تھا۔۔۔۔۔؟“ راشد نے پوچھا۔

کچھ نہیں ”واحد حسین نے بڑے اطمینان سے پائپ سلگا لیا۔“

”اس وقت قاعدہ تھا کہ سب ہی نواب دل بہلانے کے لئے خوبصورت لڑکیوں کو کل میں شامل کر لیتے تھے۔“

یہ لڑکیاں غریب ماں باپ کے یہاں فاقے کرتیں یا کسی نکمے جاہل آدمی سے بیابی جاتیں تھیں۔ لیکن محلوں میں انہیں شاندار گھر ملتے۔ ان کے نام پر جاگیریں اور منصب ہوجاتے۔ ان کی اولاد کا مستقبل درخشاں ہو جاتا تھا۔

ان لڑکیوں کے ماں باپ الگ بخشش سے اپنی قسمت سنوار لیتے تھے۔ مگر پھر بھی دنیا بھر میں روتے پھرتے کہ ان کی لڑکیوں کو زبر دستی نواب لوگ اٹھا لیتے ہیں۔

تو پھر دادا حضرت نے کیا کیا؟“ راشد نے پوچھا۔

راشد کو آج ایک ضروری میٹنگ میں جانا تھا۔ رات کو کلب میں ڈانس تھا مگر اس وقت بابا سے پرانے قصے سننا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

ہاں تو اس رات دا داحضت کے سامنے کاغذ پھیلے ہوئے تھے اور ایسے وقت کسی کو ان کے پاس جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ دادی اماں تو پہلے ہی اپنے بچوں سمیت حویلی کے دوسرے حصہ میں جا بیٹھتیں۔ کیوں کہ اس زمانے میں ایک طوائف پاروتی ان کی منظور نظر بنی ہوئی تھی۔

”میں وہ منظر ابھی تک نہیں بھول سکا۔“

واحد حسین کہے جارہے تھے۔ اور ان کے آس پاس بیٹھے ہوئے بی بی، گوہر بیگم، راشد اور رضیہ یوں ساکت بیٹھے تھے جیسے دو واحد حسین کے ساتھ کسی عجائب خانے میں گھوم رہے ہوں۔

پاروتی کے ساتھ ہم سب شکرموں میں لدے باغوں کو جارہے ہیں۔ ایک شکر میں تو شہ خانہ، کسی میں نوکر، کسی میں سامان۔ ساتھ میں چیراسی اردلی۔۔۔

کچی سڑکوں پر املی اور ببیل کے گھنے سائے ملتے ہیں۔ آس پاس چاولوں کے کھیتوں کا مخمل پھیلا پڑا ہے۔ اس کے پرے گھنا جنگل۔۔۔ سرخ سرخ پہاڑیوں کے اوپر نیلا آسمان اور آسمان پر تیرتے ہوئے بادل تک مجھے یاد ہیں۔۔۔ فضا میں دھان کے پودوں کی مہک پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی لڑکا گائے بھینسوں کو ہانکتا ہوا نکل جاتا ہے۔ کہیں کھیتوں پر سے چڑیوں کا ایک غول اڑ کر آسمان پر بکھر جاتا ہے۔ کہیں ایک دھمیڑنی سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے جارہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے لگے بچے املی کے جھاڑوں پر چڑھے پہلی پہلی کونپلیں توڑ رہے ہیں۔ کہیں دور ایک کھیت کے کنارے بچے بیٹھے ہگ رہے ہیں۔

تو بہ یہ منظر نگاری۔۔۔ شاعری۔۔۔ رضیہ اکتا گئی۔

اور گاڑیوں میں سے جھانکتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر وہ ہمارا منہ چڑا دیتے ہیں۔ میں کھسیا کر اپنا منہ اندر کر لیتا ”ہوں۔۔۔“

پھر اچانک شام آگئی۔ اور ہم سب ضد کر رہے ہیں کہ ڈاک بنگلے میں رہنے کی بجائے جنگل میں خیمے لگوا لیں گے۔ رات کو خوب مزا آئے گا۔۔۔ مگر کسی تفریح۔۔۔

ہم بچے جانے کس چیخ و پکار سے جاگے تو آدھی رات کو عورتیں سجدوں میں پڑی تھیں۔ چنانچہ ہم سب بچے اپنی اپنی ماؤں کی ساریوں میں چھپے سسکنے لگے۔ کیوں کہ چند کسانوں نے گزرتے وقت کہ دیا تھا کہ عورتوں کے خیمے یہاں کیوں لگوائے ہیں۔ ندی کے کنارے بنجاروں کا پڑاؤ ہے جو ڈاکے ڈالتے ہیں۔ یہ سن کر عورتوں کی حفاظت کے لئے ساتھ چلنے والے سالار قافلہ غوثو میاں لمبے لمبے لیٹ گئے۔

”آپ خواتین کی ضد تھی۔ ڈاک بنگلہ چھوڑ کر جنگل میں کیوں ٹھہرے تھے۔“

الہی میری کنواری بیابیوں کی عزت تیرے ہاتھ ہے۔ یا اللہ رات خیریت سے گزار دے تو بی بی کے علم پر سونے کا ”چاند چڑھاؤں گی۔“

دادی سجدے میں گری منتیں مانگ رہی تھیں۔

پھر کچھ سوچ کر پاروتی اٹھی۔۔۔ وہ دادا حضت کی نکاحی بیوی نہ تھی۔ مگر سہرے جلوے کی بیابی بیوی سے زیادہ چابی جاتی تھی۔ اس کے باجوہ درنڈی سے رشتہ لگانے کو خاندان کا کوئی فرد تیار نہ تھا۔ اس لئے احتراماً اسے ”بائی ماں“ کہتے تھے۔

واحد حسین پائپ سلگانے کور کے تو پاروتی کے تصور میں کھو گئے۔

کیا عورت تھی راشد میاں، آدھی رات کو جنگل کے اندھیرے میں اس کا چہرہ چراغ کی طرح دمکتا تھا۔ جس طرف ”دیکھتی سب اسی کے ہو جاتے۔ مجھے تو گھنٹوں گود میں لئے بیٹھی رہتی تھی۔ جب تک وہ سامنے نہ بیٹھتی دادا حضرت شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔ یہی سمجھو کہ دادا حضت جیسے اپنی انسان کو اس نے تگنی کا ناچ نچا ڈالا تھا۔ تو بھئی اس نے غوثو میاں کے کپڑے خود پہنے، شیریوانی پر دستار لگا، کاجل کی موچھیں بنا، چوب دار سے بندوق چھین کر خیمے کے باہر جا کھڑی ہوئی۔ جس وقت مشعل ہاتھ میں لے کر ٹہلنا شروع کیا ہے تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی مغل شہزادہ اپنے حرم کی حفاظت کے لئے ٹہل رہا ہو۔ سب کے دھڑکتے ہوئے دل پر سکون ہو گئے۔ بچے اطمینان سے سو گئے اور غوثو میاں انکھیں کھول کر اٹھ بیٹھے۔

دادی امارنڈیوں سے بات نہیں کرتی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے کئی مرتبہ او پری دل سے کہا۔

”اری پاروتی خاک ڈال مال و دولت پر۔۔۔ کوئی تجھی کو لے جائے گا۔ اندر چلی آ“

ہو بیگم صاحب، خاک ڈالتی ہوں مال و دولت پر۔“ اس نے جھک کر دادی کو جواب دیا۔“ میں تو یہاں کنواری بیابی ”سیدانیوں کی حفاظت کے لئے کھڑی ہوں۔“

”اور پھر ہنس کر بولی۔۔۔“ کہیں کوئی رنڈیوں کو بھی لے کر بھاگتا ہے بیگم صاب؟

”ایسی ہوتی تھیں اگلے زمانے کی وضع دار رنڈیاں۔“

اور واحد حسین نے چاروں طرف حسین بھری نظروں سے دیکھا۔

کیا مجال جو ان کے سامنے کوئی لڑکی ننگے سر آ جائے، کوئی زور سے ہنسنے لگے۔ دسہرے کے دن پاروتی کی ماں بہن اس سے ملنے آتی تھیں تو کبھی انہیں اندر نہ بلواتی۔ ہمیشہ ان کے لئے ڈیوڑھی کے پھاٹک پر کرسیاں ڈلوادی جاتیں۔ وہیں دروازے میں کھڑے کھڑے پاروتی ان سے بات کرتی تھی۔

کیوں ان کے لئے کرسی کیوں رکھی جاتی تھی۔۔۔؟“ رضیہ نے بڑے تجس بھرے لہجے میں پوچھا۔“

اس لئے کہ اس زمانے میں صرف مرد اور رنڈیاں کرسیوں پر بیٹھا کرتے تھے۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن بڑی آپا ”کھیل کھیل میں کرسی پر جا بیٹھیں تو پاروتی نے خود گود میں اٹھا کر کہا تھا۔

”آپ کرسی پر نہیں بیٹھنا میرے پاشا جانی۔ کرسی پر مردالوگ بیٹھتے ہیں یا ہم رنڈیاں بیٹھتی ہیں۔“

بھی کوئی بھاگ متی کی پوتی نواسی ہوگی۔“ راشد نے سوچا۔“

”تو جس دن آپ کے دادا کا انتقال ہوا اس دن کیا ہوا تھا۔۔۔؟“

رضیہ نے پوچھا۔

ابن کیا کہا۔۔۔؟ واحد حسین نے یوں چونک کر راشد کو دیکھا جیسے بالکل کسی اجنبی جگہ نکل آئے ہوں۔ پھر سنبھل ”کر ہو بیٹھے۔ عینک اتار کر آنکھیں ملیں۔ چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ دوبارہ عینک لگائی اور نومبر کی خشک رات کیج کیجی ان کے بدن میں دوڑ گئی۔

تو جس دن دادا حضرت کا انتقال ہوا ہے۔ اس دن صبح پاروتی کیا دیکھتی ہے کہ ان کے چاروں طرف ڈھیروں کاغذ ”بکھرے پڑے ہیں۔ بادام کے حریرے میں سے بھاپ نکلتا بند ہوگئی ہے۔ بیت الخلاء میں بیاض اور قلم تپائی پر رکھا جا چکا ہے۔“ وضو کا پانی رکھے رکھے سرد ہو رہا ہے۔ مگر وہ اس طرح سر جھکانے چومکھے شمع دان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ پاروتی آہستہ سے کہا۔

”فجر کی اذان ہوگئی سرکا را ٹھپے گا نہیں۔۔۔؟“

یہ سن کر انہوں نے آنکھیں اٹھا کر پاروتی کو دیکھا۔ پاروتی قسمیں کھا کر کہتی تھی کہ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور پورے کمرے میں ایک عجیب سی انوکھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ پھر وہ آہستہ سے بولے ”سحراب نہیں ہوگی۔ دیکھ تو کیسی بھیا نمک رات ہے۔“

پاروتی کمبخت ہنس پڑی اور اسے دادا حضرت کا کوئی عاشقانہ فقرہ سمجھ کر ان کے قریب چلی گئی۔

”تو کیا شع اب بجھا دوں۔۔۔؟“

یہ سن کر دادا حضرت تڑپ اٹھے۔

”اب اس میں کیا دھرا ہے یہ تو راکھ ہے راکھ۔“

پارو کہتی تھی کہ اب جو میں نے دیکھا تو۔۔۔۔؟

ہونہ۔۔۔۔؟ سب آنکھیں پھاڑے سانسیں رو کے واحد حسین کو گھور رہے تھے۔

تو کیا ہوا۔۔۔؟“ راشد نے اسی کویت کے عالم میں پوچھا۔

کچھ نہیں۔۔۔۔“ واحد حسین نے آہ بھر کر چہت کی طرف دیکھا۔

وہاں کی سچ مچ ہر چیز راکھ بن چکی تھی۔ بس تھوڑی دیر بعد ہی پولیس کی دوڑ آئی۔ ”ایوان غزل“ پچاس لاکھ کا ”مقروض تھا۔ اور ستر عورتیں یہاں چھپائی گئی تھیں۔

کیسے نصیبہ در تھے۔۔۔۔“ لنگڑی پھوپھو نے عقیدت اور دکھ کے ملے جلے انداز میں کہا۔

دادی اماں کہتی تھیں کہ میں سمجھی کہ وہ سب کاغذ وصیت نامے ہوں گے۔ مگر وہ سب غزلیں تھیں۔۔۔۔۔ یعنی ایک رات میں پندرہ غزلیں۔۔۔۔؟“ واحد حسین نے سب کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور خود ہی جھومنے لگے۔۔۔۔“ اور پھر ایک ”ایک شعر ایسا کہ ساری عمر کی ریاضت کے بعد بھی دوسرے شاعر نہ کہہ سکے۔

حکیم شفاعت علی نے تو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ ایسی غزلیں کہنے کے بعد ان میں کیا رہا تھا جو جیتے۔۔۔۔؟

ہونہ۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟“ چاند ابھی تک منہ کھولے بیٹھی تھی جیسے بس اب اس دلچسپ کہانی کا انجام سننا ہی باقی رہ گیا ہے۔

واحد حسین نے پاس بیٹھی ہوئی چاند کو غور سے دیکھا۔ پائپ اٹھا کر سلگایا اور پیر ہلا ہلا کر لینے لگے۔

بس اسی دن سے اس گھر میں نیستی شروع ہو گئی۔ میت کے اٹھتے ہی پاروتی اس گھر کا تنکا تنکا اٹھوا کر لے گئی۔ ” ابا حصت نے ڈیوڑھی سے جن عورتوں کو نکالا انہوں نے الگ واویلا مچا کر بہت کچھ ہتھی لیا۔۔۔ وہ تو کہو ”ایوان غزل“ وقف ہے اس لئے دادی اماں ہم سب کو اس میں لئے بیٹھی رہیں۔ لیکن ابا جان نے ہوش سنبھالتے ہی ساری جائیداد کا نئے سرے سے انتظام کیا۔

جب ہی تو ہمارے ابا کو شاعری و اعری سے اتنی نفرت تھی۔“ گو ہر پہو ہو ہاتھ میں تھوڑی تھامے کسی گہری سوچ ” میں غرق تھیں۔

ایسی ویسی نفرت۔۔۔؟“ واحد حسین نے ٹھنڈے سگار کو جھنجھلا کے پٹک دیا۔ ”کسی شاعر کا دیوان گھر میں دیکھ ” لیتے تو اٹھا کر پھینک دیتے۔ خدا بخشے چنو نواب کو جوانی میں شاعری کا بڑا شوق تھا۔ گھر میں تو بیاض رکھنے کی ہمت نہیں تھی کہ کہیں چچا حضت کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ اس لئے شعر لکھ کر ادھر ادھر چھپا دیا کرتے تھے۔ ایک بار اتفاق سے چچا حضت نے ایک شعر کہیں لکھا دیکھ لیا جس میں انھوں نے معشوق کی آنکھوں کو شراب کے کٹوروں سے تشبیہ دی تھی۔۔۔ بس جناب چچا حضت تسبیح پٹک کر کھڑے ہو گئے۔

اول تو سرے سے یہ بات ہی غلط ہے کہ اس ٹانگ برابر چھوکرے کا کوئی معشوق بھی ہے اور پھر حضت کسی ” انسان کی آنکھیں کٹورے کے برابر ہو سکتی ہیں۔۔۔؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ افترا ہے۔ خدا کا قہر نازل ہو گا اس گھر پر جہاں اتنا ”جھوٹ بولا جائے۔“

بس اس دن کے بعد سے چنو نواب کے اشعار کی کوئی پڑیا کسی کو ملی تو جلدی سے امام بی کے چہرہ میں اڑس ” دی جاتی تھی۔ اور اس طرح کئی بار امام بی چولہا سلگانے کے لئے یا کوئی آیا بچے کا دودھ گرم کرنے کے لئے ان کے یہی ”اشعار کام میں لے آتی۔ یا پھر کوئی باذوق چو با اپنی محبوبہ کو منانے کے لئے ان کی غزلیں لے جاتا تھا۔

واحد حسین کے آخری جملے پر سب ہنس پڑے۔

آئے ہے بے بسی عشق پہ رونا غالب۔۔۔

وانلن بجا بجا کر چاند گار ہی تھی۔

چاند اب سولہ برس کی ہو چکی تھی اور اس عرصے میں اس پر کئی ناگہانی حادثے گزر چکے تھے۔۔۔ زندگی سے بے حد پیار کرنے والی بشیر بیگم کو ایک دن بنستے بنستے ایسا پہنہ لگا کہ وہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے مرچکی تھیں۔۔۔ چاند اپنے ڈیڈی کے سینے سے لگ کر روتی رہی۔ لیکن ایک دن معلوم ہوا کہ اس کے ڈیڈی بھی ایک تعلیم یافتہ کمیونسٹ ورکر خاتون کو بیوی بنا کر لا رہے ہیں۔ بس اس دن سے وہ ”ایوان غزل“ چلی آئی تو پھر اپنے گھر نہیں گئی۔ اس کے اخراجات کے لیے حیدر علی خان مورد پے مہینہ ہر بار آ کر دے جاتے تھے۔

وانلن کے تیز سر اور غالب کا غلیظ شعر۔ دونوں چاند کے کمرے سے نکل کر آنگن میں پھیل رہے تھے۔ یہ تو خیر صبح کا وقت تھا، یعنی اسے ریاض کرنا ضروری تھا۔ مگر ویسے بھی آج اسے سچ مچ عشق کی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ اور وہ ہندوستانی فلموں کی ہیروئن کے انداز میں ہمیشہ گا گا کر روتی تھی۔۔۔ موقع کے لحاظ سے اسی طرح کا میک اپ کرتی اور یوں ہی اپنے رومان کا سوگ منایا کرتی تھی۔

اس طرح چاند کے لیے ایک سوگوار صبح کا آنا، اکثر واحد حسین کے سکون کے جانے کی تمہید ہوا کرتا تھا۔ لیکن وہ چاند کو دکھتے ہوئے دانت کی طرح برداشت کرتے تھے۔ حالانکہ انہیں خودسر، فیشن پرست اور آزاد خیال چاند کی روش بالکل پسند نہ تھی۔۔۔

اس وقت حیدر آباد کے اونچے طبقے میں دو طرح کی خواتین پائی جاتی تھیں۔۔۔ ایک واحد حسین کا گھرانہ، جہاں ابھی تک عورتیں کار کو پردا لگا کر بیٹھتی تھیں۔۔۔ اور بی بی کی طرح انہیں اپنے شوہر کے عہدے کا انگریزی تلفظ کبھی صحیح طور پر یاد نہیں ہوتا تھا۔ یہ عورتیں شرافت اور پاکیزگی کے ہر شاستری اصول پر پوری اترتی تھیں۔ وہ يشودھا کی طرح اپنے سدھارت کو نجات کے راستے پر گامزن کر سکتی تھیں۔ کسی نئی سوکن کے آنے پر اپنے گھر کا بن باس قبول کر لیتی تھیں۔ اور سیتا کی طرح زمین انہیں چھپانے کے لیے ہمیشہ اپنی آغوش کھول دیتی تھی۔ دولت اور شان و شوکت کا مفہوم ان کے لیے یہ تھا کہ زیادہ نوکر۔۔۔ زیادہ چھوکریاں۔۔۔ شان اور وقار قائم رکھنے کے لیے زیادہ قربانیاں، میاں کی نازک مزاجیاں اور انہیں سنبھالنے کی ذمہ داری۔۔۔ ان کے صلے میں وہ کالی پوت کا لچھا آتا جو سہاگ کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔۔۔ اور کنجیوں کا وہ گچھا جس میں ان کے سکھ کی چابی کوئی نہیں ہوتی تھی۔۔۔ لیکن ان چابیوں سے وہ خاندان، دولت نسل اور وقار کے تمام بند دروازوں کو کھول دیتی تھیں۔

دوسری عورت وہ تھی جو حیدر علی خاں کے یہاں پیدا ہو رہی تھی۔۔۔ وہ پنچ گنی اور دہلی اور دہرہ دون جا کر بڑھتی تھیں۔ انگریز آفیسروں کے کلب میں ناچتی تھیں۔ بغیر آستینوں کا بلاؤز اور کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ نئے نئے میک اپ کے انداز۔۔۔ وہ پیا اور ماما تک کو ڈیر اور ڈارلنگ کہتی تھیں۔ وہاں شادی اور بیاہ اپنی پسند سے ہوتے تھے اور طلاقیں دوسروں کی زیردستی سے دی جاتیں تھیں۔ ان گھروں کی ہنیت بدلنے پر کچھ تو ان نو جوانوں کا ہاتھ تھا، جو یورپ سے فرنگیں اور ایرانی دلہنیں بیاہ کر لاتے تھے اور کچھ اس مغربی تعلیم کا اثر تھا جس نے شمالی ہند کے اونچے طبقے کو مغربی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرح منہ بنا بنا کر بات کرنا، انگریزی کپڑے پہنا اور انگریزی طور طریقوں پر جینا مہذب ہونے کی نشانی سمجھتے تھے۔ ان گھروں کا ربن سہن بھی بدل گیا تھا۔ سرخ مدرے دستر خوانوں پر بریانی کی قابیں اور بگھارے بیگن کے ڈونگے اٹھا کر وہاں بوائے اور بٹلر نے صاف شفاف میزوں کے اوپر اجلے اجلے گلاسوں میں نیپکین سجادیئے تھے اور نازک نازک قہقہوں کے شور میں لپ اسٹک لگے ہونٹ، بڑی ادا کے ساتھ سوپ سب کرنے لگے تھے۔

اسکرٹس اور سلیکس پہن کر رائڈنگ کی جاتی۔ کلب میں پارٹیاں ہوتیں اور پھر اسکیٹلز۔۔۔ کورٹ شپ اور ہنی مون کے لئے کبھی ویانہ۔۔۔ کبھی کشمیر۔۔۔ کبھی پیرس۔۔۔ جہاں سے علاحدہ علاحدہ جہازوں میں دونوں طلاق کے کاغذ سنبھالے اترتے۔ پھر نئے سرے سے زندگی کا تعاقب شروع ہو جاتا۔

یہ سب وہی بولتے تھے جو سات سمندر پار بولا جاتا تھا۔ اسی طرح سانس لیتے۔۔۔ مگر ان کے آس پاس کا ماحول بڑا دقیانوسی تھا۔۔۔

”کیا بتانا حضرت، وہ نواب واحد حسین کی نواسی ایک ہندو چھوکرے سے عشق بازی کر رہی تھیں۔“

”جی ہاں، میں بھی سنا ہوں۔ چھوکرے کے کالج کو ہونٹاں کو سرخی لگا کر جاتی تھیں۔“

کیا بولنا تقصیر۔ اب شرافت تو ختم ہو گئی سمجھو۔“

واحد حسین کو ایسی باتیں سن کر سچ مچ موت سامنے نظر آتی تھی۔

لیکن چاند جوان ہوئی تو یہ دور گزر چکا تھا۔ شمالی ہند میں جو قوم پرستی کی شدید لہر اٹھتی تھی اس کی زد میں آکر لوگوں نے کھادی پہن لی اور خطاب واپس کر دیے تھے۔ اپنی اپنی دفن شدہ روایتوں کو کھود کھود کر نکالنے لگے۔ یہ ہنگامہ چاند کے وطن سے دور تھا۔ پھر بھی دکن میں جو ہوائیں شمالی ہند سے آئیں وہ ملک کی وفاداری کا ایک نیا نعرہ بھی ساتھ لائیں۔ یہ نعرہ اپنے کلچر اور اپنے آرٹ کے تحفظ کا تھا۔ عام لوگوں کو اللہ اکبر اور رام نام کے نعروں میں سر پھٹول کے لئے چھوڑ کر اعلیٰ طبقے نے اس نعرے کو بڑی خوبصورتی سے اپنایا تھا۔ یعنی انتہائی یورپیٹ کے ساتھ بے حد ہندوستانی بننے کی کوشش۔ اب مذہب کے افادی پہلوؤں پر زور دیا جانے لگا۔ اس لئے بولی کے دن ایک دوسرے کے رومال پر بڑی نفاست کے ساتھ رنگ کے چھینٹے ڈالے جانے لگے۔ دیوالی کی رات بنگلوں پر روشنی ہونے لگی۔ عید کے دن بڑے اہتمام کے ساتھ ہندو دوستوں کو شیر خورمہ کھلایا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر کلب میں ایک فنکشن ضرور ہوتا۔۔۔

عید ملاہ تقریب۔“ اس میں لڑکیاں بھارت ناٹم اور کتھا کلی رقص کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ وہ چچا اور ماموں جو ڈیوڑھیوں کے ”اندھیرے کمروں میں ٹوٹے تنبوروں کے ساتھ اپنی سنگیت میں کھوئے ہوئے پڑے تھے، اب بڑے اہتمام سے جھاڑ پونچھ کر باہر نکالے گئے۔ اجنٹا اسٹائل کے جوڑے بنجارا ورک کے بلاؤز۔۔۔ اور ہینڈ لوم ساریاں۔۔۔ یہ سب اپنے ملک سے محبت کے شدید مظاہرے تھے۔

شمالی ہند میں اگر غالب اور میر پر ریسرچ ہو رہی تھی تو دکن کے محققوں نے بھی گولکنڈہ کے کھنڈر کھنگال ڈالے تھے۔ قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، ولی اور سراج کی کرم خوردہ شاعری کو دھو دھلا کر ادبی میوزم سجا رہے تھے۔

اسی دوران جب ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس حیدر آباد میں ہوئی تو حیدر علی خاں چاند کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ صرف یہ دکھانے کہ ان کی بیٹی کیسی ترقی یافتہ لڑکی ہے۔ اس وقت تک حیدر آباد میں مسلمان عورتیں ہر سر عام جلسوں میں نہیں آتی تھیں۔ اور وہ بھی چاند جیسی لڑکی۔ بس سارے ترقی پسندوں کے نعرے تو ایک طرف رکھے تھے اور شاید ہی کوئی شاعر ایسا بچا تھا جس نے چاند پر نظم نہ لکھ ڈالی ہو۔ اس کا نفرنس میں آنے والے ہر مہمان کو حیدر آباد دل و جان سے پسند آ گیا تھا۔

واحد حسین کے ہاں چاندان قدروں کی واحد نمائندہ تھی۔ کہتے ہیں کرشن کا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ مگر چاند نے اپنے ہاتھوں سے زہر کھایا تھا۔ اور اس زہر نے اس کے رنگ کو نہ جلایا، بلکہ اس کی رگ رگ میں بجلیاں بھر دی تھیں۔

وہ ابھی فراک پہنے کا نوینٹ جا رہی تھی کہ نارائن نے اس کے ساتھ پتنگوں کے ایسے بیج بڑھائے کہ کسی طرح نہ سلجھے۔ نارائنا اور واحد حسین کے گھر والوں نے لمبے لمبے بانسوں میں کانٹے الجھا کر اس ڈور کو سلجھانا چاہا۔ مگر چاند کسی طرح یہ کھیل ختم کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کی نازک مزاجی اور ضد اور بڑھ گئی تھی۔ اب وہ راشد اور رضیہ کی آنکھوں کا تارا تھی اس لئے واحد حسین اس پر کسی قسم کی سختی نہیں کر سکتے تھے۔ حیدر علی خاں نے اگرچہ دوسری شادی کر لی تھی اور وہ اپنے آپ کو حق اور صداقت کے پہرے داروں میں شامل کرتے تھے مگر نارائنا اور چاند کے میل پر وہ بھی بھر چکے تھے۔ تب چاند نے محسوس کیا کہ ہر وقت نرمی سے بات کرنے والے ڈیڈی بھی گرج سکتے ہیں۔ اور ہر بات پر پشت پناہی کرنے والے راشد ماموں بھی اس سے روٹھ سکتے ہیں۔

پھر جس دن واحد حسین نے نارائنا کے باپ کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اس کی شادی کر دے تو نارائنا نے چاند کے ساتھ مل کر طے کیا کہ آج رات وہ دونوں زہر کھا کر مرجائیں گے۔

چودہ برس کی ہائی اسکول میں پڑھنے والی چاند اس دن خوشی کے مارے ناچ رہی تھی۔ آج سے اس کا نام بھی محبت کرنے والے شہیدوں میں لکھا جائے گا۔

اس نے نارائنا کی محبت کا پہلا گھونٹ پیا تھا اور شیکسپیر نیٹسے، میر اور میرا ہائی ا بھی اس تک نہیں پہنچے تھے۔ مگر زیب النساء، شیریں، لیلیٰ اور انار کلی کے قصے وہ کتابوں میں پڑھ چکی تھی۔ اور قلی قطب شاہ کا یہ شعر اس نے اکثر پارٹیوں میں گایا تھا۔

پیا باج پیالہ پیا جائے تا

پیا باج ایک پل جیا جائے تا

زہر کھاتے وقت ”ایوان غزل“ کے ان مکینوں نے اسے بہت روکا جن کے دھندلے دھندلے فوٹو بوسیدہ فریموں میں لگے ہوئے تھے۔

زہر گھولنے میں چاندی کے گلاس نے اسے سمجھایا کہ وہ مناسب جنگ کی نواسی ہے۔ صائب جنگ کی پوتی ہے۔ زہر اس کے لئے نہیں بنا۔ اس زہر کی تیزی تو ٹوٹے پھوٹے گھروں میں جاتی ہے، کیوں کہ زہر پینا ان کا مقدر بن گیا ہے۔ لیکن چاند کے خون میں ”ایوان غزل“ کی سات پشت والی شاعری اتنی سرایت کر چکی تھی کہ فریاد کو تیشے بغیر مارنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے ”ایوان غزل“ کی روایت کو توڑ کر زہر پی لیا۔ نا سمجھ بچی۔۔۔! جو نہیں جانتی تھی عشق کیا ہوتا ہے اور اس کے اصول کیا ہیں۔۔۔! اور یہ کہ زہر تو زندگی بھر چکھنا پڑتا ہے۔

لیکن ”ایوان غزل“ والے تو ایسے نادان نہ تھے۔ اگر وہ یوں چپکے سے مرجاتی تو اس کے ہم عصر نو جوان شاعر کیسے شاعری کرتے! اس لئے کئی ڈاکٹروں کی مدد نے اسے پھر زندگی کے ساحل پر لاکھڑا کیا۔ کئی دن بعد اسے جب ہوش آیا تو نارائنا کے ہاں مسلمان میر انہیں گاربی تھیں۔

میرا بریالا بنا آبیٹھا مند کے بیچ

بنے میں کیا تیری بلانیں لیوں کیا تیرے سہرے کی

سہرا تجھے ساج رہا اور ہم رہے ارماں بیچ

دو چار ہفتے بعد وہ بستر سے اٹھی تو نارائنا کی محبت کو زہر کی تیزی نے جلا پھینکا تھا۔ اور مرد سے نفرت کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیل چکا تھا۔ اب اس نے اپنے نانا حضت کی تمام روایتوں کا کہنا مانا اور دل لگا کر وائلن بجانے میں محو ہو گئی۔

میڈیکل کالج پہنچی تو اس کی آواز کی دھوم مچ گئی۔ وہ ہر طرف پکاری جانے لگی۔ ہر ڈرامے کی ہیروئن وہ ہوتی اور سارے کلچرل پروگرام اسی کو سونپ دیے جاتے تھے۔

لڑکوں کے غول اس کے پیچھے پیچھے گھومتے۔ اس کی ایک نگاہ، ہلکی سی مسکراہٹ کسی پر دن رات کا چین حرام کر سکتی تھی۔ وہ بڑی ادا کے ساتھ اپنے سنہرے پرم کئے ہوئے بالوں کو جھٹکتی، ساری کا لمبا پلو لہراتی، ٹھکھیلیاں کرتی پھرتی تھی۔ وہ ان سب مردوں سے نارائنا کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس لئے سب کو تڑپاتی، ہاتھ پکڑ کر دھکا دے دیتی۔ شاہد کو بھی لفٹ دیتی اور کمار سوامی کو بھی۔ شاعر سحر کو اور وائلنسٹ جوزف کو۔ مگر ڈاکٹر رحمن کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ رحمن میڈیکل کالج کا لکچر رتھا اور شہر کا مشہور ”گیاکالوجسٹ“۔ اس نے چاند کے مرض کو بھی جھٹ ٹٹول لیا اور علاج شروع کر دیا۔ رحمن کی بیوی بھی ڈاکٹر تھی اور کسی اور جگہ سروس کرتی تھی۔ مگر اس نے غالباً مردوں کی نفسیات پر بالکل

ریسرچ نہیں کی تھی۔ اس لئے اپنے رنگین مزاج شوقین شوہر کو نرسوں اور اسٹوڈنٹس کے درمیان چھوڑ کر مزے میں رہتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد کالج میں یہ خبر پھیل گئی کہ چاند ڈاکٹر رحمن سے شادی کر رہی ہے۔ وہ دونوں ہر جگہ دیکھے جاتے۔ ہاسپٹل کے پرائیوٹ روم میں پیچیدہ امراض پر لکچر دینے کے لئے گھنٹوں ڈاکٹر رحمن چاند کے ساتھ بیٹھا رہتا چاند اس کی کار میں پکنک کو جاتی، پکچر دیکھتی اور نئے نئے تحفوں کے ساتھ گھر آتی تھی۔ حیدر علی خاں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جس وقت ڈاکٹر رحمن کا پیغام آئیگا تو اسے مزہ چکھائیں گے اس رومان کا۔ لیکن ہوا یہ کہ حیدر علی خاں کے والد اچانک بیٹھے بیٹھے مر گئے۔ اور ان کے مرتے ہی یہ بھانڈا ابھی پھوٹ گیا کہ چاند کے دادا کڑک مرغی کی طرح اپنے نیچے سونیکے اینٹیں نہیں بلکہ قرض کے پتھر دبائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ ایک دن اچانک چاند کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رحمن نے اپنا ٹرانسفر اپنی بیوی کے پاس کروالیا ہے۔ اور وہ چاند سے ملے بغیر ہی چلا گیا۔ اس ساری لیڈ دھوں دھوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدر علی خاں اس سے سخت ناراض ہو گئے اور اب وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو خود آکر بیٹی کو دلار نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کے ہاتھ اس کے لئے سورو پے بھیج دیا کرتے۔

تو آج وہی اداس صبح تھی جب اٹھتے ہی چاند نے وائلن پر گنگنا شروع کر دیا تھا۔

اُتے ہے بے بسی عشق پہ رونا غالب

کس کے گھر جانے گا سیلابِ بلا میرے بعد

واحد حسین چاند کے اس غلط سلط شعر کو برداشت کر لیتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ چاند اس کی مری لڑکی کی اکلوتی نشانی تھی۔ بلکہ محض اس لئے کہ وہ راشد اور رضیہ کی بڑی چہیتی بھانجی تھی۔

اور جسے راشد پسند کرتا اس کے خلاف گو ہر پھو ہو اور واحد حسین کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن ہر وقت چاند کی نالائقیات برداشت کرتے کرتے واحد حسین کا مزاج بحر سے خارج ہوتا جا رہا تھا۔ زمانے کی ساری ترقی اور تبدیلیاں ابھی تک اس گھر کے اوپر ہی سے گزر رہی تھیں۔

واحد حسین نے اپنی دونوں لڑکیوں کو صرف ہائی اسکول تک پڑھایا تھا۔ دس گیارہ سال تک وہ لڑکیاں اپنی مخصوص تہذیب کے مطابق کلی دار کرتا اور تنگ پاجامے پر سنہری کار چوبی واسکٹ اور کار چوبی کام والی ٹوپی اوڑھا کرتی تھیں۔ یہ حیدر آباد کے اونچے طبقے میں عام طور پر لڑکیوں کا لباس تھا۔ ذرا سی اور بڑی ہونیں تو بی بی نے سخت پردے میں بیٹھا دیا۔ اور اس کلی دار کرتے پر کھڑا دوپٹہ بھی اوڑھنے لگیں۔ اب ٹوپی اتار دی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی واحد حسین ان کے بڑھتے ہوئے قد دیکھ کر گھبرانے لگے تھے۔ اس لئے جو پیغام آیا تو آنکھیں بند کر کے چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ اب یہ حقیقت واحد حسین کے لئے بڑی کڑوی تھی کہ ان کی نواسی لڑکوں کے ساتھ ڈاکٹری پڑھ رہی تھی۔ بے پردہ گھومتی، اسٹیج پر میک اپ کے ڈراموں میں کام کرتی تھی اور گانے گاتی تھی گھبرا کر انہوں نے اس معاملے میں بی بی اور گو ہر بیگم سے سہارا لینا چاہا۔ مگر بی بی تو خاندان کے براہم معاملے میں چپ رہنے پر کار بند تھیں اور گو ہر بیگم بھی اپنی بارہ گز کی زبان کو منہ کی ڈبہ میں بند رکھنے پر مجبور تھیں۔ انہوں نے چاند کے میک اپ پارٹیوں، ننگے پہناوے ہر چیز پر ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ چاند کے سب سے بڑے حمایتی راشد اور رضیہ گھر میں موجود تھے۔ بعض وقت گو ہر پھوپ کہتیں۔ وہ بھی اس گھر کی کنواری تھیں جنہوں نے اپنی جوانی کو زندہ دفن کر دیا۔ مگر گھر میں کسی کو خبر نہ ہوئی۔ کسی نے نہ سوچا کہ اس گھر میں ایک کنواری بیٹھے بیٹھے خاک ہوئی جا رہی ہے۔ جب بھی کوئی پیغام آتا دونوں بھائی سر جوڑے کھسر پھسر کرنے لگتے تھے۔ اور پھر گوہر بیگم کے سامنے آہستہ آہستہ سناتے۔

”ایسے نکمے کو دینے سے اچھا ہے کہ گو ہر بیگم کنواری بیٹھی رہیں۔“

”کسی ایسے ویسے خاندان میں بیاہ دیں گے تو خدا بخشے چچا حضرت کو قبر میں سکون نہیں ملے گا۔“

کبھی کبھی واحد حسین بڑے موڈ میں ہوتے تو کہتے۔

”بس اب اور انتظار نہ کروں گا۔ اس سال گوہر بیگم کا فرض ادا کرتا ہے۔“

تئیس برس کی گوہر بیگم یہ سنتینتو چپکے چپکے دعائیں مانگتیں۔ یا اللہ میرے نصیب کھول دے۔ میری قسمت کا جوڑ بھیج دے۔

مگر شاید اللہ میاں کے ہاں ان کی قسمت کا جوڑ نہیں بنا تھا۔

اس لئے سال پر سال نکلتے گئے۔ اب وہ چالیس سال کی ہو چکی تھیں۔ چالیس سال کی لنگڑی عورت سے بیاہ کون کرتا !

گوہر پھوپھو کی محبت اور خدمت گزاری سے شرمندہ ہو کر کبھی کبھی واحد حسین کہتے۔

”گوہر بیگم تم اپنے روپے پیسے کا ہم سے حساب لے لیا کرو بھائی۔“

میں کیا کروں گی بھائی پاشا؟ آپ رکھیے اپنے پاس۔“ وہ لا پرواہی سے کہتیں۔“

”لیکن کبھی کبھار اپنے زیور کپڑے تو پہنا کر بھئی۔ رضیہ کے پاس کب تک دھرے رہیں گے۔“

کیوں پہنوں زیور کپڑا۔۔۔ وہ جھنجھلا کر پوچھتیں تو واحد حسین لا جواب ہو جاتے تھے۔ جب تک سولہ سترہ برس کی رہیں تو گوہر پھوپھو پر کوکسی نے اچھے کپڑے اور زیور نہیں پہنے دیا۔ کیوں کہ اس زمانے میں لڑکیوں کو سادگی ہی سے رکھا جاتا تھا۔ ماں باپ مر گئے تو انہوں نے خود لٹا کپڑا سنبھال کر رکھ دیا کہ شادی کے بعد نکالیں گی۔ اور ٹانگ ٹوٹ جانے کے بعد وہ اس شرم سے نہیں پہنتی تھیں کہ اب لوگ مذاق اڑائیں گے۔ بس وہ سفید چکنا کھڑا دو پٹے، سفید کارگے کا کرتہ اور سفید ہی ہرک کا پاجاما پہنتی تھیں۔ ان کے ہاتھ ہمیشہ ننگے رہتے۔ گلا ہمیشہ خالی رہا۔ یہ سونا پن اس کے خوبصورت چہرے پر بھی پھیلتا ہی گیا۔ وہ جانے کب بچپن سے جوانی میں داخل ہوئیں اور کب بڑھاپے کی سرحد پار کر گئیں۔ گھر میں بہت کم لوگوں نے محسوس کیا کہ گوہر بیگم کے بال سفید ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ ان کے چہرے پر جھریاں پڑ رہی تھیں۔ وہ کام کرتے کرتے بانپ جاتی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی کسی مرد کی طرف ہنس کے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی سیر سپاٹوں کو گئیں نہ اور کوئی شوق جان کو لگایا۔۔۔ جیسے وہ صرف اسی مرد کے انتظار میں ہوں جو زبر دستی انہیں اٹھا کر میانے میں بٹھائے گا۔

گھر کے اس روایتی ماحول میں چاند کی بے راہ روی بڑی چونکا دینے والی تھی۔ لیکن واحد حسین کی چیخ و پکار پر راشد سمجھا دیتا تھا۔

جب چاند ڈاکٹر بن جائے گی تو معلوم ہوگا کہ خاندان کا نام کتنا روشن ہوا ہے۔ کوئی بے کسی جاگیر دار خاندان میں ”لیڈی ڈاکٹر۔۔۔؟“

”اور یہ ناچ گانا ذرا خاندان میں نکلے تو پتہ چلے کہ کیسی تھو تھو مچی ہے۔“

گوہر پھوپھو نے تنک کر کہا۔

ایک بات ہو تو کی جائے۔“ واحد حسین فوراً گوہر بیگم کی طرفداری کرنے لگے۔“

”ہر ایک یہی کہتا ہے کہ صاحب آپ نے اپنی نواسی کو اتنی آزادی کیوں دے دی ہے۔؟“

کون کہتا ہے۔۔۔؟“ راشد بھڑک اٹھا۔“

میرے سامنے کہے میں سب کا حال جانتا ہوں۔ دیکھ تو لیا بشیر آپا اور بتول کا حال۔ اگر پڑھی لکھی ہوئیں تو یوں جل ”جل کر نہ مرتیں۔“

را شد ترقی پسند نہ تھا مگر مصلحت پسند ضرور تھا۔ اس نے انجینئری کے علاوہ بزنس بھی شروع کر رکھا تھا۔ مٹی، چونے اور پھر کا بیو پار۔ وہ بزنس کے اصول پڑھ رہا تھا۔ اور جانتا تھا کہ چاند جیسی تہذیب یافتہ، خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکیوں کا بھاؤ کتنا بڑھا ہوا ہے۔ اتنا کہ لوگ چاہیں تو ان کے سہارے لاکھوں کا کنٹراکٹ لے لیں۔

یہ سب ہماری قسمت کا پھیر ہے۔ ہم نے اپنی بیٹیوں کو سب کچھ دیکھ کر دیا مگر ان کی قسمت سے بھرے گھر اجڑ ” گئے۔

واحد حسین کی آواز دکھ سے رندھ جاتی تھی۔

چولہے کے پاس جہاں بسم اللہ نے دبی کی بانڈی ٹانگنے کے لئے چھینکا لٹکا دیا تھا وہاں دو کوئے بیٹھے ایک سرور اور ایک تال میں کانٹیں کانٹیں کر رہے تھے۔ سڑک پر لال مٹی اور اچار بیچنے والوں کی آواز آرہی تھی۔ اور رضیہ کی ساڑی کا پلو پکڑے شاہین اس کے پیچھے پیچھے ضد کرتا پھر رہا تھا۔ کہ وہ بغیر استری والا یونیفارم پہن کر اسکول نہیں جائیگا۔ شاہین کے پیچھے پیچھے اس کی موٹی کالی آیا مسز انتھونی اس کا یونیفارم ہاتھ میں لئے گھوم رہی تھی۔

چولہے کے پاس بسم اللہ بی دھاڑ رہی تھی۔

کیا آج سلا ر قیہ نہیں لائے گا۔۔۔؟ اب کس کا قیہ کوٹ کر میں پکا دوں؟“ رضائی کے اندر منہ لیٹنے کے باوجود ” غزل نے اندازہ لگا لیا کہ دن نکل آیا ہے۔ ”ایوان غزل“ میں صبح اس دھوم دھام سے ہوا کرتی ہے۔ پھر رضائی ہٹا کر آنکھ کی ذراسی دراز کھول کر اس نے دیکھا کہ نانا حضرت آنگن میں سپوٹے کے جھاڑ تلے اسٹور کھے گاجر کا مربہ بنا رہے تھے۔ بلکہ بنوار ہے تھے۔ ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں چمچہ۔ اور منہ پر سب ہی نا معقول چیزوں کو گالیاں۔ ظاہر ہے کہ جس دن واحد حسین کو اچار مربے بنانے کا موڈ سوار ہوتا تھا تو سارا گھر تہ و بالا ہو جاتا۔ حد یہ تھی کہ ہر وقت مسہری پر لیٹی رہنے والی بی بی بھی انتظامات میں لگی ہوئی تھیں۔ رضیہ بچوں کو اسکول کے لئے تیار کروانے کی بجائے آنگن میں دوڑی دوڑی پھر رہی تھی۔ گوہر پھوپور اسٹور کی چابی ہاتھ میں تھامے کھڑی تھیں کہ جس چیز کی ضرورت ہو فوراً بھیج دی جائے۔ اور واحد حسین کی چیخ و پکار میں چاند کی باریک مرکبوں بھری آواز دبی جا رہی تھی بسم اللہ بی کے آنے حواس خطا ہوئے جارہے تھے کیوں کہ واحد حسین کو اس کا کفگیر بلانے کا انداز قطعی پسند نہیں تھا۔ ایسے میں تن تنہا ہٹ کے مارے انہوں نے گرم کفگیر پکڑنا چاہا تو ہاتھ جل گیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہاتھ کیا جلا، انگلیوں سے لے کر تلوے تک کسی نے گرم سلاخ چھوادی۔ وہ ابھی طے نہیں کر پائے تھے کہ التزام بسم اللہ بی کے سر تھو یں یا فضول قسم کے بھگونے کو کوسیں، کہ چاند کی آواز تیر کی طرح کانوں سے ٹکرانی

”یہ۔۔۔ یہ کون غالب کی اصلاح کر رہا ہے۔ جہالت کی حد ہے یعنی غالب کا شعر یک غلط پڑھا جا رہا ہے۔“

واہ وا غلط کیوں ہوتا۔۔۔“ چاند نے اچانک گا نا روک کر جواب دیا اور دوبارہ سر ڈھونڈنے لگی۔

”اچھا اور پھر ضد بھی کرتی ہے۔ اری جاہل وہ ہے کسی عشق ہے بے بسئ عشق نہیں ہے۔“

”او نہ ہوا کرے، چاند نے سوچا ہے بسی اور بے کسی میں ایسا کون سا بڑا فرق ہے۔ جب کہ رونا بہر حال ہے۔

اسی پر تو میری جان جلتی ہے۔“ واحد حسن نے جلدی جلدی تسبیح کے دانے گھماتے میں کہا۔

یہ کمبخت عورتوں کی قوم ہی جاہل ہوتی ہے۔ یعنی ڈاکٹری پڑھا رہی ہیں محترمہ، اور قابلیت کا یہ عالم ہے کہ غالب کا ایک مصرعہ صحیح نہیں پڑھ سکتیں۔ انگلیوں میں لگی ہوئی آگ اب سارے بدن میں پھیل گئی تھی۔ وہ غصہ اتارنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہے تھے کہ دالان میں سوتی ہوئی غزل پر نظر پڑ گئی۔

”اچھا اور یہ شہزادی ابھی تک سوری ہی ہیں۔“

غزل نے سنا تو رضائی کے اندر پریشانی کے مارے برا حال ہو گیا۔

اونہ غزل کو بر امت کہنا۔۔۔“ بی بی نے دھیرے سے کہا اور پھر سامنے بیٹھی ہوئی بیوی کی اداس صورت دیکھ کر ”
وہ بی بی کی بات مان گئے۔ مجبوراً پھر مربے میں جٹ جانا پڑا۔

چلو جان بچی۔۔۔ غزل رضائی پھینک کر اٹھی اور جلدی سے ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ہاتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھونے میں کئی فاندے تھے۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ دانت ماتھے یا نہیں ! اور نہ صابن کی مرچیں آنکھوں میں لگانا پڑتی تھی۔ وہ بڑی دیر تک نل کی دھار کو ہاتھوں میں لے کر چھپک چھپا کرتی رہی۔ رضائی میں سے نکلے ہوئے گرم بدن پر پانی کے چھینٹے برف کے ریزے بن کر لگ رہے تھے۔ جب باریک باریک پھوار نے اس کے بال بال میں موتی پرودنے تو بھیگی چو بیانی با ہر نکلی کپڑوں سے پانی ٹپکاتی ، ناک سڑسراتی، بابر آنے کے بعد مفرور مجرموں کی طرح کوئی محفوظ ٹھکانا ڈھونڈنے لگی۔ اتنی دیر میں چغل خور فوزیہ نے اسے پکڑ لیا۔

ممی ممی ، غزل کو دیکھیے۔۔۔“ وہ خوب خوب بن کر ہنسنے لگی۔

محض اس لئے کہ اس وقت وہ خود سفید بھک فراک پہنے تھی۔ اس کے ہال ہری ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ اور سفید جوتوں کے سرخ پھندوں کو زور زور سے جھٹکتی وہ اترائی اترائی پھر رہی تھی۔ غزل کی بیبت کدائی کی خبر سن کر شاہین نے بھی ضد کرنا چھوڑ دی اور ادھر متوجہ ہوا۔ وہ آیا کہ ہاتھوں سے چھٹ کر ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ نیکر کے گیس چابک کی طرح ہوا میں گھماتے گھماتے اس نے غزل کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور ہنسنے لگا۔ مگر صرف اپنی چھوٹی بہن فوزیہ کو خوش کرنے کے لئے۔ کیوں کہ ایک تو اس کے اپنے کپڑے بھی میلے تھے اور پھر بھیگے ہوئے کپڑوں میں کانپتی ہوئی غزل کو دیکھ کر اس کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ نل کے نیچے بیٹھ کر خوب اودھم مچائے۔

ارجی بتول بیگم۔ ذرا دیکھو تو تمہاری صاحبزادی نے کیا گت بنائی ہے۔۔۔؟“ رضیہ نے غزل کو کیچڑ بھرے پاؤں ”
سے فرش گندا کرنے پر منہ بنایا۔

”میرے کمرے میں مت جانا۔ قالین گندا ہو جائے گا۔“

دلہن ممانی کی آواز سنتے ہی غزل نے ماں کے متوقع گھونسنے کی امید میں آنکھیں بند کر کے سر پر دونوں ہاتھوں سے چھپر ڈال لیا۔ چنانچہ جس وقت وہ ماں کے تھپڑ کھا کر چلا رہی تھی اور زمین پر چل رہی تھی تو بچاری چاند کو آنسو پونچھ کر وائیلن رکھ دینا پڑا۔ شاہین اور فوزیہ پاس کھڑے اس کے پٹے کا تماشا دیکھتے رہے۔ راشد نے بھی اخبار سے نظریں ہٹا کر ادھر دیکھا اور پھر اخبار میں کھو گیا۔

پھر واحد حسین دھاڑے۔

”ذرا میری چھڑی تو لا نا۔۔۔“

اچانک سناتا چھا گیا۔ غزل، درت سے پنجم پر آئی۔ اور پھر چپ ہوگئی بالکل ڈرل کرنے کے انداز میں کھڑا ہونا پڑا اور پھر اماں سے وہ منحوس کرتا بھی پہنوالی جوابا کی قمیص کاٹ کر بنوایا گیا تھا۔

رضیہ ناک سکڑے، تیوری پربل ڈالے دالان میں آئی اور شاہین اور فوزیہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ یہ ضدی چھوکری اس کے سلیقہ مند بچوں کو بھی بگاڑ دے گی۔

ناشتے کی میز پر حسب عادت فوزیہ خوب ٹھنکی۔

انڈا انہیں کھاؤں گی۔ ایک پیالی سے زیادہ دودھ نہیں ہوں گی۔۔۔ یہ پلیٹ گندی ہے۔ آیا نے بغیر صابن لگانے ہاتھ دھلا ”
”دیے۔

اور رضیہ چمکار چمکار کر اسے بہلاتی رہی۔ کبھی ہلکے سے راشد ڈانٹ دیا تو واحد حسین فوراً سے ٹوک دیتے۔

”آپ ہماری گڑیا کو ننینڈاٹنا۔“

فوزیہ چار سال کی تھی اور دادی دادا کی بے حد لاٹلی تھی۔

شاہین اب سات برس کا ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو کافی بڑا اور عقلمند سمجھ کر ضد نہیں کرتا تھا۔ شاہین ناشتے کے وقت حسب عادت دادا کے پاس بیٹھا تھا۔ سات برس کا با نکا سگیلا اہم شخصیت کا مرد۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ فوزیہ اور غزل سے تین برس بڑا ہے۔ اسے انگریزی کی بہت سی نظمیں یاد ہیں۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتا ہے۔ اور بے چاری فوزیہ کو ابھی تک اے۔ بی۔ سی۔ ڈی پوری طرح یاد نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی چھوٹی سی موٹر میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتا تھا تو غزل کی سمجھ میں خاک نہیں آتا تھا کہ موٹر چلنے کا راز کیا ہے؟ آج کل وہ فوزیہ کو بڑی تن دہی سے اپنی رنگین تصویروں والی کتاب کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ ایسے وقت اگر غزل آجاتی تھی تو وہ دونوں بہن بھائی فوراً کتاب چھپالتے تھے۔ غزل کو رنگین تصویریں کھانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ کہتی تھی بڑی میٹھی ہوتی ہیں۔

ایک دن تجربے کی خاطر ان تینوں نے شاہین کی پوری کتاب کھا ڈالی اس وقت تو زیادہ لطف نہ آیا۔ مگر جب رضیہ نے سنا تو سب کا کیا دھرا اکیلے شاہین کو بھگتنا پڑا۔

شاہین کو قصے کہانیاں سنانے والے اپنے دادا حضرت بے حد پسند تھے۔ وہ ابھی سے طے کرچکا تھا کہ بڑا ہوکر داڑھی رکھے گا۔ تحصیلداری کرے گا اور ہاتھ اٹھا کر شاعری کرے گا۔ کھانا کھاتے وقت وہ بویہو دادا کی نقل کرتا تھا۔ ویسے ہی چار انگلیوں سے نوالہ بناتا۔ اچار، املی والے کھٹے سالنوں سے سخت پریر کرتا۔

سالن میں نمک بالکل کم ڈالا جاتا۔ ناشتے سے پہلے خمیرہ و مروارید کھا کر اولٹین پی جاتی۔ اتنے اہتمام اور نفاست کے ساتھ کہ سارا گھر اتنی دیر میں ناشتہ ختم کر دیتا تھا۔ ”گلاس بائیں ہاتھ سے اٹھانا چاہیے۔ جب تک ایک سالن ختم نہ ہو اور سالن نہیں لینا چاہیے۔“ بیچ بیچ میں دادا حضت کی دوا کے دور چلتے۔ کوئی دوا کھانے سے پہلے کی ہوتی اور کوئی کھانے کے درمیان اور کوئی آخر میں کھانا پڑتی۔ ان دواؤں کے اوقات یاد دلانا بھی شاہین کا کام تھا۔

میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو غزل نے صرف اچھٹی ہوئی نظر سے دیکھا۔ کیوں کہ وہ کھانے میں مصروف تھی۔ پہلے تو اس نے انڈوں کی پلیٹ گھسیٹی اور بڑی مشقت کے بعد دوانڈے نکل لئے۔ پھر کھچڑی کی ڈش میں سے اتنے چاول انڈیلے کہ پلیٹ کے ساتھ ساتھ پاس رکھی ہوئی اچار کی کٹوری اور املیٹ کی پلیٹ بھی چاولوں سے بھر گئی۔ چاند اپنے سامنے املیٹ کا ایک ٹکڑا ڈالے کانٹے سے کھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور چہرہ بے حداد اس تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ غزل جس طرف نگاہ ڈالے وہ چیز جھٹ غزل تک پہنچادے۔ مگر ہر بار وہ بڑی پھرتی سے چاند آپا کو اس زحمت سے بچالیتی تھی۔

خوب بہت سا مسکہ، اچار اور انڈے کھچڑی میں گوندھنے کے بعد اس کا کھاتے کھاتے جی اوب گیا تھا۔ تو بہتی ہوئی ناک کو کلائی سے پوچھ کر وہ پرائوں کی طرف لپکی۔ مگر اچانک اماں کا سرد ہاتھ ہتھکڑی کی طرح اس کی کلائی سے لپٹ گیا۔ اور زناٹے کے ایسے تھپڑ منہ پر پڑے کہ منہ میں ٹھنسنے ہوئے چاول دھکا کھا کر باہر نکل پڑے۔۔۔ وہ نیورا کر کرسی کے نیچے گری۔ سب بقول کو برا کہنے لگے۔

اوئی ماں تم کیسے بے درد میں بقول بیگم۔ مجھ سے تو کبھی اپنے بچوں کو نہیں مارا جاتا۔ رضیہ نے ترس کھا کر ”کہا۔

دونوں ماں بیٹیاں اول نمبر کی جاہل ہیں۔“ واحد حسین نے اطمینان سے اولٹین لی۔ فوزیہ اور شاہین غزل کو پٹتے دیکھ ”کر بن بن کر ہنسنے لگے۔

دیکھا تم نے۔۔۔ ایسے ہوتے ہیں گندے بچے۔“ راشد فوزیہ اور شاہین کو عبرت دلانے لگا۔

چاند اپنی سفید جار جٹ کی ساری پر سے چاول اور سالن کے دھبے بڑی نفاست سے صاف کرنے لگی۔ بی بی اس تماشے کی خاموش تماشائی تھیں۔ اور بڑی خاموشی سے روٹی کے چھوٹے چھوٹے نوالے نگلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آج کل گھر کی فضا چاند کی وجہ سے گم سم تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر رحمن پھر بمبئی چلا گیا ہے۔ اور آج کل چاند چھپ چھپ کر روتی ہے۔ مگر اس جانب سے سب انجان بنے ہوئے تھے۔

بتول کسی کو جواب دینے کے بجائے غزل کو مارنے کے بعد اپنے آنسو پو چھتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

اپنا گھر بے یہاں تو کوئی بات نہیں۔ مگر بتول نے غزل کو بہت بد تمیز بنایا ہے۔ راشد نے نظیر ٹھہر کر کہا۔ ”

راشد جانتا تھا کہ رضیہ، بتول اور غزل سے اتنی ہی نفرت کرتی ہے جتنا وہ چاند کو چاہتی ہے۔ مگر بی بی اور ابا جان کی وجہ سے سہنا پڑتا ہے۔ خصوصاً راشد کو اپنی ماں کے چہرے پر برستی ہوئی مظلومی سے دلی ہمدردی تھی۔ عام بیٹوں سے زیادہ وہ اپنی ماں کو چاہتا تھا۔ ہر وقت ان کی دلجوئی میں نگار بتا جو وہ چاہتی تھیں۔ پھر بھی یوں لگتا جیسے ان سب نے مل کر بی بی کو قید میں ڈال دیا ہے۔ اور وہ دروازے پر پہرہ دیتے رہتے ہیں۔۔۔ بی بی کو دیکھ کر بعض وقت راشد سوچتا کہ عورت کس عمر تک زندہ درہتی ہے۔۔۔؟ بی بی کے اندر بیٹھی ہوئی ضدی لڑکی کیا کبھی ہار نہیں مانے گی۔ وہ ابھی تک ماں اور دادی کے سچے روپ میں نظر نہ آتی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے یہ سب فرائض بڑی تندہی سے ادا کئے تھے۔

اگر بتول کو کچھ دینا ہو تو دیدیجئے نا۔ پاپ کٹے۔ بی بی نے آہستہ سے واحد حسین سے کہا۔ ”

میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ ہے۔“ وہ جھنجھلا گئے۔ ”

ہر مہینے دو سو روپے کہاں سے لاؤں میں! آپ کے داماد کو تو اب چاٹ لگ گئی ہے۔ جس وقت دیکھو ہاتھ پھیلا ” ہے۔“

تو بتول کیا کرے۔؟“ بی بی کی آواز بھرا گئی۔ ”

”وہ اسے مار پیٹ کر بھیجتا ہے۔ اگر روپیہ لے کر نہ جائے گی تو اور ظلم توڑے گا۔“

تو میری بوٹیاں نوچ کر دیدی و۔“ واحد حسین چلانے لگے ”

رضیہ اور راشد اس بات پر بالکل انجان بنے رہے۔

ناشتے کی میز سے اٹھ کر واحد حسین سوچنے لگے کہ اس تکلیف دہ ماحول سے چھٹکارا پانے کے لئے بیاض کھولنا چاہیے اور وہ سگار سلگا کر الماری ٹٹولنے لگے۔

فوزیہ اور شاہین اسکول جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ رضیہ اور گوہر پھو پودان میں بچھے تخت پر بیٹھی پان کھاری تھیں اور زوردار بحث میں مصروف تھیں۔

یہ سب چاند کی نقل ہو رہی ہے۔ اللہ کی شان ہے۔ سنا ہے فاطمہ بیگم کی لڑکی قیصر کالج میں پڑھ رہی ہے۔ یہ قیامت ” کے آثار ہیں۔ کمینوں کا اتنا زور ہو گیا ہے۔“ پھپھونے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

اور یہ نہیں سا بیگم صاب پیدل جاتی ہیں کالج۔“ رضیہ بڑے طنز کے ساتھ ہنسی۔ ”

”جب پیسے نہیں ہیں تو بڑے آدمیوں کی نقل کرنا کیا ضروری ہے؟ بشیر آیا مرحومہ زندہ ہو تیں تو جانے کیا کرتیں؟“

کیا کرے بچاری۔۔۔ صورت شکل تو ایسی ہے نہیں کہ کسی ڈیوڑھی کی بیگم یا خواص بن سکے۔“ بی بی کی اس بات ” پر پھوپو نے بڑے غور سے انھیں دیکھا اور اندر کمرے میں سسکیاں لیتی ہوئی بتول سے بولیں۔

”جی اب بس کرو ماں بقول پاشا۔ ایک جانہار تو یوں ہی گھل گھل کر مر چکی ہے۔“

بی بی کے پاس بیٹھ کر چھالیہ کے گرے ہوئے ٹکڑے اور پانوں کے ڈنٹھل منہ میں ڈالنے کے بعد غزل نے چاند کے کمرے کا رخ کیا۔

چاند سفید ساڑی پہنے اپنے ذرا ذرا سے سنہری بال منہ پر بکھرائے بغیر آستین والی ننگی بابیں کرسی پر ڈالے نڈھال پڑی تھی۔ اس وقت وہ اپنی ہی بنائی ہوئی کوئی پینٹنگ لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو چھپائے۔۔۔ لپ اسٹک نہ کاجل۔

انہیں خاموش دیکھ کر غزل کی ہمت نہ پڑی کہ ان کی میز پر رکھی ہوئی رنگ برنگی شیشیوں اور ڈبوں کو چھوئے۔ چاند کا کمرہ ایسا خوبصورت تھا کہ لگتا وہاں پر ریاں رہتی ہوں گی۔ ور انڈے میں سے گزرو تو اس کمرے سے بھکا بھک خوشبو نہیں آیا کرتیں تھیں۔ اس لئے وہ بڑے امید بھرے انداز میں دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی کہ چاند خود ہی اندر بلا لے۔ چاند ”ایوان غزل“ کی واحد فرد تھی جو آج تک غزل کی کسی حرکت پر نہیں بنستی تھی۔ نہ اسے کبھی ڈانٹا اور نہ اپنے کمرے سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ایک بار انہوں نے اپنا پرانا شیفون کا اسکارف غزل کو دے دیا تھا۔ جو اس نے جانماز کی طرح سینٹ کر رکھا تھا۔ چاند غزل کی انیڈیل تھیں۔ حالانکہ وہ غزل کو بہت کم دیکھنے کو ملتیں۔ کیوں کہ غزل کبھی مہینوں میں نا ناحضت کے ہاں آتی تھی۔ لیکن چاند کے ساتھ وہ جتنی دیر رہتی ، اسے چھو چھو کر دیکھتی اور اس بات پر چاند کو بڑی ہنسی آتی تھی۔ چاند کو یوں بھی بہت ہنسی آتی تھی۔ ان کا نام چاند رکھ کر جانے کس نے ان کی تو بین کی تھی۔ ان کے سامنے تو ہزار سورج نکلتے تو ماند پڑ جاتے۔ بالکل سینما کی ناچتی گاتی تصویروں جیسی تھیں وہ۔ پھر ان کے خوشبو میں بسے کپڑے سنہری کٹے ہوئے بالوں کی اڑتی ہوئی پھوار میں ، اور کنجالی آنکھوں میں چمکتی ہوئی سنہری پتلیاں، جیسے پانی میں سنہری مچھلیاں تیر رہی ہوں غزل دل ہی دل میں پکا ارادہ کئے بیٹھی تھی کہ وہ چاند آپا سے بیاہ کرے گی۔ اس بات کی اطلاع اس نے فوزیہ کو بھی نہ دی تھی کہ کہیں وہ بھی چاند آیا پر پھیل گئی توجہ داری دودو سے کیسے نبٹے گی! چاند کی اس خوبصورتی کی بدولت راشد کے بہت سے بگڑے ہوئے کام سنور گئے تھے۔ کیوں کہ وہ چاند جیسی خوبصورت بھانجی کا ماموں تھا۔ بڑے بڑے سرکاری فنکشن میں اس کا پروگرام ہوتا۔ کالج کے ہر ڈرامے کی ہیروئن وہی ہوتی۔ اخبار اس کے آرٹ پر مضامین لکھتے تھے۔ اس طرح اونچے طبقے میں وہ نہ صرف خود پہنچ گئی تھی بلکہ اس نے راشد کو بھی پہنچادیا تھا۔

ان حسین و جمیل چاند آپا پر غزل بھی مر مٹی تھی۔ انہیں ناشتے میں پاؤں کھانے سے چڑ تھی۔ اسلئے صرف پاؤں کی تھالی غزل کی دست برد سے محفوظ رہتی تھی۔ چاند آپا دن بھر گنگناتی رہتی تھیں اور غزل بھی ان کی آواز میں آواز ملاتی۔

”ارے غزل۔ تیری آواز تو بہت اچھی ہے۔۔۔ تو بھی گانا ضرور سیکھ لے نا۔“

چھا۔۔۔ آپ سکھا دیجئے۔“ وہ اپنی تعریف سن کر فوراً چاند آپا کی صاف ساری پر اپنے میلے ہاتھوں سے دھبے ڈالنے لگی۔

مجھے کہاں فرصت ہے ڈیر۔“ انہوں نے غزل کے موٹے موٹے گالوں پر چٹکی بھری۔

اللہ یہ لڑکی بڑی بو کر کیسی قیامت ڈھائے گی۔“ خوبصورت چیزوں پر مر مٹنا چاند کی عادت تھی۔

غزل نے اداسی سے سوچا۔ سچ مچ چاند آپا کو کہاں فرصت ہے۔ جس وقت دیکھو ڈرائنگ روم میں گورے گورے کالے کالے لوگ بھرے رہتے تھے۔ کبھی ڈراموں کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ چاند آپا وائلن پر گیت گا رہی ہیں۔ اپنی تصویریں دکھا رہی ہیں اور ڈرائنگ روم میں سگریٹ کا دھواں قہقہوں میں کھل رہا ہے۔

چاند آپا اپنی ہر بات میں نفاست اور تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت دیتی تھیں۔ دنیا کا کوئی فیشن ایسا نہ تھا جو ان پر نہ سبھا ہو۔ یوں تو راشد ولایت پلٹ تھا اور رضیہ جونیر کیمبرج تک پڑھی ہوئی تھی۔ مگر چاند کی بدولت پہلی بار وہ سوشل بننے کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ چاند نے اب دلہن ممانی کو بے پردہ کھلی کار میں لے جانا سکھایا تھا۔ ہنس ہنس کر مردوں سے باتیں

کرنا اور میک اپ کر کے پارٹیوں میں لے جانا۔ یہ سب انہوں نے چاند کی صحبت میں سیکھ لیا تھا۔ جس وقت وہ نئی وضع کا جوڑا باندھ کر بڑی کاریگری سے میک اپ کرتی تھیں تو اوروں کی بات چھوڑیے، خود راشدان پر نئے سرے سے مرمتا۔

چاند صرف نام کی آرٹسٹ نہیں تھی، بلکہ اس کے آرٹ کا دائرہ واقعی بہت وسیع تھا۔ میڈیکل کالج سے آکر وہ شام کو حیدرآباد کے مشہور مصور راشد کے پاس پینٹنگ سیکھنے جاتی تھی۔ اس طرح اس کا آرٹ اداکاری موسیقی پینٹنگ اور ڈاکٹری کا سنگم بن گیا تھا۔ لوگ بے چینی سے منتظر تھے کہ کب وہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کے دکھتے ہوئے بدن پر مرہم رکھا کرے گی۔ جانے کتنے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے فن کاروں کی اس نے اپنی سفارش سے قسمت جگادی تھی۔ کالج کے تمام ہونہار طالب علموں کی ذات کا محور چاند کی ذات تھی۔ جسے سب پیار سے ڈاکٹر چاندنی کہتے تھے۔ یہ سب اس وقت کی باتیں ہیں جب واحد حسین قرض کی آندھی میں گھر کے چکر رہے تھے راشد روپے کمانے کے نئے نئے ذریعے ڈھونڈ رہا تھا۔

کیوں کہ احمد حسین نے ایک حرامی لڑکے کو اپنامنتیٰ بنا کر انہیں انگوٹھا دکھا دیا تھا۔ ادھر جائیداد قرض میں ڈوبتی جارہی تھی اور صرف راشد کی ہزار ڈیڑھ ہزار کی آمدنی پر ”ایوان غزل“ کا وقار ٹکمانے لگا تھا۔ اس مصیبت سے چھٹکارہ پانے کے لئے انہوں نے راشد کو ایک چیک کی طرح کیش کرایا تھا اور رضیہ اپنے ساتھ بے شمار دولت لے کر آئی تھی۔ واحد حسین کا بس چلتا تو وہ اس روپیہ کو بریانی اور بگھارے بیگن کی تجارت پر لگا دیتے۔ مگر راشد نے اپنے ابا کی طرح تحصیلداری میں عقل نہیں گنوائی تھی۔ اس لئے اس نے ملازمت کے ساتھ ساتھ کافی، دواؤں اور بیٹری کی تجارت بھی شروع کر دی تھی۔ کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ملکی مصنوعات کو فروغ دیا جارہا تھا۔ تاجروں کو حکومت بڑی بڑی مالی مدد دیتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاندی کے سامان سگریٹ اور پیڑی نے پورے ہندوستان میں عالم گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ حیدر آباد بہت چھوٹا سا علاقہ تھا۔ مگر یہاں کی مصنوعات کی قدر ہندوستان سے باہر بھی تھی۔ اس بہتی گنگا میں راشد بھی ہاتھ دھونا چاہتا تھا۔

اس نے چاند کے توسط سے بڑے تاجروں سے یارانہ گانٹھا اور شولا پور کے راستے اپنا مال بمبئی اسمگل کرنے لگا۔ چند مہینے کے بعد ہی اس نے پرانی پھٹیچر بیوک بیچ کر نئی رولس رائیس کار خرید لی۔ ”ایوان غزل“ کے ہلتے ہوئے بام و در کی ریپیرنگ کروائی۔ سود اور قرض کی کئی قسطیں ادا ہو گئیں۔ اب جو لوگوں نے چاند اور رضیہ کی صورتوں پر انگلیاں اٹھانا شروع کیں تو واحد حسین کے خاندانی وقار کو کوئی تھیں نہیں لگی۔ وہ اعتراض کرنے والوں کو کہتے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی روایتوں کو خود ہی دیمک بن کر چاٹ رہے ہیں۔ قرض اور جہالت کی دلدل میں پھنس کر اپنی عقل بھی کھو بیٹھے ہیں۔ ان کی لڑکیاں، قرآن شریف پڑھنے کے بعد تعلیم مکمل کر دیتی ہیں۔ لڑکوں نے آوارگی کی سب ڈگریاں لے لی ہیں اور اطمینان سے اپنی ڈیوڑھیوں میں بیٹھے شطرنج کھیلتے رہتے ہیں۔ اور پھر ایک دن اچانک معلوم ہوتا ہے کہ شہ پڑ رہی ہے اور بچاؤ کے سارے راستے مسدود۔

جس وقت ہمایوں اپنے باپ کے انتقال کی خبر سن کر اندر بھاگا تھا تو اسے پکا یقین تھا کہ اب اس کے سونے ہوئے بھاگ جاگ اٹھے ہیں مگر ہوا یہ کہ ”الف لیلہ“ سے دھتکارے جانے والے اس کے تمام سوتیلے بھائی آگئے، باپ کی میت کو کاندھادینے بھوک اور مصیبتوں نے انہیں جینا سکھا دیا تھا۔ اس لیے ان میں کوئی جج تھا، کوئی بیرسٹر۔ کوئی تحصیلدار اور کوئی کلرک۔ لہٰذا سب نے مل کر عدالت میں ثابت کر دیا کہ ہمایوں ان کے باپ کا بیٹا ہی نہیں تھا۔ اس کی ماں جو پندرہ برس سے ساٹھ برس تک مسکین علی شاہ کی جوتیاں کھاتی رہی، ان کی کوئی نہ تھی۔ مگر ہمایوں نے ہمت نہیں ہاری اب وہ جوئے اور شراب میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت ڈھونڈنے گیا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا کہ کبھی تو رحمت علی شاہ اپنی کرامات سے اس کے دن پھیریں گے۔

ہمایوں کے اس عبرت ناک انجام کو دیکھنے کے بعد واحد حسین تعلیم کی برکتوں کے قائل ہوتے جارہے تھے۔ اور ”چاند کا حکم ماننا اس کی باتوں پر عمل کرنا، گھر میں سب پر فرض تھا۔

یوں تو گو ہر پھوپھو کی ذات بابرکت بھی تھی جوشہر بھر کی لڑکیوں کی ناک میں نکیل ڈال چکی تھیں۔ مگر چاند تک ان کا بھی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے چاند ہر طرف کمندیں ڈالتی تھی۔ ہزار بار اس کا دل ٹوٹتا اور پھر جڑ جاتا تھا۔ ایک سے ایک قیمتی ساریاں پہنے وہ فرصت کے وقت کینوس پر جھکی گنگنائے جاتی۔

پیا باج کیسے صبوری کروں

کہا جائے اماں کہیا جائے تا

کام کرتے وقت اس کے کٹے ہوئے بالوں کی نہیں ماتھے پر آجاتی تھیں تو پاس بیٹھی ہوئی غزل جلدی سے انہیں پن میں اٹکا دیتی تھی۔

غزل کی ان حرکتوں پر چاند کو بڑی ہنسی آتی تھی۔ کیوں کہ وہ خود غزل کی نشیلی آنکھوں پر مر مٹی تھی۔ جانے بڑے ہو کر یہ لڑکی کیا غضب ڈھائے گی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی سے ایک دعوت ایک موہنی کشش تھی۔

ایک بار اس نے کسی کام کے لئے غزل کو پکارا۔

”اے برنی کی آنکھوں والی لڑکی۔۔۔؟“

یہ سن کر غزل اترائی اترائی پھر نے لگی۔

لوگوں کی حقارت بھری نظریں، ابا کا جلال اور اماں کا غصہ اس نے سب دل سے بھلا دیا۔ اس کا جی چاہا اپنے آپ کو سات بار وار کے چاند آپا کے اوپر سے پھینک دے۔

چاند آپا تو ہماری ہیں۔۔۔ ایک دن اس نے اترا کے فوزیہ سے کہا۔ ”

تمہاری کیوں ہوتیں؟“ فوزیہ گھبرا گئی۔ ”

”وہ تو ڈیدی کی ہیں اور ممی کی۔۔۔“

آج تک کسی نے بھی گاجر کے مربے میں کشمش ڈالی ہے؟“ بی بی نے پان بناتے میندھیرج سے کہا۔ ”

”نہ ڈالی ہو۔ حدیث شریف میں تو نہیں لکھا کہ گاجر کے مربے میں کشمش نہ ڈالی جائے۔“

حسب عادت آج واحد حسین گاجر کا مربہ بنانے میں جٹے ہوئے تھے۔ جس دن کوئی نئی پریشانی انہیں آگھیرتی اور شعر ساتھ چھوڑ دیتے تھے تو وہ اچار چٹنیوں میں پناہ لیتے تھے۔

بی بی واحد حسین سے بہت کم بحث کرتی تھیں۔ کیوں کہ رضیہ کی شادی کے بعد انہوں نے گھر کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ اس لئے اب وہ واحد حسین کے عشق پر گھبرانے یا گوہر پھوپو کی باتوں پر کڑھنے کی بجائے، اپنی بہو کے سگھڑا پے پر خوش ہوتی تھیں۔ گھر اور اس کے بکھیرڑوں سے ان کا تعلق اب اور بھی کم ہو گیا تھا۔ دن بھر وہ یا تو خود پردہ لگی کار میں کہیں رشتے داروں میں گھومنے چلی جاتی تھیں، یا آنے والیوں مہمان بی بیوں سے بیٹھی گپیں ہانکتیں۔ چاندی کے پاندان کو کھول کر پان پے پان کھائے جاتیں کبھی موڈ آتا تو شاہین اور راشد کے لئے ململ کے کرتے سینے بیٹھ جاتیں۔ اپنے اس فن پر انہیں بڑا ناز تھا۔ رضیہ اور چاند کو کشیدہ کاری کے نئے نئے ڈیزائن بنانا آتے تھے۔ چاند تو اپنے بلاؤزوں کے ڈیزائن خودی کاغذ پر بنا کر درزی کو دیتی تھی۔ رضیہ کو بچوں کے نئے نئے وضع کے جھالار دار جمپر سینے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن مشین کے بغیر ان لوگوں سے ایک ٹانگانہ لگتا تھا۔ لیکن بی بی نے سلانی کا سارا کام مشین کے بغیر ہی کیا جب شادی بیاہ میں گوٹے کناری کا کام نکلتا تو لوگ چل چل کر بی بی کے پاس آتے تھے وہ سارے جوڑے اتنی نفاست سے تیار کرتیں کہ بس

بیٹھے دیکھا کرو۔ البتہ جلوے کے جوڑے کو بھی ہاتھ نہ لگاتی تھیں۔ ایک بار ان کی ایک خالہ ساس نے کہا بھی۔۔۔ ”اے واحد دلہن تم جیسی خوش قسمت سہاگن کون ہوگی ! اتنا چاہنے والا شوہر۔

”بال بچے۔ آباد گھر۔۔۔ تم جلوے کے جوڑے کو ہاتھ کیوں نہیں لگاتیں۔

پھوپو اماں لوگ کہتے ہیں کہ سہاگ کا جوڑا سینے والی کی قسمت بھی اس گوٹے کناری کے ساتھ تک جاتی ہے تو ”
”پھر چپ کا بے کو۔۔۔ نئی دلہن کی قسمت میں اتنے جھگڑے نٹتے۔۔۔؟

کبھی کبھی واحد حسین کو بڑا رومانی موڈ آتا تھا تو وہ بی بی کے ساتھ دو ایک شطرنج کی بازیاں بھی کھیلتے تھے۔
نومشقی کے باوجود ہمیشہ بی بی انہیں شکست دے دیتی تھیں۔ اس پر ایک شاندار معرکہ ہوتا اور آخر میں واحد حسین بساط اٹھا کر پھینک دیتے۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر بی بی کو اپنی بانہوں میں بھر لیتے تھے۔ انہوں نے پنشن لی تھی مگر انہیں کبھی بی بی کے بغیر اکیلے بستر پر نیند نہ آتی۔

وہ آج بھی بی بی کو نئی دلہنوں کی طرح تا کا کرتے تھے۔ حالانکہ بی بی آج بھی یوں ہی سرد مہری سے بڑے ٹھنڈے دل سے انہیں برداشت کرتی تھیں۔ جیسے بے جان گڑیا ہوں۔

اب پنشن لے کر تو واحد حسین اور بھی پچھتائے۔ پنشن سے پہلے انہوں نے وقت گزاری کے بڑے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ پھر جب اطمینان سے گھر میں آکر بیٹھے تو پہلے تو انہوں نے شیروانی اور تنگ موری کا پاجامہ اتار کر لنگی با ندھی اور پہاڑ لے کر تمام ”ایوان غزل“ کو گلزار بنا ڈالا۔۔۔ پھر گھر سدھارنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس انہیں کچھ نہ کرنے دیتے تھے۔ اب تو ان کی آواز کی وہ مشہور کڑک اور غصہ تک ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اب انہیں دنیا ”کی ہر بات میں ٹانگ اڑانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ فلاں نو کر کیوں اور کہاں گیا۔۔۔؟

چاند کے پاس کون آیا ؟ آج کیا پکے گا۔۔۔؟“ بڑھاپے نے کیسے فولادی انسان کو ”

!چھلا دیا تھا۔

تحصیلداری کے میں برسوں میں انہیں اپنی اہمیت منوانے کی ضرورت کبھی نہ پڑی۔ ضلع کے تمام عوام اُن کے اشاروں کو سمجھتے تھے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ گاؤں کی عورتیں واحد حسین کا نام لے کر اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے باپ دادا کی روایت کے مطابق۔ تحصیلداری بھی کی تو اس شان سے کہ صدرالمہام تک جھینپ جائیں۔

ہائے کیا زمانہ تھا۔۔۔؟ انہوں نے آسمان پر اڑتی ہوئی چڑیوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس دن گھر سے راشد کے پیدا ہونے کا تار آیا تھا اور وہ خوشی کے مارے پاگل ہوئے جارہے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ پہلی بار باپ بن رہے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اب بی بی کے پیر میں ایک اور زنجیر ڈال دی تھی۔ اب ان کے دل سے یہ وبم نکل گیا تھا کہ ایک دن گو ہر پھوپو کی آنکھ بچا کر اپنے باپ کی جھونپڑی میں بھاگ جائیں گی۔

وہ گھر جانے کو تیار ہو گئے۔ جوں جوں ضلع میں یہ خبر پھیلی، لوگ تحصیلدار صاب کو مبارکباد دینے جوق در جوق آنے لگے۔ اتنے نذرانے اور تحفے اکٹھے ہو گئے کہ انہیں گھر لے جانا مشکل ہو گیا۔

ان دنوں یہ خبر گرم تھی کہ ریاست کا صدرالمہام ایک ”ہندوستانی“ بننے والا ہے۔ یہ ہندوستانی ”سرکار کے بلاوے پر کٹی چکر کاٹ چکا تھا اور سا تھا کہ صدر المہامی کی مچھلی اس کے جال میں پھنس چکی تھی۔

یہ ہندوستانی لوگاں بڑے چالو ہوتے ہیں۔“ واحد حسین لوگوں کو جتایا کرتے تھے۔

اس دن بلدہ جانے کے لئے، مفروض احمد ٹرین میں بیٹھے تو آج جیسے ٹرین ان کی بے صبری پرستانے تلی ہوئی تھی۔ چلنے کا نام ہی نہ لیتی۔ مسافر بے چینی سے کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے۔ کوئی کہتا اگلے اسٹیشن پر ٹرین الٹ گئی ہے۔ کوئی سناتا کہ کمیونسٹوں نے پٹریاں اکھاڑ چھینکی ہیں۔ سارا ریلوے اسٹاف گھبرایا گھبرایا پھر رہا تھا۔

وہ لوگ مسافروں کے ہزاروں سوالوں کا جواب دینا حماقت سمجھ رہے تھے۔

پندرہ منٹ۔۔۔ ایک گھنٹہ۔۔۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔

پنکھا کھول کر مفروض احمد نے سوچا کہ بھلا وہ ایسی ریاست میں کہاں تک اصلاح کریں گے جہاں ایک ٹرین بلا کسی وجہ کے ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو جائے۔۔۔؟

شور کی آواز سن کر وہ پھر کھڑکی کی طرف آئے۔ ان کے سامنے انسانوں کا ایک سیلاب بہہ رہا تھا۔ لوگ جانے کیوں نعرے لگا رہے تھے پھولوں کے ہار مٹھائی کی ٹوکریاں اور کالے انسانی سروں کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے حیدر آباد کے بارے میں اتنا سا تھا، اتنا پڑھا تھا کہ اب وہ ایک بھکارن کی صورت دیکھ کر اس کے چہرے پر لکھی کسی ڈیوڑھی کی کہانی پڑھ لیتے تھے۔

وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے بار بار پوچھتے جاتے تھے۔

میٹھی ڈال میں کیا شکر ڈالی جاتی ہے۔۔۔؟ ترم خاں کیا حیدر آباد کا کوئی پادشاہ تھا۔۔۔؟ گنڈی پیٹ کا پانی کیسا ہوتا ”

”ہے۔۔۔؟ کیا یہاں سوکھی مچھلی اور جھینگے کھانا ضروری ہے۔۔۔؟

”کیا آپ لوگ پانی میں بھی املی کی کٹھانی ملا کر پیتے ہیں۔۔۔؟“

پھر اچانک اس انسانی سیلاب نے ان کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا رخ کر لیا۔۔۔ وہ پہلے تو اچھل پڑے۔ پھر گھبرا گئے۔۔۔ شاید لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ اس کمپارٹمنٹ میں حیدر آباد کا ہونے والا صدر المہام سفر کر رہا ہے۔۔۔ لیکن ان کے لئے ! اتنا شاندار استقبال ؟ اب مجھے کیا کرنا چاہیے ؟ صابر نواب نے اس بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں ہے

اور جب وہ پھولوں کے لئے اپنی گردن جھکا چکے تھے تو ایک لحیم شحیم خوش شکل نوجوان کو لوگوں نے اندر ڈھکیل دیا۔ وہ پھولوں میں چھپا ہوا تھا۔ لوگ اس کے تحفوں کو رکھنے کے لئے اندر آگئے اور مفروض احمد کو سامان سمیت ان لوگوں نے روند ڈالا۔ ان کے ساتھ والے سرونٹ کیبن میں جب نوکروں کی فوج، مرغیوں کے جھانپے اور پھولوں کے ٹوکڑے رکھے جاچکے تو ٹرین چلنے لگی۔ اب انہوں نے بھی حواس میں آکر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس خوش شکل اور خوش قسمت نوجوان کو دیکھا جس کے چہرے پر ایسا رعب تھا کہ مغل شاہزادوں کی صورت نظروں میں پھر گئی۔ اس لئے مفروض احمد نے حفظ ما تقدم کے طور پر صابر نواب کے سکھائے ہوئے درباری آداب برتا شروع کر دیے۔

”سرکار کہاں جائے گا۔۔۔؟“

میں۔۔۔؟ بلدہ جارؤں۔۔۔“ واحد حسین نے ایک شان بے نیازی سے کہا اور پھولوں کے ہار اتارا تار کر کھڑکی سے باہر ”

پھینکنے لگے۔

بلدہ۔۔۔؟“ مفروض احمد چکرائے۔ حیدر آباد کا نقشہ انہوں نے حفظ کر لیا تھا۔ مگر بلدہ کہیں دکھائی نہ دیا۔

”یہ بلدہ حیدر آباد سے کتنے فاصلے پر ہے۔۔۔؟“

جی۔۔۔؟“ واحد حسین نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ بڑی دیر تک دیکھا گئے۔ پھر گردن ہلا کر بولے۔

”کون سے گاؤں سے آرہے ہیں آپ۔۔۔؟ پہلی بار حیدر آباد دیکھیں گے شاید ؟“

”جی ہاں۔۔۔“

مفروض احمد ارادے کنے بغیر جھوٹ بول گئے۔

انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اس شہزادے کی شان میں گستاخی ہوگئی ہے۔

ہم لوگاں حیدر آباد کوئج بلد بولتیں۔“ اور پھر وہ اتنی زور سے جیسے کہ مفروض احمد کو بھی ساتھ دینا پڑا۔“

اس کے بعد واحد حسین نے اپنی امارت اور شان و شوکت کے خاندانی حالات سنانا شروع کئے تو کئی اسٹیشن نکل گئے۔

یہ صابر نواب جانے کن پھٹیچر نوابوں کا حال سنا کر انہیں مرعوب کرتے تھے۔ اصل جاگیر دارونسے تو اب تعارف (ہوا ہے)۔

پھر واحد حسین نے زبر دستی انہیں اپنے خاصے میں شریک کیا۔

حالانکہ مفروض احمد نہیں نہیں کرتے رہے۔ اور اپنے ٹفن میں سے شامی کباب، پوریاں اور سوچی کا حلوہ کھانے کی کوشش کرتے رہے۔

ہمارے بھوئی نے آج جگر کا سالن پکانے میں اتنی دیر کر دی کہ ٹرین کو ایک گھنٹہ لیٹ کرنا پڑا۔“ واحد حسین نے ” لا پرواہی سے کہا۔

جب انہوں نے مفروض احمد کو بریانی کی ترکیب بتائی تو وہ بہت تعریف کرنے لگے۔ جولوگ چاول جیسے معمولی سے اناج کو اتنی عزت دیتے ہیں وہ آدمی کو بھی اونچی جگہ بٹھا سکتے ہیں۔

اس کے باوجود جب واحد حسین نے بریانی والا ٹفن کا ڈبہ ان کی طرف بڑھایا تو مفروض احمد نے ہاتھ سے سر کا دیا۔

”کیوں آپ کھانا نہیں کھاتے۔۔۔؟“

”کھانا تو کھاتا ہوں چاول نہیں کھاتا۔“

چاول۔۔۔! اچھا تو آپ لوگ کھانے کو چانول کہتے ہیں۔“؟

”اور آپ لوگ بڑے کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔“؟

آپ نہیں کھاتے۔۔۔؟“ مفروض احمد نے تعجب سے پوچھا تو واحد حسین نے ان کے گلاس کی طرف بڑھنے والا اپنا ” ہاتھ کھینچ لیا۔ عین اس وقت ایک کنکر نے ان کے منہ میں آکر طوفان برپا کر دیا۔ سارا کمپارٹمنٹ ان کی چیخوں سے دہل رہا تھا۔ اور سارے برتن ایک ایک کر کے باہر جنگل میں پھینکے جاچکے تھے۔

اگلے اسٹیشن پر باورچی کی طلبی ہوئی۔ چپراسی سے اسے تڑا تر جوتے لگوانے کے بعد واحد حسین نے حکم دیا کہ اسے یہیں اتار دو اور اس سے کہو کہ اب بلدہ تک پیدل چل کر آئے۔

مفروض احمد بڑی دیر تک سر باہر نکالے اس بوڑھے باورچی کو دیکھتے رہے جو اپنی زندگی کی ساری مسافت چاولوں کو عزت دینے میں طے کر چکا تھا۔ مگر سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔۔۔ ابھی اسے بلدہ پہنچتا ہے۔۔۔ بلدہ جو ہر غریب کی منزل ہے۔۔۔ ہر امیر کی قبلہ گاہ ہے۔

”خاکسار کو جناب کے اسم گرامی کا علم حاصل نہ ہوسکا۔“

”جی بندے کو نواب واحد حسین خان کہتے ہیں۔ میں پر بھنی میں تحصیلدار ہوں۔“

تحصیلدار۔۔۔؟ مفروض احمد پر غشی طاری ہونے والی تھی۔

اللہ کی مہربانی ہے۔“ واحد حسین نے ہاتھ جوڑ کر ریل کی چہت دیکھی۔

حالانکہ میری سوپشتوں میں کسی نے ملازمت نہیں کی تھی۔“

”مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ ہم جاگیرداروں کو بھی یہ وقت دیکھنا تھا کہ ایسی معمولی سی نوکریاں کرتے پھریں۔

مفروض احمد کو گم سم دیکھ کر واحد حسین نے کہا۔

حیدر آباد میں آپ کو کوئی کام ہے تو بندہ حاضر ہے۔ ایک پیسہ خرچ کئے بغیر ہو جائے گا۔ غریب خانے پر آپ کو ”زحمت دوں گا اور اگر شعر و شاعری کا شوق ہے تو۔۔۔

پھر وہ سگار سلگا کر نیم دراز ہو گئے اور چمکدار بوٹ عین مفروض احمد کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔

”اپنا نام بھی بولیںے ناحضت۔“

”جی خاکسار کو مفروض احمد کہتے ہیں۔۔۔ مجھے سرکار نے صدرالمہامی کے لئے یاد فرمایا ہے۔“

جی۔۔۔؟ جی۔۔۔؟ جی۔۔۔؟ جانے دُنیا الٹ گئی یا واحد حسین پاگل ہو گئے۔ بدحواسی میں انہوں نے کئی قلابازیاں کھائیں۔ کھسیاہٹ کے مارے اپنے ہاتھ توڑ ڈالے۔ فوراً جوتے اتارے اور دستار پہنی۔ جھک جھک کر آداب بجالائے۔

لیکن مفروض احمد بڑی انکساری سے مسکراتے رہے۔ اور بالآخر آہستہ سے بولے۔

مجھے صرف ایک بات کا افسوس ہے کہ خواہ مخواہ صدرالمہامی کے چکر میں پڑا۔ حالانکہ یہاں تو تحصیلدار بنا ”چاہئے۔“

واحد حسین نے ایک آہ بھری اور پچھلے زمانہ کو یاد کیا۔۔۔

کیا کیا لطف اٹھانے زندگی کے۔۔۔! مگر اب دنیا بطیس نے جینے کی اُمید چھین لی تھی۔ ادھر بی بی نے ڈاکٹروں کے کہنے میں آکر ان پر نمک، مرچ، گھی، گوشت، ہر چیز حرام کر دی تھی۔

زمانہ دیکھتے ہی دیکھتے کتنا بدل گیا ہے۔۔۔ جیسے تیز ہوا نے کسی ناول کے اکتھے کئی ورق الٹ دیئے ہوں۔

وہ لنگی باندھے، سپوٹے کے پیڑ تلے، آنگن میں کرسی ڈالے بیٹھے ہیں اور نگاہیں ہر آنے جانے والے پر لگی ہوئی ہیں۔

بسم اللہ بی کو حکم دیدیا گیا تھا کہ بارہ بجتے ہی دو پہر کا کھانا تیار کر دے۔ ادھر چولہے پر سے ہانڈی اتری اور گوہر بیگم نے اہلی ہوئی ترکاریاں، بغیر نمک، مرچ کا سالن اور سادا چپاتیاں ان کے لئے دستر خوان پر رکھ دیں۔ اس کے علاوہ ان کا ہر چیز کا پر ہیز تھا۔ یہاں تک کہ اپنے بنائے ہوئے مربے اور اچار بھی وہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔

اور کیا پکایا ہے۔۔۔؟“ وہ بسم اللہ ہی سے پوچھتے۔“

”جھینگوں کی کڑھی۔۔۔ امباڑے کی بھاجی۔ بگن۔“

تو جھینگوں کی کڑھی میں اتنا نمک کیوں ڈالتی ہے۔۔۔ دیکھو آج کتنا نمک ہے۔۔۔؟“

پھر وہ دوچار بیگن چکھتے۔ ذرا سی کڑھی کھاتے۔۔۔ دو ایک بوٹیوں کو چبا کر دیکھتے کہ گوشت گلا ہے یا نہیں۔ اس طرح کہ بی بی اور راشد کے کانوں کان خبر نہ ہو جائے۔ کیوں کہ جب کبھی ان کی طبیعت خراب ہوتی تھی تو سب کو وہ بگہارے بیگن یاد آ جاتے تھے۔ کھانا کھا کر اٹھے تو پھر آ بیٹھے سگار دھنکنے۔ ان کے پاس ہی فرش پر لنگڑی پھوپو آ بیٹھیں۔۔۔ لیجنے حالات حاضرہ پر تبصرہ شروع ہو گیا۔ واحد حسین خاصے تعلیم یافتہ تھے۔ مگر گوہر بیگم سے بات کرتے وقت بالکل سلا و بن جاتے تھے۔ اپنے خاندان کی ضد اور کمزوریوں کی حکایتیں فخریہ بیان کی جاتیں۔ ذات اور ہڈی کے جوڑ کے بکھان ہوتے۔ اپنے خود سر اور روایت شکن رشتے داروں کی ہنسی اڑائی جاتی۔ واحد حسین خاندان میں لگائی بجھائی کرنے میں مشہور تھے۔ دنیا بھر کے چھوٹے موٹے مقدموں کا فیصلہ اب ان کی عدالت میں ہوتا تھا۔

کبھی ان کی بھالاجا بیگم چلی آرہی ہیں میاں کی شکایتوں کا پلندہ لیے۔ کبھی منجھلی ممانی کی بہو اپنی ساس کی زیادتیاں سنا رہی ہیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے رشتے ملانے جارہے ہیں۔ کوئی قیصر کی خودسری کے قصے سنا رہا ہے۔ اور وہ اس میں مزید کلیاں پھند نے ٹانک رہے ہیں۔ ہر شخص کی زبان پر واحد حسین کی تعریف تھی اور ان کے دشمنوں کی برائیاں۔

یہی وجہ تھی کہ گوہر بیگم سے ان کی خوب گھٹتی۔۔۔ اور گوہر بیگم کو بھی جب گھر کے کام دھندے سے چی اوب جاتا تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھی گپیں ہانکا کرتی تھیں۔ ایسے وقت بھی ان کی نظر گھر کے چاروں کونوں تک جاتی تھی کہ کون بچہ کیا شرارت کر رہا ہے۔ کون سی چیز بے جگہ پڑی ہے اور کون سا نوکر کام کرنے کی بجائے خالی ہاتھ بیٹھا ہے بچوں کا ان کی صورت دیکھ کر دم نکل جاتا تھا۔ سوائے غزل کے۔۔۔ کیوں کہ سب کو طاق میں بیٹھانے والی پھوپو کو غزل نے طاق نسیاں کر دیا تھا۔

پھر بھی بچوں کو لنگڑی پھوپو بری نہیں لگتی تھیں۔ خصوصاً جمعرات کے دن تو ان کی ہر بات بڑی میٹھی میٹھی لگتی تھی۔ اور اس دن سب بچے ان کے اردگرد منڈلانے لگتے تھے۔ کیوں کہ جمعرات کے دن لنگڑی پھوپو پانچ روپے کی مٹھائی منگوا کر کوئی عمل پڑھا کرتی تھیں۔ رضیہ کہتی تھی کہ گوہر بیگم کو بھی اپنی شادی کی آس ہے یہ عمل انہیں یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں کسی طوائف نے بتایا تھا اور اس بات کو وہ خاص طور سے سارے گھر سے چھپاتی تھیں۔ کوئی پوچھا تو کہہ دیتیں کہ اپنے ماں باپ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ کرتی ہیں۔

چوری چھپے مٹھائی لانے کی ذمہ داری شیخو میاں نے لے رکھی تھی۔ شاہین اگر بتیاں سلگاتا۔ فوزیہ اور غزل مل کر مٹھائی کے الگ الگ حصے تقسیم کرتے تھے۔ شیخو میاں سب سے پہلے مٹھائی کے حصہ دار بنتے۔ یوں بھی لنگڑی پھوپو کو ساری دنیا کے مارے لتاڑے شیخو میاں کا بہت خیال رہتا تھا۔ شیخو میاں لنگڑی پھوپو کے دور کے کوئی بھائی لگتے تھے۔ مگر انتہائی آوارہ، بد چلن، شرابی اور جاہل لٹھے تھے۔ اس کے باوجود لنگڑی پھوپو نے ان کا گھر بسانے کی بے شمار کوششیں کیں۔ اچھے گھرانوں کی لڑکیاں نہ ملیں تو غریب غریب میں تلاش جاری رکھی۔ مگر لوگوں کو جانے کیا ہوا تھا کہ کوئی اپنی بیٹی شیخو میاں کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ گوہر پھوپو کا خیال تھا کہ ایسے بدچلن مرد شادی کے بعد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ بے چارے کی زندگی سدھر جاتی۔

چوتھے پانچویں دن کہیں سے چھپاتے چھپتے شیخو میاں آ جاتے تھے اور کئی کئی دن باہر نوکروں والی کو ٹھہری میں پڑے رہتے۔ بچوں کے ہاتھ کھلا بھیجتے تھے۔

گوہر آپا سے کہو تین دن سے بھوکا ہوں۔

اور گوہر آپا بھائی کی فاقہ کشی پر ترس کھا کر فوراً ترے میں کھانا۔۔۔ سجانے لگتی تھیں۔

واحد حسین اور راشد کو شیخو میاں کی آمد قطعی نہ بھاتی تھی۔ کیا معلوم رات کو پھاٹک کھول کر غنڈوں کو اندر گھسالیں۔ کوئی چیز لے کر چمپت نہ ہو جائیں۔

یہ بات نہ تھی کہ شیخو میاں کوئی بھیک منگے چور اچکوں کے خاندان سے تھے۔ ان کے باپ دادا کی کافی جائداد تھی۔ جو شیخو میاں کے والد نے اور ان کے بعد خود انہوں نے تباہ کر دی تھی۔ جب تک گوہر آپا کے ماں باپ زندہ تھے۔ شیخو میاں کے روٹی کپڑے کا کچھ نہ کچھ انتظام کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے گوہر بیگم اب بھی اس چھوٹے بے سہارا بھائی کا پیٹ بھرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔

ایک بار تو وہ بڑی دھوم دھام سے شیخو میاں کیلئے ایک گڑیاسی دلہن بیاہ لائی تھیں۔ جسے ایک ہی برس میں انہوں نے کھا پی کر ختم کر ڈالا۔ پھر شیخو میاں اپنی پسند سے خود ایک دلہن کہیں سے ڈھونڈ لائے۔ وہ ابھی دلہن کو چکھنے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے خود شیخو میاں کو نگلنا شروع کر دیا۔ گوہر بیگم سب کو رو رو کر سناتی تھیں۔ کہ ذرا سی بات نہ ماننے پر وہ جوتا اٹھا کر شیخو میاں پر پل پڑتی تھی۔ دو چار برس کی کوششوں کے بعد کہیں جا کر شیخو میاں اس سے نجات حاصل کر پائے۔ اب انہیں پھر بیاہ رچانے کا ارمان تھا اور اس آنے والی دلہن کے فراق میں وہ دیوداس بن چکے تھے۔ رات دن نشے میں دھت ادھر ادھر لڑھکتے پھرتے۔۔۔ صبح بستر سے اٹھنے کے بعد سر اور ابرو سے لے کر سارے بدن کے رونگٹے استرے سے صاف کر ڈالتے۔ پھر کسی کونے میں لنگی باندھے اپنی گنجی چند یا پر ہاتھ پھیرا کرتے۔ سیاہ بجھے ہوئے چہرے پر سرخ آنکھیں دیوں کی طرح ٹمٹماتیں اور پھپوندی لگے سیاہ دانت ہمیشہ میل کے جھاگ میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کی شخصیت بچوں کے لئے بڑی دلچسپ تھی۔ کیوں کہ وہ جس وقت نشے میں نہ ہوتے تو بچوں کو جنوں اور بھوتوں کی عجیب و غریب کہانیاں سناتے تھے۔ اور نشے میں ہوتے تو ان کی گالیوں کی بھر مار ہواؤں سے لڑنے کا انداز اور رونے اور گانے کا موڈ بچوں کے لئے ایک کھیل بن جاتا تھا۔ اسی لئے شاہین، فوزیہ، چاند اور قیصر سب ہی بچے انہیں گھیرے رہتے تھے۔ مگر غزل کو انہیں دیکھ کر بکائیاں آنے لگتی تھیں۔

شیخو میاں کی تعلیم اتنی تھی کہ اپنا نام لکھ لیتے تھے۔ ایک بار ملازمت کے لئے انٹرویو دینے گئے تو انہوں نے ”اپنے نام کے بجے یوں کی۔۔۔“ ش و پیش شوغ۔۔۔ دال و اواد پیش دغ۔۔۔ شیخ داؤد ۔

کبھی کبھی وہ اپنی قابلیت کا ثبوت دینے کے لئے بچوں کو پڑھانے آ بیٹھتے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بی۔ اے تک پڑھے ہوئے ہیں لیکن امتحان دینے کی فرصت نہیں ملتی۔ شاہین کی ”کنگ پرائمر“ کھول کر وہ بڑے انہماک سے فوٹو دیکھتے اور پھر بچوں کو منتظر پا کر پوچھتے۔

”اچھا بتاؤ انگریزی میں مرغی کو کیا بولتیں۔۔۔؟“

مر غی“ غزل کہتی۔ ”

بین ، بین۔۔۔“ شاہین چلاتا۔ ”

”ہشت۔ تم سب کے سب جاہلاں ہیں۔ ”

ایک۔“ فوزیہ کہتی۔ ”

بین، بین۔۔۔ یہ دیکھنیے۔۔۔“ شاہین فوٹو دکھاتا۔ ”

دیکھو بیٹا تم ایمان سے بول رنیں نا ؟ و و مشتبہ نظروں سے گھورتے۔ ”

جی ہاؤ۔۔۔“ شاہین گردن ہلاتا۔ ”

اچھا تو اب آگے بڑھو۔۔۔“ وہ اطمینان سے ورق الٹتے۔ ”

انہیں شاعری کا بھی ضبط تھا۔ خوب جھوم جھوم کر اپنی غزلیں پڑھتے تھے۔ اور بڑے فخر کے ساتھ لوگوں کو سناتے تھے کہ وہ واحد حسین کے شاگرد ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے غزلوں کا ایک پلندہ واحد حسین کی میز پر رکھ جاتے تھے مگر واحد حسین غصے میں آجاتے۔

”ایک مصرعہ وزن میں نہیں لکھتا جاہل۔۔۔ جانے کیا اول فول بکتا ہے۔ ”

رات کو جب وہ لڑکھڑاتے ہوئے آتے تھے تو کسی دیوار کو تھام کر بچوں کے ہجوم سے پوچھتے۔ ”

”بچو۔۔۔ تم نے کبھی سیندھی پی ہے۔۔۔ !کبھی مت بیٹا۔ اللہ میاں خفا ہو جاتے ہیں اور ساری دنیا منہ موڑ لیتی ہے۔۔۔ ”

پھر وہ نوکروں والی کسی کوٹھری میں ننگے فرش پر ڈھیر ہو جاتے تھے۔۔۔

ا رے کوئی پانی پلا دے۔“ اکثر شیخو میاں چلائے جاتے مگر کوئی نہ سنتا۔ بچوں کو ان کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا ” تھا۔

ایک بار ان کی کراہیں سن کر غزل کو ترس آ گیا تھا۔ وہ پانی کا گلاس لے کر ان کے سرہانے پہنچی تو انہوں نے گلاس تھام کر کہا۔

”یہ کون بیٹی تھی۔۔۔؟ اللہ اسے بڑا خوبصورت دولہا دینگا محلوں کی بیگم بنے گی۔ ”

سیندھی کا رنگ سفید ہے

عاشقوں کے لئے مفید ہے

وہ اپنی غزل گانے لگتے۔

اس بات پر فوزیہ نے غزل کو خوب بنایا۔

غزل کو خوبصورت دولہا چاہیے اس لئے شیخو میاں کو پانی پلاتی ہے۔

اس لئے غزل بی بی کے ہاں آتی تھی تب بھی شیخو میاں کی طرف بالکل نہ جاتی۔ بلکہ اسے تو بی بی کے گھر سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

ایوان غزل ”تو انگاروں بھری تھالی تھا۔ جس چیز کو ہاتھ لگاؤ سارا گھر ہیں ہیں کر کے دوڑ پرتا۔ اسی لئے تو ایاز“ اور شہزادہ بھی نہ آتے تھے۔

غزل کو دیکھتے ہی رضیہ اپنی اسپرنگ والی مسبری سے اٹھ بیٹھتی تھی۔ واحد حسین فوراً اپنے درختوں کی حفاظت کے لئے آنگن میں کھڑے ہو جاتے۔ گو ہر پہو پو ساری بکھری ہوئی چیزوں کی اٹھا دھری شروع کر دیتیں۔ فوزیہ اور شاہین اپنے کھیل کھلونے چھپاتے پھرتے۔

پھر نانا حضرت سب سے پہلے اس کا منہ دھلواتے۔ دانت مانجھنے کا حکم دیتے۔ پھر سو تک گنتی گنے کا حکم۔ غزل کو سخت تعجب ہوتا کہ نانا حضرت اتنی جلدی گنتی بھول کیسے جاتے ہیں۔ ان کے پہاڑ سے بدن، سرخ آنکھوں اور جھاڑو کی طرح ہلتی ہوئی داڑھی سے غزل کو بڑا ڈر لگتا تھا۔

اماں اماں نا نا حضرت کی داڑھی ہلتی کیوں ہے۔“ ایک دن اس نے پوچھا۔

چپ چپ۔۔۔ نانا سن لیں گے۔“ اس کی ماں نے ڈانٹ دیا۔

تو کیا نانا نے اپنی داڑھی کبھی نہیں دیکھی؟“ اس نے تعجب سے سوچا۔ لیکن گھر میں بھی کیا سکون تھا۔

جب کبھی ہمایوں اور بتول میں لڑائی ہوتی تھی تو ساتھ میں غزل کو بھی پسنا پڑتا۔ اماں کو بچانے کی کوشش میں دو چار لائیں اس کے اوپر بھی پڑ جاتی تھیں۔ پھر سارا بچا کچھا غصہ بھی ابا اس پر اتارتے تھے۔ ایسے وقت ایاز اور شہزادہ دور کھڑے تماشہ دیکھتے تھے اور چپکے سے کہیں سٹک جاتے۔ یوں بھی وہ بیٹھے پر کبھی نہ روتے۔ ادھر ابا ان پر لاتوں گھونسوں کی بارش کر کے بیٹھے۔ ادھر وہ کبھی کبھی ہنسنا شروع کر دیتے تھے۔ حالانکہ بھائیوں کے بیٹھے کا یہ منظر غزل کو گھنٹوں رلائے جاتا تھا۔ ہمایوں کی دلچسپی اب بیوی بچوں سے زیادہ گھر کی کرسٹن سایا سے ہو چکی تھی۔ آفس سے آتے ہی سایا، ہمایوں کے لئے چائے لے کر کمرے میں جاتی تھی تو پھر رات کو ہی دروازہ کھلتا۔

تو بہ ابا کتنی دیر میں چائے پیتے ہیں۔“ غزل دروازہ کھلنے کے انتظار میں بیزار ہو جاتی تو اماں اسے مار نے دوڑ“ تھیں۔

”خبر دار جو پھر ایسی بات کہی۔۔۔ تجھے ان باتوں سے کیا واسطہ؟“

یوں لگتا جیسے اماں کو خود بھی ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سلگے جاتی تھیں۔

ہر بار جب ہمایوں مار پیٹ کر بتول کو پیسے لانے میکے بھیج دیتا تھا تو اس بات کی خبر واحد حسین کو بالکل نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن ایک دن فوزیہ کے مقابلے میں اپنی مظلومی کا احساس دلانے کے لئے اس نے اپنی پیٹھ پر زخم کا نشان دکھا کر نا حضرت سے کہد یا کہ اماں کو بچاتے وقت با کی لات اس کی پیٹھ پر لگ گئی تھی۔

اس دن سارا گھر تہہ و بالا ہو گیا۔

غزل نے بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا کہ نانا حضرت تھر تھراتے ہوئے ہاتھوں سے زنگیائی ہوئی بندوق کو صاف کر رہے ہیں اور اماں کا سسکیوں سے کانپتا ہوا بدن رضیہ ممانی پکڑے بیٹھی تھیں۔ اس دن سب ہی نے باری باری حسب استطاعت غزل پر لعنت بھیجی کہ اس نے نانا حضرت کو اپنی پیٹھ کا زخم کیوں دکھایا تھا۔ سوائے چاند کے جو ساری دنیا سے بے تعلق بنی جانے کیوں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی روئے جارہی تھی۔

غزل منہ تھتھانے، ممانی بیگم کے اجلے بستر پر میلی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ناک کو انگلی سے گھنگھولتی رہی۔ ایسے وقت رونا مصلحت کے خلاف تھا۔ کیوں کہ میں ممکن تھا کہ اماں کو پھر جلال چڑھتا۔ وہ تو اپنی تمام محرومیوں کا بدلہ بچوں کو مار کے لیتی تھیں۔ ادھر رضیہ کو غزل ایک آنکھ نہ بھاتی۔ وہ غزل کو یوں دیکھتی تھیں۔ جیسے غلاظت بھری موری دیکھ رہی ہوں۔ حالانکہ خود ان کے بچے بھی کوئی ایسے صفائی پسند نہ تھے۔ فوزیہ دن بہ دن نک چڑھی بنتی جارہی تھی۔ غزل کو دیکھ کر اپنی فراک یوں بجاتی جیسے کونلوں سے بھری گاڑی گزر رہی ہو۔ شاہین تو نرا بے وقوف تھا۔ تیزی اور پھرتی تو اسے چھو کر نہ گئی تھی۔۔۔ ہر بات اماں سے پوچھ کر کرتا۔ اماں کی اجازت کے بغیر نیچے گری ہوئی کیری تک نہیں اٹھاتا تھا۔

ادھر ممانی بیگم کا اصرار تھا کہ اس احمق لونڈے کو غزل، شاہین بھائی کہہ کر پکارے۔

پھر بھی محض اللہ واسطے میں غزل نے فوزیہ اور شاہین کو چند بے مصرف چیزوں کا استعمال سکھادیا تھا۔ مثلاً کچی نارنگیاں اور گلاب کے پھول اگر توڑ کر ملیا کے بچے کو دید نیے جائیں تو بدلے میں وہ ڈبا بھر بھر کے بیر بہوٹیاں دیتا ہے۔ راشد کی ٹانیاں ”چور پولیس“ کھیلنے میں بطور ہتھکڑی استعمال ہو سکتی ہیں۔ ممانی جان کی لپ اسٹک سے باتھوں اور ناخنوں پر مہندی لگانے کے علاوہ دیوار پر پینٹنگ بھی کی جاسکتی ہے۔ چاند آپا کی ٹوتھ کریم دانتوں پر لگا کر تھوکنے کی بجائے کھانے کی چیز ہے۔ غزل کئی بار ہاتھ روم بند کر کے ٹوتھ کریم کو کھایا تھا۔ خوب میٹھی میٹھی انس کریم کے مزے کی تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ عقل کے کورے احمق شاہین کو جوئی ترکیب بتائی وہ فوراً مشورہ لینے اپنی امی کے پاس پہنچ جاتے۔

امی ہم الماری کا شیشہ توڑ کے بسکٹ نکال لیں۔۔۔؟“

امی کی قبر آلود نظریں دیکھ کر وہ سہم جاتا۔

”غزل کہہ رہی ہے۔“

یہ سن کر اندر منہ لپیٹے ہوئے بتول اٹھ کر آئی اور غزل کی پیٹھ پر تابڑ توڑ کے برسے لگتے۔

بی بی کے گھر آنے سے پہلے اماں اس سے نیک چلن بننے کے بہت سے وعدے لے لیتی تھیں۔ اور غزل انہیں پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتی۔

”جب کہیں ٹھکانا نہیں ہے تو اللہ موت کیوں نہیں دے دیتا؟“

اسے مارتے مارتے تھک کر اماں یوں رونے بیٹھ جاتیں جیسے سارے گھونسے ان کے دل پر پڑے ہوں۔

اس لئے غزل کو اپنا ہی گھر پسند تھا۔ جہاں تینوں بھائی بہن مل کر خوب مار کٹائی کرتے۔ اماں چاروں طرف کی آفتیں سہتے سہتے سوکھ کر بلدی کی گرہ بن گئیں تھیں۔ بی بی بتول کو دیکھتیں تو چھپ چھپ کر روتی تھیں۔ اللہ نے ان کی بیٹیوں کے نصیب بھی کیسے اجاڑے۔ اب اس کے ہاتھ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ اس کے ہاتھوں کی مار غزل کے موٹے تازے بدن پر ذرا بھی نہ گئی تھی۔ لیکن جب اماں آپ بی آپ رونا شروع کرتیں تو غزل، ایاز اور شہزاد کی طرح اماں کا منہ چڑانے کے بجائے ان کے گھٹنے سے لگ کر خود بھی بسور نا شروع کر دیتی تھی۔

دن بھر خوب دھما چوکڑی ہوتی۔ مگر شام کو ابا دفتر سے آتے تو سب کونوں میں دبک جاتے تھے۔

سنسان دو پہریوں میں جب اماں سو جاتی تھیں تو غزل کو اپنے وجود کا احساس ہوتا۔ ساری کائنات اپنے قبضے میں آجاتی۔ اس وقت کوئی اس کے ساتھ نہ ہوتا۔ وہ جی بھر کے من مانی شرارتیں کرتی تھی۔ سب ممنوعہ چیزوں کی اٹھا دھری ہوتی اور دماغ اس آزادی کو محسوس کر کے تمنا جاتا تھا۔

پھر چپکے سے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی تھی۔ یوں ہی باہر دیکھنے کے بہانے سارے محلے کا ایک چکر لگا آتی۔ گرمی کی دوپہر میں سمٹ کی گرم سڑک پر ننگے پاؤں چلنے سے وہ فرحت حاصل ہوتی جس سے لوگ کشمیر کی وادیوں

میں جا کر بھی محفوظ نہیں ہو پاتے۔ وہ اماں اور ابا کی سب مار بھول جاتی تھی۔ کبھی جی چاہتا کہ بچے پکڑنے والا جادو گر ا سے بھی اٹھا کر کسی جادو کی نگری میں لے جائے۔ وہاں بیرے جواہرات کے ڈھیر ہوں۔ وہ سارے بیرے جواہرات اٹھا کر بھاگ جائے۔ ان ہیروں کو بیچ کر ایک سرخ چمکیوں والا کرتا خریدیں گے۔ اور کلیجی بھون کر کھا ئیں گے۔ جیسی کلیجی ایک دن رضیہ ممانی نے پکائی تھی۔ پھر تو ابا اسے مارنا چھوڑ دیں گے۔۔۔ انہیں بیرے جھاڑ نے پوچھنے سے فرصت ہی کہاں ملے گی کہ غزل کی ٹھکانی کریں۔۔۔ فوزیہ جھوٹ کہتی ہے کہ اس کے ڈیڈی اسے کبھی نہیں مارتے۔ غزل کو اس جھوٹ پر کبھی یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن بی بی کے ہاں اسے عجیب و غریب تماشے نظر آتے تھے کہ ماموں فوزیہ کو ہاتھوں پر اچھال اچھال کر پیار کر رہے ہیں اور رضیہ ممانی سے الجھ رہے ہیں کہ اگر شاہین آج شوز کے بجائے سینڈل پہن کر اسکول جانا چاہتا ہے تو زبردستی کیوں کر رہی ہیں۔ شاہین اپنے ڈیڈی کے سامنے خوب قہقہے لگاتا۔ اور ماموں جان اسے ہنسنا دیکھ کر ابا کی طرح مارنے کی بجائے خود بھی ہنسنے لگتے تھے۔

ڈیڈی ہم سے یہ سوال حل نہیں ہوتا۔“ فوزیہ بڑے ناز سے کاپی پھینک دیتی تھی۔“

لاؤ ہم سمجھا دیں۔۔۔“ ماموں جان جھک کر کاپی اٹھا لیتے تھے۔“

غزل میں اور فوزیہ میں صرف چند مہینے کی چھوٹائی، ہوائی تھی اس لئے فوزیہ کی ہر بات کی نقل کرتا اس پر لازم تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے ابا کو خوش کرنے کی ٹھان لی۔

ابا!۔۔۔ ہم سے یہ سبق یاد نہیں ہوتا۔۔۔“ اس نے کاپی ابا کے سامنے پھینک دی۔ ا

چھا ٹھہر ابھی یاد کراتا ہوں۔“ وہ چھڑی لے کر پل پڑے تھے۔“

وہ چاہے اپنی سریلی آواز میں کتنے ہی میٹھے بیٹھے گیت گائے۔ چاند آبا کی طرح بن بن کر اپنے سلیقے اور صفائی کا کیسایا مظاہرہ کرے لیکن اماں کو بھی اس پر پیار نہ آتا تھا۔

وہ دن رات منہ لپیٹے پڑی رہتی تھیں۔ کبھی اچانک اٹھ کر بیٹھتیں اور کعبہ شریف کے فوٹو پر سے ساری کا پلو پھیر کر گر دصاف کرنے لگتیں۔ لیمو اور مٹھائی کھاتے دیکھ کر سب ہی کہ منہ میں پانی آتا ہے مگر کسی بچے کو اس کی ماں سے پیار کرتے دیکھ کر غزل کی تو جیسے بھوک بھڑک اٹھتی تھی۔ اس رات دو بہت سے خواب دیکھتی۔ جیسے وہ بھی ممانی بیگم کی طرح چم چم کرتی ساری پہنے، ہونٹوں کو سرخی لگائے کہیں جارہی ہے۔ پھر اچانک اماں جھانسی کی رانی بن جائیں (جیسی ایک بار ڈرامے میں چاند آبا بنی تھیں) اور پھر اسے اٹھا کر کلیجے سے لگا لیتیں۔ خوب جی بھر کے پیار کرتیں کہ وہ تھک کر چور چور ہو جاتی۔ آنکھ کھلتی تو اسے وہ منحوس کپڑے یاد آتے جو اماں نے اپنے کنوارپنے کے زربفت والے پاجامے اور جارجٹ کی ساری کو کاٹ کر بنائے تھے۔ اماں کے نزدیک یہ کپڑے ابھی اتنے قیمتی تھے کہ بس چلتا تو غزل کے جہیز کے لئے اٹھا رکھتیں۔ مگر اس نے جان جان کر اتنے کھونچے لگائے ، یوں ریس ریس کر پہنے کہ ممانی بیگم نے انہیں اپنی الماری میں رکھنے سے انکار کر دیا۔

جانے کیسی بدبو آ رہی ہے ان کپڑوں سے۔ بہت گندے ہو گئے ہیں۔ اب انہیں گھر لے جا کر اپنے صندوق میں ” رکھو۔“ ممانی بیگم نے کپڑے اٹھا کر پلنگ پر پھینکے تو وہ زمین پر گر پڑے۔ غزل کا کلیجہ پھٹ گیا۔

”ہم تو آپ کی الماری میں رکھیں گے یہ بھاری جوڑا۔ کہیں جانا ہوتا گھر کیسے جائیں گے کپڑے لینے۔“

میں نہیں رکھوں گی۔۔۔“ ممانی نے ناک سکیڑ کر کہا۔“

اتنی بڑی ہوگئی اور کپڑے پہنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ ایک ہماری فوزیہ ہے۔ کیا مجال کبھی سفید فراک پر ایک دھبہ تو ” لگا لے۔ یہ بھاری تو بس ، ” الف لیلہ“ کی شہزادی ہی ہیں۔ آتا جاتا کچھ نہیں۔

خیر۔۔۔ بعد کو اس کی بسم اللہ ہوئی تو صرف بی بی نے ہی اس دن کو یا درکھا۔ اماں اور ابا کو تو خیر بھی نہ تھی کہ آج غزل کی بسم اللہ کا دن ہے۔ لیکن شام کو بی بی آئیں۔ ایک دیگ میں بریانی اور دوسرے کھانے چار کشتیوں میں مٹھائی اور پھول اور ایک سرخ ساٹن کا پاجامہ، سرخ کامدانی کا ڈوپٹہ اور سرخ چمکیوں والا کرتا۔ اس جوڑے کو غزل نے اٹھا کر دل میں رکھ لیا۔ جی چاہتا پل بھر کو اپنے بدن سے جدا نہ کرے۔

یہ جوڑا اس نے عید کے دن بھی پہنا اور بقر عید کے دن بھی۔ فوزیہ کی گڑیا کی شادی میں اور پھر چاند آبا کے ساتھ ڈراما دیکھنے جاتے وقت۔ پھر جب شاہین اور اس کے دوستوں نے ”ایوان غزل“ میں بچوں کا مشاعرہ کیا تو غزل نے نانا حضت کی لکھی ہوئی غزل یہی کپڑے پہن کر سنائی۔

سارا گھر بچوں کا یہ تماشہ دیکھنے اکٹھا ہو گیا تھا۔ گو ہر پھولو کا تو ہنستے ہنستے برا حال تھا۔ شاہین تو بالکل دادا حضت کی کاپی کر رہا تھا۔ ویسے ہی چیخ چیخ کر شعر پڑھے۔ اسی طرح اپنے مصرعوں پر خودی جھوم رہا تھا۔ فوزیہ البتہ گھڑی گھڑی شرمائی جاری تھی اور ساری غزل بھول بیٹھی تھی مگر غزل نے چاند آبا کی پوری پوری کاپی کی۔ ان ہی کے ترنم میں ان ہی اداؤں کے ساتھ چاند آبا کے کئے ہوئے میک اپ میں جب وہ غزل پڑھنے اٹھی تو رضیہ نے ناک سکوڑ کر راشد سے کہا۔

تصویروں میں بیٹھے ہوئے آپ کے دادا لکڑ دادا آج تو سب غزل کی اداؤں پر نثار ہوئے جارہے ہیں۔“ بازاری ادا ئیں ” اس چھوڑی نے ابھی سے کہاں سے سیکھ لی ہیں۔

راشد نے غور کیا۔۔۔ واقعی ”ایوان غزل“ کی دیواروں پر سنہرے فریموں میں بند سارے شاعر آج جیسے کھلے جارہے تھے۔ ایک زمانے بعد انہوں نے ایک نوخیز فتنے کو یہاں حشر اٹھاتے دیکھا تھا۔ ورنہ اس ایوان میں رات کبھی نہ آتی تھی۔ کیوں کہ رات ہوتے ہی پیمانہ بکف ساقی یہاں طلوع ہوجاتا تھا۔

اس دن چاند نے غزل کو اپنے خوشبودار کپڑوں سے لگا کر خوب پیار کیا۔۔۔“ شاباش کتنی اچھی ایکٹنگ کی ہے تم نے۔۔۔“ میں تمہیں ڈراموں میں چھوٹے چھوٹے رول دیا کروں گی۔

مگر اماں اور ابا حسب عادت اس دن بھی منہ بسورتے رہے۔

ابا ایاز اور شہزاد کے لئے تو کبھی کبھار کپڑے بھی لاتے تھے اور کھانے کی چیزیں بھی لاتے کیوں کہ وہ لڑکے تھے۔ اور ہمایوں کو یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ ”الف لیلہ“ میں اس کی کھوئی ہوئی قسمت کا ستارا ڈھونڈ لائیں گے۔ اس لئے وہ اپنے بیٹوں کو بہت چاہتے تھے۔ ان پر کوئی سختی نہ کرتے۔ ان کی ہر بد تمیزی کو نظر انداز کر جاتے تھے۔ لیکن غزل سے انہیں بے حد نفرت تھی۔ ہمایوں کو اپنی ماں کی بات یاد تھی کہ مرشدوں کو بیٹی راس نہیں آتی۔ اور وہی ہوا۔ جس دن غزل پیدا ہوئی اسی دن سے ”الف لیلہ“ پر نحوست کے بادل چھائے۔ مسکین علی شاہ کی موت جو ہمایوں کی قسمت کے بند دروازے کھولنے والی تھی۔ اس کے نصیبوں کے سارے پٹ بند کر گئی۔ وہ ”الف لیلہ“ سے نکل کر ڈیڑھ سو روپیہ کی کلر کی کر رہا تھا۔ اور ایک دائم المریض بدقسمت بیوی کو بھگت رہا تھا۔ ایک منحوس بیٹی کو روٹی کپڑا دے رہا تھا۔ جس نے اپنے باپ کو اجاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

لیکن غزل کے دونوں بھائیوں کو اپنی برتری کی خبر ہی نہ تھی۔ اسکول سے آتے ہی وہ ضد شروع کرتے اور ایک ایک چوٹی لئے بغیر وہ اماں کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ چوٹی ملتے ہی وہ دنوں سینما دیکھنے بھاگ جاتے۔ صبح اٹھ کر وہ ناڈیا اور جان کا وس کی نقل میں لکڑی کی تلواریں لیے دیواروں پر کودتے پھرتے۔ اماں کی ساریوں کے دوشالے بناتے اور پلنگ کھڑے کر کے گھوڑے تیار ہو جاتے۔ ایاز گیارہ برس کا تھا اور شہزاد بارہ برس کا۔ مگر وہ دونوں اپنی عمر سے بہت بڑے دکھائی دیتے تھے۔ اونچے پورے۔۔۔ صحت مند۔۔۔ ہمایوں کے سارے بچوں میں اپنے دادا کی خوبصورتی اور کشش آئی تھی۔ ہمایوں کی اماں کہتی تھیں غزل کی آنکھ میں وہی موبنی ہے جو مسکین علی شاہ کو عورتوں میں مقبول بنائے ہوئے تھی۔ وہی سرخ و سفید طباق ساچہرا۔۔۔ وہی بھیگی بھیگی۔۔۔ نیم وا آنکھیں۔۔۔ ویسے ہی گم سم۔۔۔ اپنے آپ میں مست۔۔۔ کاش یہ بچی اپنے دادا کی تقدیر بھی لاتی۔

ایک دن غزل آنگن میں پلنگ پر بیٹھی اماں سے سیپارہ پڑ رہی تھی کہ ہاتھ میں تلوار لئے شہزاد ہم سے کودا اور غزل کو ایک ہاتھ میں اٹھا کر پلنگ پر چڑھ گیا۔ پھر اس نے دوسرا ہاتھ اٹھا کر جان کاؤس کے انداز میں نعرہ بلند کیا۔۔۔

ہائے۔۔۔

ایوان میں رات کبھی نہ آتی تھی۔ کیوں کہ رات ہوتے ہی پیمانہ بلف ساقی یہاں طلوع ہو جا تا تھا۔ اس دن چاند نے غزل کو اپنے خوشبو دار کپڑوں سے لگا کر خوب پیار کیا۔۔۔“ شاباش کتنی اچھی ایکٹنگ کی ہے تم نے۔۔۔ میں تمہیں ڈراموں میں چھوٹے چھوٹے رول دیا کروں گی۔“ مگر اماں اور ایا حسب عادت اس دن بھی منہ بسورتے رہے۔

انداز میں نعرہ بلند کیا۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔

پہلے تو غزل کچھ نہ سمجھی۔۔۔ یوں لگا جیسے چیل بوٹی سمجھ کر اسے لے اڑی ہو۔ پھر وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو پڑی۔ مگر دونوں بھائی خوشی کے مارے مارے جارہے تھے۔

”گجو آج ہم نے تجھے ناڈیا بنادیا۔ جان کاؤس فلم میں اسی طرح ناڈیا کو اٹھاتا ہے۔“

نکو میں ناڈیا نہیں بنتی۔ معلوم ہے ناڈیا کو اللہ میاں دوزخ میں جلائیں گے۔“ اسے اماں کی نصیحت یاد آتی۔“

مگر دوسرے دن وہ پھر تھرتھر کانپتی۔ شلوار کے پائینچے اٹھائے آنگن میں منتظر کھڑی تھی کہ کب شہزاد دیوار سے تلوار ہاتھ میں لئے کو دے اور اس کی کمر پکڑ کے پلنگ کی طرف اڑ جائے۔ وہ بھائیوں کی اس توجہ پر منہ لگانی ڈومنی کی طرح اترائی اترائی پھرنے لگی۔ اپنی اس قدر دانی کے آگے وہ فوزیہ پر رشک کرنا بھی بھول گئی۔ اپنے دونوں بھائیوں کو وہ فلم کے ہیرو سے بھی بڑا بہادر آدمی بجھتی تھی۔ شاہین بچارا تو لان میں اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کر ہی خوش ہو لیتا ہے۔ مگر اس کے بھائی کیسے بہادر تھے۔ ان کے فولادی مکے اور ناقابل برداشت لاتیں اور کڑوی نا انصافیاں بھی وہ ہنس ہنس کر سہے جاتی تھی۔ اپنی جانب اٹھنے والی ہر نگاہ کو وہ بڑے غور سے دیکھتی تھی۔ غزل کی چھٹی حس نے اتنی ہی سی عمر ہی میں اسے محبت اور نفرت کی نگاہ کو محسوس کر لینا سکھا دیا تھا۔ وہ اپنی جانب محبت سے دیکھنے والی نگاہ پر سات خون معاف کر دیتی تھی۔ کیونکہ ایسی نگاہیں بہت کم ملتی تھیں۔ اس شخص کے سارے عیب پر لگا کر اڑ جاتے تھے۔ پھر وہاں امید کی ایک کرن پھوٹتی۔ ایک پتا سراٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا اور اپنی گردن زیادہ لمبی کر دیتا تھا۔ پھر ایک پنکھڑی پنکھ کھولتی۔ اور ایک بیل غزل کی رگ رگ کو جکڑ لیتی۔

کل دو پہر سر میں جوئیں دیکھتے وقت اماں نے اسے بے شمار نصیحتیں کی تھیں وہ غزل کو رہ رہ کر یاد آرہی تھیں۔ ایک وہ کہانی سنائی تھی کہ ایک لڑکی نے اپنے باپ کو پانی نہیں پلایا تو وہ ٹیڑی بن گئی۔ وہ اب آسمان پر ایک بوند پانی کے لئے چلاتی پھرتی ہے اس کے حلق میں سوراخ ہے۔ اس لئے بارش ہوتی تو وہ منہ کھول کر اڑتی ہے تاکہ پانی حلق میں گرے۔ اور ایک عورت نے اپنے شوہر کا حکم نہیں مانا تو اللہ میاں نے اسے دوزخ میں ڈال دیا تھا۔ ایک لڑکی غیر مردوں کے سامنے جاتی تھی تو ایک بزرگ نے۔۔۔

تو کیا چاند آیا بھی ٹیڑی بن جائیں گی۔۔۔؟“ اسے چاند آیا کی فکر مارے ڈالتی تھی۔ مگر اماں نے جانے کیوں اس کے ” سوال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا۔۔۔ نوالے چباتے میں غزل سوچے جارہی تھی۔ لیکن گھر میں رونے بیٹھے والی عورتیں اسے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں سوچنے دے رہی تھیں۔۔۔ وہ چولہے کے پاس زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور سایا اسے دودھ شکر میں بھگو کر روٹی کھلا رہی تھی۔ ایسے ترمال اڑاتے وقت بھی وہ رات کا واقعہ نہیں بھولی تھی۔ جب کسی بات پر لڑتے لڑتے ابا نے ایک لات مار کے اماں کو آنگن میں اُچھال دیا تھا۔ غزل نے اپنی پوری طاقت لگا کر انہیں اٹھایا۔ اور جب وہ کسی طرح نہ اٹھیں تو وہ باہر کھیلنے ہوئے شہزادہ اور ایاز کو بلا کر لائی۔۔۔ پھر سارا محلہ گھر میں اکھٹا ہو گیا۔ جسے دیکھو چپ چاپ پڑی ہوئی اماں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے آج تک کسی نے اماں کو نہیں دیکھا ہو۔۔۔ پھر بی بی کا سارا گھر چیختا چلاتا روتا بسورتا آ گیا اور بی بی نے آتے ہی سب سے پہلے غزل کو ”ایوان غزل“ بھجوادیا جہاں لنگڑی پھوپو تک نہیں تھیں۔ صرف فوزیہ اور شاہین تھے۔ وہ دونوں بھی غزل کو بڑی رحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔۔۔ اور اس کی کسی شرارت پر روک ٹوک نہیں ہوئی۔۔۔ اس نے جی بھر کے کچے سپوٹے توڑ پھینکے۔۔۔ ورنڈے کے پتھروں پر خوب تھوکا۔۔۔ ممانی بیگم کے اسپرنگ والے پلنگ پر خوب کو دی اور فوزیہ اور شاہین سے خوب لڑائیاں ہوئیں۔۔۔

شام کو جب وہ گھر بلوائی گئی تو جانے کتنے لوگ گھر میں بھرے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بڑا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایاز اور شہزادہ رونی صورتیں بنائے ہوئے ، نہایت شریف بنے ، بی بی کے پاس بیٹھے تھے۔ اماں کہاں گئیں۔۔۔؟ اس کے بار بار پوچھنے پر بی بی نے رو رو کر کہا کہ اماں اسپتال چلی گئیں۔ غزل بھی یہ سن کر ایک کونے میں چپکی بیٹھو رہی۔ مگر آج جانے کیوں ہر عورت کو اس پر پیار آ رہا تھا۔ سب نے بار بار اسے اپنے پاس بلایا اور چھاتی سے لگا کر خوب روئیں۔ غزل رونے دھونے کے اس طویل سلسلے سے اکتائی جاری تھی۔ اور نہ کوئی اور وقت ہوتا تو اپنی اس قدر دانی پر اکڑ کے لقا کبوتر بن جاتی۔۔۔

بی بی چپ چاپ خلاء میں آنکھیں گاڑے بیٹھی تھیں۔ ممانی بیگم خواہ مخواہ آنکھیں رگڑ رگڑ کے اپنے اوپر رقت طاری کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لنگڑی پھوپو عورتوں کے حلقے میں گھری چلا چلا کر بین کر رہی تھیں۔۔۔ انہوں نے اپنے بال چڑیلوں کی طرح بکھیر لئے تھے اور منہ ڈھانپ کر بیان کئے جارہی تھیں۔۔۔

ابھی عمر ہی کیا تھی۔۔۔ اس کی ساتھ والیاں کنواری بیٹھی ہیں۔۔۔ انگار لگو ان مرشدوں کی صورت پر۔۔۔ میری بچی کا ” کلیجہ بھون کر کھا گئے اجاڑ صورت میری بتول اماں۔۔۔ تیرے کو کہاں پاؤں میری اماں۔۔۔“ پھر سب با جماعت رونے لگے۔۔۔

غزل غزل۔۔۔ اب تم ہمارے گھر آؤ گی تو ہم تمہیں اپنی گڑیا دے دیں گے۔۔۔“ فوزیہ نے بڑی فراخ دلی سے اعلان کیا۔۔۔

کیوں دے دو گی مجھے۔۔۔؟“ غزل نے بہتی ہوئی ناک کو پھر اوپر سڑک کر پوچھا۔

”اسلئے کہ تمہاری اماں جو مرگئی ہیں نا آج۔۔۔“

نہیں لیے۔۔۔ ایسا نہیں بولتے۔۔۔“ رضیہ جلدی سے فوزیہ کا ہاتھ پکڑ کے ایک طرف لے گئی اور اس کے کان میں کچھ ” کہنے لگی۔

اماں مر گئیں۔۔۔؟ تو مر کے کہاں گئیں۔۔۔ غزل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔۔۔ اکتا کر وہ مردانے کمرے میں جانکلی۔

ناناحضرت دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے۔۔۔ راشد ماموں بار بار رومال سے اپنی سرخ آنکھیں پونچھتے اور پھر چہت کی طرف دیکھنے لگتے تھے۔۔۔ ابا بھی ہونقوں کی صورت بنائے ، بال بکھرائے بیٹھے زور زور سے پاؤں ہلا رہے تھے۔ نئے نئے لوگوں سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ مگر سب چپ تھے جیسے جتنی کہنے کی باتیں تھیں ان کا اسٹاک ختم ہو گیا ہو۔۔۔ پھر اس کی نگاہ چاند آیا پر پڑی۔۔۔ سیاہ شلوار۔۔۔ سیاہ چمکتا ہوا شرٹ اور سیاہ جالی کا دوپٹہ پہنے بیٹھی تھیں۔ رونے کی وجہ سے ان کا چہرہ سرخ بھوکا ہورہا تھا۔۔۔ ان کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔۔۔

پھر انہوں نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔۔۔

شیکسپیر نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ ”دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر شخص اپنا رول ادا کر کے چلا جاتا ہے۔ مگر بچاری بتول خالہ نے کیا ٹریجک رول ادا کیا۔۔۔“ وہ پھر رونے کی تیاری کرنے لگیں تو بیک وقت کئی لوگ انہیں سمجھانے ان کے قریب سرک آئے۔۔۔

”آپ تو اتنی تعلیم یافتہ ہیں پھر جاہلوں کی طرح۔۔۔“

”خدا کے لئے اپنے دل کو سنبھالنے میں چاندنی۔۔۔ آخر آپ کتنا غم کریں گی۔۔۔ ورنہ مجھے کسی ہاسپٹل پہنچا دیجئے۔“

پھر راشد کے دوست بھان صاحب کو یاد آیا کہ اگر چاندنی یوں ہی غم مناتی رہی تو اس بیروٹین کے پارٹ کا کیا ہوگا جو چاند کو ان کی ڈرامے میں کرنا ہے۔ اس لئے انہوں نے آہستہ سے کہا کہ وہ اور چاند ان کے ساتھ کہیں باہر گھومنے چلیں۔ تا کہ تازہ ہوا میں چاند کی طبعیت کچھ سنبھل جائے۔۔۔ یہ سن کر راشد نے چاند سے بڑی مدہم آواز میں کہا۔

”تم چلی جاؤ بھان صاحب کے ساتھ۔۔۔ میں تو ابا جان کے ساتھ ہی رہوں گا۔۔۔“

بھان صاحب بڑے اثر و رسوخ والے آدمی تھے۔ دس پانچ ہزار کے کنٹراکٹ دلانا ان کے لئے چند منٹ کا کام تھا۔۔۔

ہائے اللہ نکوجی۔۔۔ میرا دل کہیں جانے کو نہیں چاہتا۔“ چاند نے بڑے نخرے سے منہ بنا کر کہا۔۔۔

بھان صاحب چپ ہو گئے شاید اس لئے کہ ایک جوان روح جسم سے جدا ہو گئی تھی۔ یا پھر اس لئے کہ چاند کے اداس چہرے نے کمرے میں بیٹھے ہوئے مردوں کے دلوں میں اندھیرا پھیلا دیا تھا۔

چاند کی خالہ کے انتقال کی خبر چاند کے تمام دوستوں کو کھینچ لائی تھی۔ پھر چاند ہمایوں کے یہاں آئی تو لمبی کالی بیوک میں سے اترتے دیکھ کر پاس پڑوس کے تمام مرد ہمایوں کو پر سا دینے کے لئے کمرے میں چلے آ رہے تھے۔ کمرے کے فرش پر کہیں بیٹھنے کے لئے جگہ باقی نہیں بچی تھی۔ اس لئے بھان صاحب اپنی وولن کی پینٹ کا خیال کئے بغیر چاند کے قریب بغیر دری والے فرش پر نہایت بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بتول اور اس کی سسرال والوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ مرے گی تو راشد اور چاند کے ملنے والے اتنے بڑے بڑے لوگ اس کے ہاں تعزیت کے لئے آئیں گے۔

ہمایوں بھی جانتا تھا کہ بھان صاحب بڑے اثر و رسوخ والے آدمی تھے۔ ان کے باپ دادا بیگم بازار میں سود بیاج کی دوکان لگائے بیٹھے تھے۔ اور راشد کے باپ دادا کی دولت کو چپکے چپکے اپنی طرف کھینچتے رہے۔ پھر بھان صاحب نے اس دولت کو داؤ پر لگا کے بہت بڑے پیمانے پر بزنس شروع کر دیا۔ جب وہ حیدر آباد کے سرمایہ داروں میں نمایاں نظر آنے لگے تو انہوں نے شہرت کمانے اور عوام میں مقبول ہونے کے کئی کارنامے انجام دیے۔ لاوارث بچوں کے لئے آرام گھر بنوائے۔

انسداد بے رحمی بر انسان“ کی مہم چلا کر ان ساری لونڈیوں چھوکریوں اور بچوں کو جاگیرداروں کی ڈیوڑھیوں سے ”باہر نکالا جو ڈیوڑھیوں کے اوٹ ہاؤس میں پیدا ہوئے تھے۔ زندگی بھر جوتوں سے پیٹے جاتے۔۔۔ سلاخوں سے جلانے جاتے۔ لڑکیاں گھر کے جوان مردوں کے پیروں تلے روندی جاتیں اور پھر گھر کی کسی بیگم کے ہاتھ سے پٹتے پٹتے مر جاتی تھیں۔

بہان صاحب ایک کلچرل سوسائٹی کے بھی پریسیڈنٹ تھے۔ میڈیکل کالج کے ایک ڈرامے میں انہوں نے چاند کو دیکھا تو اچانک اپنی کلچرل سوسائٹی پر چھایا ہوا الماس کا اندھیرا دور ہوتا دکھائی دیا۔ مگر وہ بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ اس لئے انہوں نے چاند کی خدمت میں راست پھولوں کا گلدستہ اور مبارکباد پیش کرنے کے بجائے راشد سے تعلقات بڑھائے اور اسے ایک بلڈنگ بنوانے کا ٹھیکہ دلوا دیا۔ بس یوں ہی۔۔۔ اور اس طرح وہ اکثر راشد کے ہاں آنے لگے۔ اس کے بدلے میں راشد پر بھی فرض تھا کہ بہان صاحب کی کلچرل سوسائٹی کے لئے چاند جیسی اداکارہ کو چاندی کی کاسکٹ میں رکھ کر پیش کرے۔ پہلی بار بہان صاحب چاند سے بڑے تکلف، بڑے اہتمام سے ملے۔ چاند نے بھی رسمی ملاقات سے زیادہ انہیں کوئی اہمیت نہ دی۔ کیوں کہ بہان صاحب چالیس سے اوپر پہنچ چکے تھے۔ ان کی گنجی چاند، بھاری بھر کم تن و توش اور سیاہ رنگ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو چاند جیسی ماہ پاراؤں کی توجہ کھینچ سکے۔ اس لئے وہ چاند کے آگے سوائے اپنے اخلاق اور اپنی دولت کے اور کیا پیش کرتے۔

البتہ آج انہوں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد چاند کو اپنے ساتھ ”بوش ربا“ لے جانے پر راضی کر ہی لیا۔

جب چاند آیا ایک لمبی سی چکمیلی کار میں بیٹھ کر اس گنجے آدمی کے ساتھ چلی گئیں تو غزل پھر اندر آ گئی۔

گیلے فرش پر چھپک چھپا کرتی گھومتی رہی۔ آخر ایک کپڑوں کے ڈھیر پر لیٹ کر آنکھیں ملنے لگی۔ اماں مر گئیں۔۔۔ اس بات پر اگر وہ رونا شروع کر دے تو ابا ضرور ماریں گے۔ اس بات پر اسے پھر اماں یاد آئیں اور وہ سچ مچ رونے لگی۔

اس کی آواز سن کر سب دوڑے آ گئے۔ جیسے آج سے پہلے اسے کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا ہو۔ اور غزل کے ساتھ سب ہی رونے لگے۔

”ہمایوں میاں تم اپنے لڑکوں کو سنبھالو، غزل کو میں اپنے پاس رکھوں گی۔“

ہاں غزل ”ایوان غزل“ میں رہے گی۔۔۔ واحد حسین نے بھی بڑے جوش سے کہا۔

صبح ہمایوں منہ تمٹمائے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔

سایہ نے لاکھ چاہا کہ اپنے سیاہ ہاتھوں کی مٹھاس گھول کر اسے چائے پلا دے مگر اس نے دونوں بار اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بتول سے کوئی آرام نہیں تھا مگر وقت بے وقت سود و سوروپے اپنے میکے سے لے آتی تھی تو کام چل جاتا تھا۔ اب اسے دوسری پیسے والی بیوی کہاں ملے گی! یہی فکر اسے کل سے کھائے جارہی تھی۔

چولہے کے پاس بی بی بیٹھی ایاز اور شہزاد کو گھی میں تل کر پوریاں کھلا رہی تھیں۔ اور اس طرح ایک مہینے کے خرچ کا گھی آج ہی ختم کئے ڈال رہی تھیں۔ مگر اس کی ساس کو ان باتوں سے کیا غرض۔۔۔ ”ایوان غزل“ کی ملکہ ٹھہریں۔۔۔ انہیں تو اس وقت داماد کو یہ دکھانا تھا کہ وہ اپنے نواسوں کو کتنا چاہتی ہیں۔

میٹھی پوریوں کی خوشبو سونگھ کر غزل نے بھی وہ میلا چیکٹ تکیہ چھوڑا جس میں ابھی تک اماں کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور چولہے کی طرف بھاگی۔ مگر ہمایوں کو گھورتے دیکھ کر نل کی طرف مڑ جانا پڑا نل کے ٹپکتے ہوئے قطروں کو لے کر اس نے پورے چہرے پر یوں مالش کی کہ سارا چہرہ دھلا ہوا لگے۔ پھر پانی کے میلے ٹپکتے ہاتھ لئے وہ پوریوں پر پل پڑی۔

غزل کی ماں مرگئی۔۔۔ ہمایوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دہلی پتلی بے زبان عورت اسے اتنی بڑی زک دے سکتی ہے۔ اب وہ ان تین نالائق بچوں کا کیا کرے۔۔۔؟ چلو غزل کو تو نانا کے ہاں ٹھکانا مل جائے گا۔ مگر ایاز اور شہزاد کو یتیم خانے میں ڈالنا پڑے گا تا کہ قبر میں پڑی ہوئی بتول کو وہ اسی طرح لاتیں رسید کر سکے۔

اماں مرگئیں۔۔۔! باورچی خانے میں اماں کی مخصوص چوکی پر بی بی کو دیکھ کر بار بار غزل کو یاد آ رہا تھا۔ بار بار نوالہ لوٹ کر حلق میں آجاتا۔۔۔ آج جانے کیوں میٹھی پوریوں میں ذرا مزہ نہ آ رہا تھا۔ اماں کب آئیں گی۔ میں بھی اماں کے پاس جاؤں۔۔۔ اس بات پر اسے ضد کرنے کا پورا حق ہے۔ کیوں کہ اماں نے پھر بے ایمانی کی تھی۔ یوں ہی چلی گئی تھیں جیسے ”ایوان غزل“ جاتے وقت اسے دھوکا دے کر سلا دیتی تھیں۔ صبح آنکھ کھلتی تو وہ خوب شور مچاتی تھی۔ یہاں تک کہ ابا اسے گود میں اٹھا کر اماں کے پاس پٹک آتے تھے۔

اب ہم اماں کے پاس جائیں گے۔۔۔“ پوریوں سے نیت بھرنے کے بعد اس نے سسکیاں بھرنا شروع کیں کہ آج پھر ابا ” کی گود میں چڑھ کر بی بی کے ہاں جائے گی۔

بی بی۔۔۔“ ہمایوں نے غزل کو غصے سے دیکھا۔

بی بی۔ اس پوٹی کا رونا بند کروائے۔ نہیں تو میں سچی بھی اسے اس کی ماں کے پاس بھیج دوں گا! مجھ سے یہ کتیا ” کے پہلے اب نہیں پلیں گے۔

یہ سن کر غزل رونا دھونا پھینک پھانک بھاگ کھڑی ہوئی۔

رات کو جب وہ زیر دیتی اکیلے کھٹولے پر سلوائی گئی تو اسے شیخو میاں سے سنی ہوئی جن بھوتوں کی کہانیاں یاد آنے لگیں اور وہ ڈر کے مارے اس تکیے سے لپٹ گئی جو اماں کے پسینے کی بو میں بسا ہوا تھا۔

اب صبح کے وقت گھر میں بڑا ہنگامہ مچنے لگا۔

یوں تو بد انتظامی اماں کے وقت سے ہی اس گھر کی روایت بن چکی تھی۔ یہاں سایا کا راج تھا اور بتول اسپتال میں پڑی رہتی تھی۔ کبھی ٹھیک ہو کر آتی تو ہمایوں پھر اس کا کوئی کل پرزہ توڑ کے میکے بھجوا دیتا تھا۔ باپ کے مرتے ہی جب ہمایوں ”الف لیلہ“ سے نکالا گیا تو واحد حسین نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اسے کسی دفتر میں اہلکار کر وا دیا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمایوں کو احساس ہوا کہ زندگی زہر کا گھونٹ ہے اور بیوی سب سے بڑی بلا ہے۔ بچوں کا پالنا اور گھر کی ذمہ داری کی خاطر اپنے اوپر ہر عیش کو حرام کر ڈالنا۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہوگی۔

الف لیلہ“ سے نکلنے کے بعد ہی اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ کسی طرح مار پیٹ کے ہمیشہ کے لئے بتول اور ” بچوں سے چھٹکارا پالے۔ مگر بتول تو اس کے گلے کا بار بن چکی تھی۔ چاہے کتنی ہی لاتیں مارو یا ٹھوکریں لگاؤ وہ قدموں میں لوٹے جاتی۔ جب حکم دوفوراً اپنے باپ سے سو دو سو روپے لا دیتی۔ بچوں سے ہمایوں کو اب کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خصوصاً غزل سے تو انتہائی نفرت تھی۔ جیسے ” الف لیلہ“ کا جادوئی چراغ چرانے والی یہی مکار چڑیل تھی جس نے ہمایوں کو محل سے نکال کر جھوپڑی میں لا پھینکا تھا۔

بتول کے مرنے کے بعد ایاز اور شہزاد کے تو خوب مزے ہو گئے۔ ابا دن بھر دفتر میں رہتے تھے سایا کو وہ خاطر میں نہ لاتے۔ اس لیے اماں کی سرمہ دانی سے لے کر ابا کے پرانے جوتے تک بیچ کر انہوں نے سینما دیکھ ڈالا۔ البتہ ایاز کو کچھ پڑھنے سے بھی دل چسپی تھی۔ اکثر کتاب کھول کر کسی کونے میں جا بیٹھتا تھا۔

صبح وہ تینوں سوئے ہوئے فتنوں کی طرح جاگتے تھے۔ ناشتے پر وہ لوٹ مار مچتی کہ اکثر ہمایوں بھوکا ہی دفتر چلا جاتا تھا اور غزل ناشتہ نہ ملنے کے غم میں پچھاڑیں کھاتی تھی۔ لیکن بتول کے مرنے کے بعد تو غزل کی چیخوں پر کوئی بھی کان نہ دھرتا تھا۔ ہمایوں نے تو خیر اسی دن اس کے وجود پر لعنت بھیج دی تھی جس دن وہ پیدا ہوئی مگر ایاز اور شہزاد کو بھی اس سے جنم جنم کا بیر تھا۔ اس لئے ہر طرف کی دھتکار کے بعد اسے صرف اماں کے سوکھے سینے سے لگ کر سکون ملتا تھا۔ ہمایوں کے بے رحم ہاتھوں سے بچانا بھی صرف بتول ہی کا کام تھا۔ مگر بتول کے مرتے ہی ہمایوں کو تو غزل کو پیٹنے کے سوا اور کوئی دوسرا کام یاد نہ رہا۔ بی بی نے کئی بار اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کہا لیکن ہمایوں راضی نہ ہوا۔ وہ کہتا تھا صرف غزل ہی کیوں...؟ لے جانا ہے تو تینوں بچوں کو لے جاؤ تا کہ اسے چھٹکارا ملے... اب ایسے شیطان بچوں ! کی پلٹن بی بی کیسے پال سکتی تھیں اور وہ پال بھی لیتیں تو رضیہ کب راضی ہوتی

اس لئے غزل عقاب کی زد میں آنے والی فاختہ کی طرح دن بھر کسی کونے میں دبکی لرزا کرتی تھی۔

اب منحنی پنکھیاسی سوکھی ماری پھوپھی جان بھی بھائی کا اجڑا گھر سنبھالنے آگئی تھیں۔ وہ بچاری بغدادی قاعدے والی تمام نصیحتیں نہایت نستعلیق انداز میں ایاز اور شہزاد کوسناتی تھیں کہ بہن کو مارنا چھوڑو۔ پھر تنگ آ کر اپنے گھر چلے جانے کی دھمکیاں دیتی تھیں، جسے سن کر سب چند منٹ کے لئے چپ ہو جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پھولی جان کو اپنی بہو اور بیٹے میں صلح کرانے کے لئے گھر جانا پڑتا تو یہاں سب کا پڑاؤ جاتا تھا۔ ایک بات ہو تو گنائی جائے۔

سایا کو ہمایوں کی ناز برداری سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ بچوں کے لئے کھانا پکائے۔ ایاز کا جوتا کھو گیا۔ شہزاد نے ایاز کی کتاب پھاڑ ڈالی۔ پھر دونوں لڑ پڑے۔ اور اس دھینگا مشتی میں صراحی ٹوٹ گئی۔ اچار کا مرتبان گر گیا۔ ایاز کی نکسیر پھوٹ گئی۔ شہزاد کا گھونسنہ بیچ بجاؤ کرنے والی غزل کے پیٹ میں جالگا۔

جب دونوں بھائی من مانی شرارتیں کر کے تھک جاتے تھے تو غزل سے چھیڑ خانی کرنے بیٹھ جاتے۔ بتول کو اسی ہائے ہائے نے کھا لیا تھا۔ یہ تو پھوپھی جان کی محبت تھی کہ دو مہینے سے وہ ٹانک پی پی کر اس گھر کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھیں۔ جس دن غزل کی رکابی میں سے ایاز بوٹی اٹھا کر کھا لیتا تھا تو وہ گھنٹوں نایڑیاں رگڑ رگڑ کر یوں روتی جیسے دشمنوں نے اس کے دل کی بوٹیاں چبا ڈالی ہوں۔

سایا بازار جاتے جاتے اسے گونگی بھکارن کی جھولی میں ڈالنے کی دھمکی دیتی تھی۔ اس گونگی بھکارن کی پھٹی ہوئی آنکھوں سے غزل کو بے حد ڈر لگتا تھا۔ پھر وہ اور زور زور سے رونا شروع کر دیتی تھی۔ بی بی کہتی تھیں کہ غزل کے ہر وقت کے رونے ہی سے اتنی نحوست پھیلی کہ بتول مرگئی۔ ایسے وقت ہمایوں جھنجلا کر ایاز کو چولہے میں کی جلتی ہوئی لکڑی لانے کا حکم دیتا تھا۔ چنانچہ کپڑوں سے دھول جھاڑتی، کلائی سے بہتی ہوئی ناک پونچھتی ہوئی وہ کھڑی ہو جاتی۔ اسی پر بات ختم نہ ہوتی۔ اچانک ہمایوں کو یاد آتا کہ اس بے ماں کی بچی کو پالنے کی ذمہ داری صرف اس پر ہے۔ لہذا اسے فوراً اسکول جانے کا حکم ملتا۔ اور اسکول جانے سے پہلے جو تے ڈھونڈنے کا اور جو تے ڈھونڈنے سے پہلے بالوں میں سایا سے کنگھی کروانے کا... اور کنگھی کروانے سے پہلے سبق یاد کرنے کا... اور... ظاہر ہے کہ یہ نہایت نامعقول اور فضول کام ہوتے جو اسے محض رونے کی سزا کے طور پر کرنا تھے۔ اس لئے وہ آن سنی کر کے نہایت لا پرواہی کے ساتھ دیوار کا چونا ناخنوں سے کھرچے جاتی تھی۔ کیونکہ دھونس کے ساتھ حکم بجالانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ کوئی محبت سے حکم کے ساتھ چار

گھونسے بھی اماں کی طرح لگا دیتا تو وہ مان لیتی تھی۔ ابا دن بھر اسے مارتے پیٹتے اور دن بھر وہ منتظر رہتی کہ اب کی بار بارنے کے بعد ابا اسے کلیجے سے لگائیں گے اور ان کی گود میں منہ چھپا کر وہ رو پڑے گی۔ دن رات رونے کے باوجود اس کی آنکھیں ان آنسوؤں کو سنبھالے سنبھالے بوجھل ہو گئی تھیں جو کسی کے ہمدردی کے بولوں پر ہی بہائے جاسکتے تھے۔

ویسے تو ماں کو بھی ہزار فکروں نے کبھی اتنی فرصت نہیں دی تھی کہ وہ رضیہ کی طرح اپنی بیٹی کے گالوں پر پیار کریں۔ مگر کبھی کبھار ابا کی مارکھانے کے بعد وہ غزل کو سینے سے لگا کر روتی تھیں تو غزل کو بڑا اچھا لگتا۔ جی چاہتا اماں یوں ہی روتی رہیں۔ اور وہ ان کے سینے سے لگے لگے سوتی رہے۔ لیکن اب تو کوئی بھی ایسا آدمی نہیں رہا تھا۔ ابا تو اس کی طرف صرف دیکھ لیتے تو زمین و آسمان ہلنے لگتا تھا۔ غزل کا جی چاہتا کہ ان سب مارنے پیٹنے والوں کا قیمہ بنا کر چیل کوؤں کو کھلا دے۔ صرف چاند آپارہ جائیں دنیا میں۔

ہر طرف کی دھتکار سننے کے بعد وہ میلے کپڑوں کے ڈھیر پر جا کر لیٹ جاتی تھی۔ بتول کی موت کے بعد بتول کا حق جائیداد میں سے وصول کرنے پر واحد حسین اور ہمایوں کے درمیان ایک زور دار مچٹا ہوا تھا۔ اس لئے غزل پر ”ایوان غزل“ کا پھاٹک بند ہو چکا تھا۔ دن بھر وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے محلے کی خاک چھانتی پھرتی۔۔۔ رات کو خواب دیکھتی کہ جیسے وہ بھی چاند آیا بن گئی ہے اور وہ لمبے لمبے بالوں والا گویا سعادت زمین پر بیٹھا اسے سجدے کر رہا ہے۔ پھر وہ بھی چاند آپا کی طرح اپنی ساری کا سنہرا بارڈر اس کے گندے ہاتھوں سے چھڑا رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔

”ہوش میں آؤ سعادت۔ انتامت پیار کرو۔“

پھر ایک لمبی سے سیاہ موٹر آتی اور اسے کوئی تہہ خانے میں ڈھکیل دیتا۔ پھر یوں لگتا جیسے وہ راشد ماموں کی گود میں بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی ہے اور دلہن ممانی اسے خوب پیار کر رہی ہیں۔ اتنا کہ وہ رو پڑی۔۔۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتیں۔

جب آنکھ کھلتی تو اس کا تکیہ سچ مچ بھیگا ہوتا اور وہ سسکیاں لیتی۔

پھر وہ بڑی دیر تک سوچا کرتی تھی کہ چاند آپانے کے لئے سب سے پہلے تو وائلن۔ بجانا سیکھنا ہوگا۔ اسے نہ تو کتابیں پڑھنا آتا ہے اور نہ ڈراموں میں کام کر سکتی ہے۔ البتہ اس نے چاند آپاسے سننے ہوئے سب گیت اسی ٹیون میں یاد کر لئے تھے۔ ان کی طرح ہنسنا بھی آ گیا تھا۔ جی چاہتا ایک بار پھر چاند آپامل جائیں تو ان سے یوں چمٹے کہ کبھی نہ چھوڑے۔ ایک بار وہ اماں کے پاس سونے لیٹی تھی تو اس نے اماں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

”اماں اماں چاند آپا اتنے زور سے کیوں ہنستی ہیں۔“

اونہ۔۔۔ اماں نے کروٹ بدل لی۔

”اماں میں بھی چاند آپا کی طرح ہنسوں گی۔“

”تو مجھے قبر میں بھی چین سے مت سونے دینا۔ اچھا۔“

انہوں نے دانت کچکچا کر کہا اور جانے کیوں رونے لگیں۔

غزل سہم گئی۔۔۔ اماں تو صابن کا جھاگ بن گئیں تھیں۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور پھوٹیں۔

”مگر چاند آپا بننے کے لئے تو خوب پڑھنا ہوگا۔۔۔“

اس دن سے وہ صبح ہی اٹھ کر اسکول بھاگنے لگی۔ اور رات کو بڑی دیر تک سلیٹ پر تھوک مل مل کر بوم ورک کرتی۔

حیدر علی خاں نے چاند سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ کیونکہ انہیں چاند کی سوشل سرگرمیاں قطعی پسند نہ تھیں۔ کئی بار باپ بیٹی میں سخت تکرار ہوئی۔ اس کے بعد چاند کے لئے سو روپیہ مہینہ بھیجنا حیدر علی خاں نے ختم کر دیا۔ یوں بھی حیدر علی خاں نے پریکٹس چھوڑ دی تھی۔ اور کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ تلنگانے کے چھاپہ مار دوستوں کے ساتھ سازشوں میں مصروف تھے۔ لیکن ظاہر میں صرف ترقی پسند مصنفین کی مقامی شاخ کے سکریٹری تھے۔ اور اسی کے آفس میں بیٹھے کام کرتے تھے۔ چاند اب اپنے گھر نہیں جاتی تھی۔ اس کی کمیونسٹ ور کر سوتیلی ماں نے حیدر علی خاں کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اور وہ دونوں اپنے سارے فرض اور دلچسپیاں بھول کر پارٹی کے کاموں میں کھو چکے تھے۔ ان دنوں تلنگانے میں چھاپہ مار دستوں کا بہت زور تھا۔ وہ باقاعدہ فوجی ٹریننگ لے کر نظام کی فوج سے لڑتے تھے۔ کئی جگہ ان دوستوں کی قیادت نوجوان لڑکیاں کرتی تھیں۔ وہ لوگ سرکاری فوج سے ہتھیار چھین کر اکٹھے کرتے اور کہیں کہیں تو پورے ضلع پر قبضہ کر لیتے تھے۔ حکومت نے پارٹی پر احتساب عائد کر دیا تھا۔ اس لئے اہم پارٹی ور کرانٹر گراؤنڈ رہے۔ جو باہر بوتے وہ ادبی سطح پر ترقی پسند تحریک کے ممبر بن کر کام کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاؤں میں دیشمکھوں اور جاگیرداروں نے لوٹ کھسوٹ کو اپنا حق بنا لیا تھا۔ گاؤں میں کسی کسی کسان کی عزت بچی تھی نہ دولت۔ وہ دن دباڑے کھیتوں پر کام کرنے والی لڑکیوں کو موٹر میں ڈال کر لے جاتے۔ کھڑی فصلیں کٹوا لیتے۔ اسی لئے پارٹی کو مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ خصوصاً مزدور اور کسانوں کا طبقہ پوری طرح پارٹی کے ساتھ تھا۔ وہ پہاڑیوں کے ناقابل عبور راستوں پر دلم کی رہنمائی کرتے تھے اور سرکاری فوجوں کی مخبری کا کام انجام دیتے۔ نظام نے اس طوفان کو روکنے کے لئے بہت سے بندھ باندھے۔ کسانوں کے نوجوان لڑکوں کو ان ہی کے آنگن میں کھڑے پیڑوں سے لٹکا کر پھانسیاں دی گئیں۔ نوجوان لڑکیوں کو سرکاری سپاہی سب کے سامنے اٹھا کر لے جاتے۔ پورے خاندان کے آگے باغی افراد کو شوٹ کیا جاتا تھا۔ لیکن ان ہی عبرت ناک سزاؤں نے عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ جاگیردار اور دیش مکھ اس طوفان سے کا پہنے لگے تھے۔

واحد حسین کا بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا۔ ان کے لئے یہ بات بڑی پریشان کن تھی کہ خود ان ہی کا داماد اور ایک جاگیر دار گھر کا معزز پڑھا لکھا لڑکا ان غنٹوں میں جا ملا تھا اور ان کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ غصے کے مارے ان کی حیدر علی خاں سے بات چیت بند تھی۔ کیونکہ کئی بار سرکاری طور پر باز پرس ہو چکی تھی کہ واحد حسین کا اپنے داماد سے کیا تعلق ہے اور حیدر علی خاں کی بیٹی ”ایوان غزل“ میں کیوں رہتی ہے! حالانکہ چاند اپنے ڈیڈی کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی۔ اسے میک اپ کے نئے نئے ڈھنگ سیکھنے اور پارٹیوں میں عاشقوں کے گروہوں سے نیٹے سے ہی فرصت نہ تھی۔ اس نے کبھی بھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ اس کے باپ نے عیش و آرام کی زندگی تھج کر ان جھیلوں میں پڑنا کیوں قبول کیا۔ اور اخباروں میں نہرو اور گاندھی جی کیا چلا رہے ہیں۔ البتہ ایک بار جب کسی نے اس کی نزاکت پر چوٹ کر کے کہا کہ وہ تو بڑے مضبوط باپ کی بیٹی ہے، تو اسے احساس ہوا کہ شاید اسے بھی ڈیڈی کے کارناموں پریشان دکھانا چاہیئے۔ سنا ہے وہ غریبوں کی حمایت کر رہے ہیں۔

ان ہی دنوں میڈیکل کالج کی بلڈنگ کا افتتاح کرنے حضور تشریف لائے تو اسٹوڈنٹس یونین کی پریسڈنٹ بن کر چاند ایڈریس پڑھنے کھڑی ہوئی۔ حضور دنیا کو بڑی لا پرواہی سے، بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔ مگر خوبصورت چہرے کو دیکھتے ہی ریشہ ختمی ہو جانا ان کے خمیر میں شامل تھا۔ بس فوراً چاند کے بارے میں پوچھ کچھ شروع ہو گئی۔ اور انہوں نے اپنے ایک منظور نظر سپاہ فام صاحبزادے کے لئے چاند کو منتخب کر لیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چاند اور بہان صاحب کا معاشقہ پورے شہر میں مشہور ہو رہا تھا۔ اس لئے واحد حسین نے فیصلہ کر لیا کہ اس رشتے کو قبول کر لیں۔ بھلا اس سے زیادہ عزت افزائی ان کے خاندان کے لئے اور کیا ہوسکتی ہے کہ چاند شاہی خاندان کی بہو بن جائے۔ اس طرح چاند کے باپ کی خطائیں بھی نظر انداز ہوسکتیں تھیں اور واحد حسین کے سوئے ہوئے نصیب جاگ اٹھیں گے۔ یوں بھی شاہی رشتہ کبھی لوٹایا نہیں گیا۔ اعلیٰ حضرت کی پسند تو مضبوط بندھن ہوتا تھا جسے وقت اور ذاتی پسند کی کوئی تلوار نہیں کاٹ سکتی تھی۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے چاند نے بڑی لا پرواہی سے اس پیغام پر تھوک دیا۔

”آخ تھو۔۔۔ میں کیوں کرنے لگی ایسی اجاڑ صورتوں سے شادی۔۔۔“

!واحد حسین نے سنا تو تھرتھر کانپنے لگے۔ اب جانے ان کے خاندان پر کیسا عتاب نازل ہوگا

ایک دن شام کو چاند سج بن کر کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھی کہ ایک کالا سا بڑے بڑے بالوں والا ہندولڑ کا حیدر علی خاں کا خط لے کر آیا چاند کے لیے۔ ایک مدت کے بعد ڈیڈی کا خط پڑھ کر چاند او اس ہو گئی۔ انہوں نے کتنے دکھ سے لکھا تھا کہ اب چاند بڑی ہو گئی ہے اس لئے اپنا حکم بیٹی پر لادنے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتے کہ چاند کی شادی شاہی خاندان میں ہو۔

خط پڑھ کر چاند نے نظریں اٹھا ئیں تو گھبرا گئی۔ وہ سیاہ فام نوجوان اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد چاند نے گھبرا کے پوچھا۔ ”بابا آج کل کہاں ہیں۔۔۔؟“

بہت دور۔۔۔ اس نے اسی محویت کے عالم میں جواب دیا۔

”کیا آپ بھی بابا کے ساتھی ہیں۔۔۔؟“

ہاں۔ میں ایک مجسمہ ساز ہوں۔ اپنا کام چھوڑ کر پارٹی میں شریک ہو گیا ہوں لیکن ابھی مجھے آپ کو دیکھ کر خیال ”آیا کہ مجھے اپنا کام نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

کیوں۔۔۔ چاند ہنس پڑی۔۔۔ اجنبیوں سے خوش اخلاقی برتنے میں وہ ماہر تھی۔

”کیونکہ مجھے غافل پا کر خدا مجسمہ سازی کے فن میں بہت ترقی کر رہا ہے۔۔۔ وہ آپ جیسی حسین شبیہ بنانے لگا۔“

چاند کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ ایسی انوکھی تعریف کرنے والا یہ لا ابالی سا مست آنکھوں والا نوجوان جانے کیوں اسے اچھا تک اچھا لگنے لگا۔

اچھا اب جاتا ہوں۔“ وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیوں تھوڑی دیر بیٹھے نا۔ آپ بابا کے دوست ہیں تو چائے پیئے بغیر نہیں جائیں گے۔“

وہ بیٹھ گیا۔ پھر وہ بڑے سے پرانی وضع کے ڈرائنگ روم میں گئی ہوئی تصویر یں اور قیمتی سامان دیکھنے لگا۔

”باہر سے آپ کا مکان کتنا خراب لگتا ہے۔ لیکن اندر آ کر معلوم ہوا کہ یہ ”ایوان“ ہے اور آپ اس کی ”غزل“ ہیں۔“

چاند کو پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔۔۔ (بھان صاحب کہتے تھے ہنستے وقت چاند دوگنی خوبصورت لگتی ہے۔ اسی لئے اسے ڈراموں میں بار بار ہنسایا جاتا تھا۔ اور ہر بار نوجوان زور زور سے تالیاں پیٹتے ونس مور، ونس مور کا شور مچاتے تھے)

آپ پھر کبھی آئیے۔۔۔“ گیٹ تک آ کر چاند نے اسے بڑے پیار سے دیکھا۔

سنا ہے عنقریب گرفتار ہونے والا ہوں۔ اگر بچ گیا تو پھر ایک بار آؤں گا۔ خدا کی مجسمہ سازی کا فن دیکھنے۔۔۔

مگر چاند سے نہیں بھول سکی۔۔۔ جانے کون تھا وہ۔۔۔ کیسا شوخ چنچل۔۔۔ بالکل کرشن کنہیا سا لگتا تھا۔ اس نے نام بھی تو نہ پوچھا۔

ایک بار کسی نے بتایا کہ حیدر علی خاں پر سے مقدمہ اٹھالیا گیا اور وہ گھر واپس آگئے ہیں۔ مگر چاندان سے ملنے انجمن کے آفس گئی۔ بابا سے مل کر خوب روئی۔ پھر اس خط کا ذکر آیا۔۔۔ پھر اس نوجوان کا۔

”سنجیو آ۔۔۔“ حیدر علی خاں نے کہا۔۔۔ ”آج کل پولیس اس کی تاک میں ہے۔ وہ کہیں چلا گیا ہے۔۔۔“

یہ کیا چھوٹے بچوں کی طرح رو رہی ہو۔۔۔“ حیدر علی خاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔۔۔ ”وہی کرو جو اپنے لئے“
”بہتر سمجھتی ہو۔۔۔ لوگوں کے جال میں مت پھنس جاتا۔۔۔ جاؤ گھر جاؤ۔ آئندہ مجھے سے ملنے یہاں مت آنا۔۔۔“

بابا اسے چھوڑنے نیچے آئے۔

”تو کبھی کبھی سنجیو آکو بھیج دیا کیجئے اپنی خیریت کے لئے۔“

اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

کئی مہینے بعد چاند راشد ماموں کے ساتھ کسی جلسے سے باہر جاری تھی تو سنجیو آنظر آیا۔ وہ بال کے کوریڈور میں کسی آدمی سے بحث میں مصروف تھا۔ اس نے چاند پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گیا۔ چاند آگے بڑھی تو یوں لگا جیسے پیچھے کچھ رہ گیا ہے۔ اسے جانے کیوں اپنی ذلت کا احساس ہونے لگا۔ آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کوئی اسے یوں نظر انداز کر دے۔

دوسرے دن وہ بابا سے ملنے انجمن کے آفس گئی۔۔۔ بابا نہیں تھے۔ کوئی نہیں تھا۔۔۔ وہ واپس جارہی تھی تو گیٹ پر سنجیو آنظر آیا۔

”آپ کے بابا کی طبیعت خراب ہے۔ اس لئے وہ یہاں نہیں آ رہے ہیں۔“

”لیکن آپ کیوں نہیں آئے۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔“

(چاند نے پہلی بار کسی مرد سے اتنے نرم لہجے میں بات کی تھی)

اس نے غور سے سنجیو کو دیکھا۔ اس کے لمبے لمبے الجھے الجھے گھنے بالوں کا ٹوکرا سا بنا سر پر رکھا تھا۔ اس کے نقوش بڑے تیکھے تھے۔ بڑی بڑی ، مندی مندی آنکھوں میں جانے کیسی کشش تھی کہ چاند سے بھولتی ہی نہ تھی۔ وہ بہت ہی معمولی سی پینٹ شرٹ پہنے تھا۔ (بابا نے اس دن بتایا تھا کہ وہ بڑے امیر ریڈی خاندان کا لڑکا ہے اور بہت اچھا مجسمہ ساز ہے)

وعدہ تو کیا تھا۔۔۔“ اس نے سگریٹ سلگاتے میں کہا۔

”لیکن زمین پر پڑے ہوئے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ آسمان پر چمکنے والے چاند کو کیسے دیکھیں۔“

چاند کو ہنسی آ گئی۔ بڑی ادا سے۔ بڑی نزاکت سے اس نے کہا۔

”آپ آئیے تو میں زمین پر ہی ہوں گی۔ مجھے آپ سے آرٹ پر کچھ ڈسکس کرتا ہے۔“

ارے نہیں بھئی۔۔۔“ سنجیو آئے لا پرواہی سے سگریٹ کا کش لیا۔

میں آپ جیسی نازک خیال آرٹسٹوں سے بحث نہیں کرتا۔ میں ٹھہرا بالکل اجڈ آدمی۔“

”پتھر پھوڑنے والا۔“

چاند کو سنجیو کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اور اس نے دوسرے دن اپنی آرٹ سوسائٹی کے آفس مینسجیو کو بڑے اصرار سے بلوایا تا کہ نئے ڈرامے کے موضوع پر اس سے مشورہ لے سکے۔

اور پھر اسی دن چاند کے اصرار پر بھان صاحب نے سنجیوآ کو اپنی سوسائٹی کا ممبر بنالیا۔ اس وقت تو بھان صاحب نے یہی سوچا کہ ایک کمیونسٹ کو ممبر بنا لینے سے اچھا ہے کہ ذرا نو جوان اس سوسائٹی کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور ایسے یورپ پلٹ نوجوان کی بدولت واقعی ڈراموں میں نئے نئے آئیڈنٹے پیش کئے جاسکیں گے۔ انہیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کالے معمولی حیثیت کے لڑکے کے پیچھے چاند ایسی دیوانی ہو گئی کہ بات بات پر انہیں بھی جھڑک دے۔

چاند کا پیغام واپس ہوا تو سچ مچ شاہی عتاب نازل ہوا۔۔۔ مگر واحد حسین پر نہیں۔۔۔ بلکہ حیدر علی خاں پر۔۔۔ ان کی گرفتاری کے وارنٹ نکلے اور وہ مع اپنے گروپ کے انٹرگر اوٹڈ ہو گئے۔ پس چاند تو یکتارا لے کر بیٹھ گئی۔۔۔ بالکل میرا بائی کے انداز میں اس نے سفید ساری پہن کر بال کھول لیے اور سنجیو آ کی یاد میں گانے لگی۔۔۔ کون گلی گنیو شام بنا دے کوئی۔۔۔ چاند کو یوں اُٹے دن نت نئے سوانگ بھرتے دیکھ کر واحد حسین سوچتے کہ اب تو پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے انہیں شروع ہی میں اس کی بیخ کنی کرنی چاہیئے تھی۔ اصل میں چاند کے بگڑنے میں اس کا بھی کیا قصور ہے۔ وقت پر اس کی شادی ہو جاتی ! تو آج کیوں یہ دن آتا۔ لیکن راشد کو چاند سے اتنے کام لینے تھے شادی کیسے کرتے

آج ”ایوان غزل“ میں مشاعرہ تھا۔ فانی بدایونی شاہی طلبی پر اُٹے ہوئے تھے۔ واحد حسین جانتے تھے کہ ان کے پاؤں دکن میں نہیں جمنے دیے جائیں گے۔۔۔ مگر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ایک مشاعرہ منعقد کر دیا تھا۔ جس میں حسرت موہانی ، فانی بدایونی ، استاد جلیل مانک پوری، علی اختر اور حیرت بدایونی اُٹے والے تھے۔

مگر آج لاکھ سر پٹکنے پر بھی ایک مصرعہ موزوں نہ ہوسکا۔ اور مشاعرے میں تازہ غزل سنانا ان کی روایت رہی ہے۔

پھر انہوں نے بیاض ایک طرف سرکا کے رکھ دی۔ عینک اُتار کے کرتے کے دامن سے صاف کی اور پھر لگا کے چاروں طرف یوں دیکھا جیسے اب دُنیا کا رنگ اور ہی نظر اُٹے گا۔ پہلی نظر رضیہ پر پڑ گئی جو دالان میں ایک کرسی پر کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی تھی۔ پھر وہ اپنی ساس سے کہنے لگی۔

بی بی قیصر بچاری کا عقد چچا پاشا سے کروا بیجئے نا۔ جہاں اتنی مالن بی وغیرہ چھوکر یاں اجالا چچی نے اکٹھی کر لی ہیں۔ اس کی بھی روٹی کا ٹھکانا ہو جائے گا۔

ہُو۔۔۔ کوشش کر کے دیکھو بیگم۔۔۔“ واحد حسین نے فوراً اس بحث میں شرکت کر لی۔

”اوئی تم لوگوں کے دماغ کو کیا ہوا ہے کوئی بات بھی یاد ہے۔“

بی بی کے کچھ کہنے سے پہلے حسب عادت گو ہر پھو پو بیج میں کود پڑیں۔

یہ بات تو ایک سال پہلے خود چھوٹے بھائی نے اٹھائی تھی پچھلے سال فوزیہ کی سالگرہ میں انہوں نے قصر کو ”

”دیکھا تھا تو۔

”اچھا۔۔۔؟“ تو پھر۔۔۔ رضیہ منہ اٹھائے چھوٹی بچیوں کی طرح ہنسنے لگی۔

”ہوتا کیا۔۔۔؟“ بی بی نے لنگڑی پھوپو سے بات چینی۔

یوں ہی مذاق میں احمد میاں نے فاطمہ بیگم سے کہا کہ تمہاری پوتی اب جوان ہو گئی ہے ہمارے سامنے مت لایا کرو۔ ” ورنہ ہم کسی دن پکڑ کے اس سے نکاح وکاح کر ڈالیں گے۔ یہ سن کر فاطمہ بیگم تو چپ ہو گئیں مگر قیصر بڑے غصے میں ”اگے بڑھی۔

”باتھ تو لگا کے دیکھو مجھے باتھ توڑ ڈالوں گی۔ میرے ابا کوٹرا دھمکا کے اپنا غلام بنا لیا ہوگا۔ میں کسی کے ” جھانسنے میں نہیں آؤں گی۔۔۔“ اس کی باتیں سن کر سب بنائے میں آگئے۔

وہ تو کہو چھوٹے بھائی بھابی کا لحاظ کر گئے۔۔۔“ گو ہر پھو پونے کہا۔

ور نہ تم تو جانتے ہو ان بھائیوں کا غصہ۔ اگر فاطمہ بیگم کے سامنے ہی اسے اٹھا کر لے جاتے تو کوئی کیا کر ”

”الیتا

واحد حسین منہ کھولے پہلی بار قیصر کی خود سری کا یہ قصہ سن رہے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ ایک بار انہیں کہیں قیصر مل جائے تو وہ اسے زبان درازی کا مزہ چکھادیں۔

وہ تو کہو حالا بھابی تک یہ بات نہیں پہنچی در نہ وہ تو سچ مچ احمد بھائی سے اس چھوکری کا منہ کالا کروا کے ”چھوڑتیں۔“

اللہ تو بپ۔۔ کیسی مردار نکلیں یہ دونوں ماں بیٹیاں۔“ رضیہ کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ اس نے کبھی ان نیچ ”ذات عورتوں کی اتنی خودسری نہیں دیکھی تھی۔“

یہ سب قیامت کے آثار ہیں۔ کاں محبوب علی کاں پیاز کی ڈلی۔۔“ گو ہر پھوپو نے آہ بھر کر کہا۔ ”

اب یہی دیکھو چاند کی حرص میں اسے بھی کالج میں پڑھایا جا رہا ہے۔ بھلا ایسی چھو کر یوں کو کالج میں داخلہ مل ”سکتا تھا؟ بس نام لے دیا ہو گا کہ نواب واحد حسین خاں میرے ماموں ہیں اور شرافت جنگ میرے دادا تھے۔۔“

بابا۔۔ رضیہ کو ہنسی آگئی لنگڑی پھوپو کی باتوں پر۔ پھر اٹھتے اٹھتے اس نے کہا۔

”مٹی ڈالوان کمینی عورتوں پر۔ میرے سامنے ان کا نام نکولو۔“

”ہاں بھئی ہمارے گھر میں ان آوارہ عورتوں کا کیا ذکر۔۔“

واحد حسین نے اچانک اپنی آواز میں تشویش بھر کے کہا۔

”حالات ویسے ہی خراب ہو رہے ہیں۔ تم لوگ کیا جانو کیا ہو رہا ہے۔۔“

کیوں کیا ہوا۔۔؟“ بی بی کے ہاتھ سے سرد تا چھوٹ گرا۔ ”

ہوتا کیا۔۔“ واحد حسین نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

”سنا ہے نلگنڈہ پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور اس ساری کاروائی میں آپ کے داماد پیش پیش ہیں۔“

اگے میری ما۔۔“ بی بی نے دل پر ہاتھ رکھا۔۔ رضیہ اور لنگڑی پھوپو بھی ساکت ہو گئیں۔

ادھر یہ ہندوستانی انگریزوں کو نکالنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ہندوستان میں کتنے پُل توڑ رہے ہیں۔

ریلوں کو آگ لگانی جارہی ہے۔ میرے کو تو یہ کچھ اچھے آثار نہیں لگتے۔

”ہو سنا ہے کرپس کا پلان نہرو اور جناح نے واپس لوٹا دیا۔“

راشد جانے کہاں اندر کمرے میں بیٹا تھا مگر اپنے ابا سے بات کرنے باہر آ بیٹھا۔

مگر ایک بات ہے ابا جان، اگر انگریز چلے گئے تو یہ کانگریسی اور مسلم لیگی نہیں جینے دیں گے! دیکھ لینا نہرو ”تو وہی روس کی نقل میں کمیونسٹوں کا راج لے آئیں گے یہاں۔“

”ہٹو میاں۔۔ کانگریسی اور مسلم لیگی کبھی نہیں بولے کہ جاگیر میں ختم کرو۔ مگر یہ کمیونسٹاں تو اپنے دشمن ہیں۔“

یہ سن کر راشد اپنا سر کھجانے لگا۔

”میں ہوتا اپنی فوج کا کمانڈر ان چیف، ایک ہی دن میں سارے غنٹوں کا سر کچل ڈالتا۔“

واحد حسین نے غصے میں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

آج کل کے نوجوانوں میں عقل ہی نہیں ہے۔ ایک ہم تھے کہ انگریز ریزیڈنٹ کو ہمیشہ اپنی مٹھی میں رکھا۔ کسی کی ” مجال نہ ہوئی کہ منہ کھولے۔

واحد حسین کہتے رہے۔ راشد یوں ہی سر جھکانے بیٹھا سنتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ یوں ہی خلاء میں نظریں جما کے کہنے لگا۔

سنجیو آ ایک دن کہہ رہا تھا کہ فولاد سے ٹکرانے کے لئے آدمی کا کیا جوڑ۔۔۔ ! جانے کون سے کمانڈر ان چیف کی ” باتیں لئے پھرتے آپ! سنجیو کہتا ہے کہ دیہاتوں میں چٹانیں اپنی آغوش کھول کر ہمیں چھپالیتی ہیں اور پہاڑیاں توپ کے دھانے بن کر انہیں اچھالتی ہیں۔ وہ کہتا ہے صدیوں سے آرام کرنے والے ہاتھ اس قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو صدیوں سے کام کرتے آئے ہیں۔

”افو۔۔۔ آپ تو یوں سنجیو آ کی بات سنارہے ہیں جیسے خود بھی ہاتھ میں سرخ جھنڈا لے کر دلم مینجانے والے ہیں۔“

واحد حسین کی بات پر رضیہ کو ہنسی آگئی۔ راشد بھی کھسیانا ہو گیا۔

مگر یہ جھوٹ تھوڑی ہے ابا جان۔۔۔“ راشد نے بڑے دکھ سے کہا۔

پہلے کبھی سنا تھا کہ کسی دھمیڑ نے بندوق چلائی ہو۔ مگر آج وہ پورے ایک ضلع پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ حکومت ” کر رہے ہیں۔“ بات ختم کر کے اس کے چہرے پر بڑی تلخ مایوسی جاگئی۔

”ہم لوگ گاؤں جاتے ہیں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں تو پتھر توڑنے والی دٹرینیاں اکڑ کے جواب دینے لگی ہیں۔“

راشد کی اس بات پر رضیہ کونسی آگئی۔ کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ یہ انجینئر لوگ جب ٹور پر جاتے ہیں تو ہر رات ایک وڈرنی ان کے لئے پکڑ کر لائی جاتی ہے۔

لنگڑی پھوپھو چولھے کے پاس رات کے کھانے کے لئے جنس تلوانے میں لگی تھیں۔ مگر انہوں نے وڈرنیوں کی بات سنی تو پلٹ آئیں۔

”راشد میاں کیا بول رہے کتے! وڈر نیاں کیا کر رہی ہیں؟“

”حکومت کر رہی ہیں پھو لو۔۔۔ قلم ہاتھ میں لے کر کتا باں لکھ رہی ہیں۔“

چل ہٹ۔۔۔“ لنگڑی پھوپھو کو ہنسنا آتا تو اس وقت وہ یقیناً ہنستیں۔

”وڈر نیاں نہ ہونیں اجاڑ صورت بیگماں ہو گئیں۔“

”ہو پھو پو بیگماں بن کر پورے گاؤں پر راج کر رہی ہیں۔“

”اچھا تو پھر وہاں پتھر کون پھوڑ رہا ہے۔۔۔؟“

ہماری تقدیریں پھوڑ رہی ہیں گوہر بیگم۔۔۔“ واحد حسین اب رونے کے قریب تھے شام کو مشاعرہ تھا اور ایک مصرعہ ” بھی موزوں نہیں ہوا۔۔۔ پھر ایوان غزل کی صفائی۔۔۔ فرش کروانا۔۔۔ کھانے اور چائے کا انتظام۔

”لو تمہارا خط ہے رضیہ۔۔۔“

راشد نے الٹ پلٹ کر لفافہ رضیہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

خیریت تو ہے؟ تمہارے ابا کا کیا حال ہے؟“ لنگڑی پھوپھو کو ہر وقت رضیہ کے باپ کے مرنے کا انتظار رہتا تھا کہ ”جلدی سے اکلوتا داما در اشد تمام جائداد کا مالک بنے۔“

حامد بھائی کا ہے۔۔۔“ رضیہ جانے کیوں مسکرائے جارہی تھی۔

”اور تمہارے والد صاحب کا مزاج کیسا ہے؟“

سنا آپ نے۔۔۔ وہ جو ہمارے ایک بولے شولے سے حامد بھائی ہیں نا؟ ان کی شادی ہو رہی ہے۔“ وہ لنگڑی پھوپھو کو جواب دینے کے بجائے راشد سے مخاطب ہوئی۔

ہا ہا ہا۔۔۔ راشد کو ہنسی آگئی۔

سچ۔۔۔!“ اونگھتے ہوئے واحد حسین اور منہ میں پان لے جاتی ہوئی بی بی بھی ہمہ تن گوش ہو گئیں۔“

لکھا ہے خلوت میں کہیں بات چیت ہو رہی ہے۔ لڑکی والے تین ہزار گھوڑے جوڑے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ مگر حامد ”بھائی چاہتے ہیں کہ ہم لوگ جا کر وہاں کے لوگوں سے ملیں اور اس بات کا اندازہ کر آئیں کہ وہ لوگ واقعی تین ہزار دیں گے یا نہیں!“

ٹھیک تو لکھا ہے۔۔۔“ لنگڑی پھوپھو نے بی بی کی طرف دیکھ کر ناک سکوڑی۔

”کیا معلوم کوئی فقیر، چپراسی، اردلی وغیرہ ہوں اور دھوکے میں آجائیں یچارے حامد میاں۔“

چھوڑو جی اس بات کو۔۔۔“ واحد حسین کھپساگئے۔

”تو آخر حامد میاں شادی پر پیسے خرچ کرنے اور بیوی کے اخراجات برداشت کرنے پر تیار ہو ہی گئے۔“

حامد میاں دراصل لاوارث مال تھے۔ اور اپنی کنجوسی کی وجہ سے پورے خاندان میں مشہور تھے۔ خاندان میں کوئی انہیں اپنا بھائی بنانے پر تیار نہیں ہوا۔ میٹرک تک رضیہ کے ابا نے پڑھا دیا۔ اس کے بعد فیس معاف کرا کے آخر گریجویٹ ہو بی گئے۔ اس کے بعد انہیں کلر کی دلانے میں صرف واحد حسین کی کوششوں کا دخل تھا۔ وہ بھی آبکاری جیسے محکمے میں جہاں حامد میاں کو چاندی بنانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔

لیکن یتیمی کے دھکوں اور دائمی مفلسی کے جھٹکوں نے حامد کو اس حال پر پہنچا دیا تھا کہ ان کے لیے پیسہ ہی دنیا کی سب سے بڑی سچائی تھا پہلے اس لیے وہ بھوکے سوئے تھے کہ کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ اور اب اس لیے بھوکے سوئے تھے کہ پیسہ خرچ نہیں کیا جاتا تھا۔ سب ان کا مذاق اڑاتے لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتے۔ خاندان میں ان کی کنجوسی کے لطیفے سارے بچوں کو یاد تھے لیکن وہ مذاق کرنے والوں کو ہنس ہنس کر دیکھتے تھے۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ اور تھوڑے دنوں ہنس لو۔ پھر جب میں موٹر میں بیٹھ کر آؤں گا اور تمہارا سگا بھتیجا بن جاؤں گا۔ تب سب کے چہروں سے مسکراہٹ غائب ہو جائے گی۔

ویسے حامد کا کوئی اور کام آپڑتا تو کوئی پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ مگر یہ تو شادی کا معاملہ تھا اور وہ بھی ایک شریف کمار ہونہار نوجوان کی شادی جس میں سمدھنوں کو اپنے ناز نخرے دکھانے اور دعوتیں اڑانے کا خوب موقع ملتا ہے۔ ادھر تو لڑکی والے آؤ بھگت کریں گے ادھر حامد میاں پر یہ احسان کہ لو بھئی تمہارے سارے فرائض آخر ہم نے ہی ادا کیے ہیں۔

ایک دم گھر میں ہلچل سی مچ گئی۔

بی بی نے ایک دن سیف میں سے زیوروں کا صندوقچہ نکال کر کھولا۔

سمدھن بن کر جاتے وقت زیور پہنا بہت ضروری ہوتا ہے نا! چاند نے بھی اس شادی میں دلچسپی لی کیوں کہ حامد بھائی کی کنجوسی کی وجہ سے لطف لینے کی خاطر وہ حامد بھائی سے خوب ہنسی مذاق کرتی تھی اور انہوں نے خط میں خاص طور سے تاکید کی تھی کہ چاند بھی سمدھنوں میں شامل ہو جائے تو ذرا حامد میاں کے خاندان کا رعب پڑ جائے گا۔ اس لیے چاند نے فوراً درزی کو بلا کر بلاؤز کا نیا ڈیزائن سمجھایا۔ اور رضیہ راشد کے ساتھ ہی کنجی ورم کی ساری لانے بازار گئی۔

ایک ہفتہ بعد دلہن والوں کے ہاں سے ان لوگوں کو ساتھ لے جانے کے لیے دلہن کا چھوٹا بھائی آیا تو سب کیل کانٹے سے لیس ہو چکے تھے۔ آج تو لنگڑی پھوپھو نے بھی کلی دار کرتا اور کھڑا دو پٹہ اتار کے وہ گلابی بنارسی ساری پہن لی تھی جو ان کے جہیز کے کپڑوں میں رکھی ہوئی تھی۔ لنگڑی پھوپھو کنواری تھیں۔ اس لئے وہ کنواریوں کا لباس پاجامہ اور کھڑا دو پٹہ ہی پہنتی تھیں لیکن چالیس سال کے قریب جا چکی تھیں، اس لئے خاص خاص موقعوں پر ساری بھی پہن لیتی تھیں۔ اس لباس میں بقول بی بی کے ان کا حسن نکھر آتا تھا۔ آج تو انہوں نے رضیہ کی سیف میں رکھے ہوئے اپنے کچھ زیور بھی نکال کر پہن لیے تھے اور بار بار اپنے سفید اور سیاہ بال ملے ہوئے سر کو ساری سے ڈھانپ رہی تھیں۔ بی بی نے گہری بری کتان کی ساری پہنی تھی اور بقول شخصے دھڑے کی مستی میں ان کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ بی بی نے جانے اپنا حسن کہاں محفوظ رکھا تھا کہ اس کی چمک دمک ماند ہی نہیں پڑتی تھی۔ حالانکہ انہوں نے اپنا حسن پہلے بتول اور بشیر کو بانٹا۔ پھر چاند نے اس کے حصے بخرے کیے۔ مگر ان کی ہنسی آج بھی واحد حسین کے لیے ایک کا فرادا کا وہ التفات تھا جو ان سے غزلوں پر غزلیں لکھوائے چلا جاتا۔

پھر لنگڑی پھوپھو آئیں اور انہوں نے موقع کے لحاظ سے بی بی کو ضروری زیور پہنائے۔ کہیں جاتے وقت بھاج کا بناؤ سنگار کرنا نندوں کا حق ہوتا ہے اور لنگڑی پھوپھو نے ہمیشہ اس فرض کو خوشی خوشی پورا کیا تھا۔ گلے میں ست لڑا اور چندن بار اور ٹھستی۔ دسوں انگلیوں میں دس انگوٹھیاں۔ اور سفید رنگوں کے بھر بھر کلائیاں جوڑے کے پیچھے کڑے اور سامنے لنگن۔ پھر بھی زیوروں کی صندھ فچی جوں کی توں بھری رہی تو لنگڑی پھوپھو رضیہ سے کہتی رہیں کہ وہ کچھ اور زیور پہن لے۔ کیوں کہ رضیہ نے صرف جڑاوی لچھے کے ساتھ چاند بالیاں پہنی تھیں، جو اودی کتان کی ساری پر بڑا غضب ڈھا رہی تھیں اور چاند کی ہدایت تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی بے جوڑ زیورمت لا دتا۔ لہذا رضیہ نے لاکھ اصر پر بھی کچھ نہ پہنا۔

بی بی۔ آپ یہ زیوروں کی صندوقچی بھی ہمارے ساتھ لے چلئے ناسب کو دکھا دیں گے۔ غزل کی اس بات پر بی بی ” کو ہنسی آ گئی اور لنگڑی پھوپھو نے غصہ میں کہا۔

”! اوئی کیا بھولی بچی ہے ماں یہ۔ کیا ہم سب کو دکھانے کے لیے زیور پہن رہے ہیں“

البتہ چاند نے سخت اصرار کے باوجود کسی زیور کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آج اس نے بیگم پارہ کی طرح نیچے گلے اور بغیر آستینیوں والا سونے کا بلاؤز پہنا تھا۔ یہ بلاؤز اتنا اونچا تھا کہ اس کی گوری کمر گہری نیلی جارجٹ کی ساری میں سے خوب چمک رہی تھی اور جب کسی کام کے لیے وہ ذرا سی جھکتی تو غزل فوراً ادھر ادھر دیکھنے لگتی کہ کہیں کھلے گلے میں سے جھانکتے ہوئے چاند آپا کے ننگے بدن پر اس کی نظر نہ پڑ جائے۔ آج چاند پورے دو گھنٹے تک بیر ڈریسر کے ہاں جا کر بیٹھی تھی۔ اس کے بال سامنے سے تاج کی طرح اوپر چڑھائی چڑھتے چلے گئے تھے اور پھر نیچے کی طرف لہروں اور دائروں کی شکل میں گر رہے تھے، مچل رہے تھے، چاند کے دیکتے ہوئے گالوں کو چھو لینے کے ارادے سے کانپ رہے تھے۔ سفید ننگی کلائیوں پر صرف سیاہ اسٹریپ کی ننھی سی گھڑی تھی۔ اور سادہ مخمل کی چپل۔ اس سادگی میں چاند ایسی چمک رہی تھی کہ رضیہ تو اچھل پڑی۔

اللہ چاند تو آج بڑی لائٹ مار رہی ہے۔“ وہ چاند سے لپٹ گئی اور چاند نے بڑی مشکل سے اپنے گلے اور گالوں کو ” رضیہ کے لپ اسٹک والے ہونٹوں سے بچایا۔ چاند باہر آئی تو لنگڑی پھوپھو نے آنکھیں کھول کر پہلے تو اسے دیکھا اور پھر مسحور ہو کر بولیں۔

اونی اماں یہ کون سا اجاڑ فیشن ہے کہ بال سارے منہ پر بکھرے ہیں۔ اور لٹنور نے ہاتھ لیے چلی جارہی ہیں۔ ”لنگڑی“
پھو پوکو بھی چاند اس وقت بیحد پیاری لگ رہی تھی مگر وہ اعتراض برائے اعتراض کی شدت سے قائل تھیں۔

فوزیہ کی آیا نے اسے بہت دیر ہوئی تیار کر دیا تھا۔ اس نے مخمل کا سرخ فراک پہنا تھا۔ سرخ ربن بالوں میں باندھی تھی۔ اور سرخ جوتوں کے پھندوں کو اچھالتی ادھر ادھر کرتی پھر رہی تھی۔ آج کیوں کہ خواتین کو جاتا تھا۔ لہذا ایک مرد کی حیثیت سے شاہین نے وہاں جانا پسند نہیں کیا اور اسکول چلا گیا۔ البتہ غزل بار بار فوزیہ کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اپنے اس پرانے فراک کو دیکھتی۔ جو فوزیہ کا تھا اور بی بی نے رضیہ سے مانگ کر اسے پہنا دیا تھا۔ اسی لیے فوزیہ آج غزل کی ہر نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی اور غزل حسب عادت جب فراک کا کونا دانتوں سے پھاڑتی اور دلہن کے بھائی کو مار کے بھاگتی تھی تو جتادیتی تھی کہ اس کا فراک پھٹ جائے گا۔

مگر غزل اس وقت دلہن کے بھائی کو ستانے پر تلی ہوئی تھی دلہن کا بھائی گیارہ بارہ سال کا منحنی سا ہونفوں کی صورت لڑکا تھا۔ وہ بیچارہ دالان میں ایک کرسی پر بیٹھا غزل کے مکے اور دھکے محض اس لئے برداشت کر رہا تھا کہ یہ لڑکی غالباً اس کی بہن کی سب سے چہیتی نند بننے والی ہے اس لیے غزل بار بار ٹوپی چھین کر بھاگتی تو وہ کچھ نہ کہتا۔

بی بی نے دلہن کے بھائی کو چائے کے ساتھ گلاب جامن پیسٹری اور بسکٹ کھلانے تو وہ بڑے خلوص سے بولا۔

آپ لوگوں نے کیوں اتنے پیسے خرچ کر ڈالے۔؟

اس کی بات پر رضیہ کو ہنسی آگئی اور اس نے آہستہ سے بی بی سے کہا۔ ”بی بی حامد بھائی کا جوڑا چھارہ ہے گا۔“
”جب سالا ہر چیز کی قیمت پر ابھی سے غور کر رہا ہے تو بیوی بھی ایسی ہی ملے گی۔“

یہ سن کر بی بی اس لڑکے کے پاس آبیٹھی اس کے چہرے پر ایسی کرب آمیز شرافت تھی جیسے وہ کبھی جی بھر کے نہ ہنسا ہو۔ پیٹ بھر کے نہ کھایا ہو اس کے باوجود انتہائی فرمان بردار اور سمجھ دار تھا۔ وہ معمولی سے کاتن کی بغیر استری والا شیروانی پہنے تھا۔ گھر کا دھلا ہوا میلا سا پاجامہ اور کینوس کے جوتے ترکی ٹوپی کا پھند نا نہیں تھا۔ آتے ہی اس نے جھک جھک کر سب کو سلام کیے یہاں تک بسم اللہ بی کے بعد جب وہ شاہین کو سلام کرنے کھڑا ہوا تو وہ غزل کے ساتھ ساتھ چاند کو بھی ہنسی آگئی۔

اس نے آتے ہی سب سے بے تکلفی پیدا کر لی اور ہر ایک کو بھابی جان، خالہ جان اور دادی جان کے خطاب بھی دے ڈالے سب جانے کی تیاریوں میں لگے تھے۔ اس لئے غزل نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا اور کرسیوں پر سے نیچے کود کر دلہن کے بھائی کو اپنے کارنامے دکھانے لگی پھر اس کھیل سے جی بھر گیا تو اس نے مذاق ہی مذاق میں اس دیوانے لڑکے کو دھولیں مارنا شروع کیں۔ اس کی ٹوپی چھین کر بھاگی وہ بیچارہ نہایت اخلاق سے اسے سمجھا تاربا۔

”اجی ہماری ٹوپی لے کر نکو بھاگو۔۔۔ دیکھو آپ کے اماں جان آرہیں۔“

ہماری امی جان تو مر بھی گئے۔“ اس نے نہایت بے فکری سے جواب دیا اور وہ بدستور اس کی پیٹھ پر دھپ رسید کرتی رہی۔

”اچھا آپ کون سے اسکول جارے۔۔۔؟“

انو میری فراک پہنے۔“ فوزیہ نے دلہن کے بھائی کو اطلاع دی۔“

ہائیں بری بات ہے۔ ایسا نہیں بولنا۔ دلہن کے بھائی نے فوزیہ کو سمجھایا۔“

کیوں۔۔۔ کیوں نہیں بولنا۔۔۔؟“ فوزیہ نے پوچھا۔“

ذرا دیر کے لیے کسی کے کپڑے مانگ لیے تو کیا ہوا۔۔۔“ اس نے سمجھایا۔ اتنی دیر میں غزل نے اس کی شیروانی پر ” ایک اور بگٹا مارا اور جو بنستی ہوئی پیچھے کی طرف بھاگی تو سیڑھیوں پر سے لڑھکتی آنگن میں جاگری۔۔۔ پیچھے پیچھے وہ لڑکا بھاگا اور اس نے جلدی سے روتی ہوئی غزل کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔

”نکورو۔۔۔ میری منی۔۔۔ رونا نہیں۔۔۔ آپ کی آنکھیں کتنی اچھی ہیں نا۔ روئے تو خراب ہو جائیں گی۔“

غزل کو منا کر وہ بی بی کے پاس گیا۔

”اب جلدی چلیے نا ہماری آپا نے دو پہر کا کھانا تیار کر لیا ہو گا۔“

”نہیں بھائی۔“

ہم وہاں کھانا نہیں کھا ئیں گے۔“ رضیہ نے کہا۔

”آپ کو کھانا ضرور ہے۔ ہمارے پانچ روپے خرچ ہو گئے ہیں تا۔“

اچھا تو شام کو کھالیں گے۔“ بی بی نے جلدی سے کہاں کہ اس کا جی نہ دکھے۔“

”لیکن آپ لوگ شام تک ہمارے ہاں رہے تو برتن۔۔۔“

برتن کیا۔۔۔؟“ رضیہ نے گھبرا کے پوچھا۔

”جی ہم جن کے ہاں سے برتن لائے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ چار بجے تک واپس کر دو۔“

آپ کی کتنی بہنیں ہیں۔۔۔؟“ اب رضیہ نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی دو ہیں۔ بڑی آپا اسکول میں ٹیچر ہیں۔“

”ان بی کی شادی ہو رہی ہے؟“

جی نہیں۔۔۔ وہ لڑکا گھبرا گیا۔۔۔ بڑی آپا کہتی ہیں۔۔۔ وہ اب شادی نہیں کریں گی۔ اپنی ساری تنخواہ چھوٹی آپا کے جہیز ” کے لیے جمع کر رہی ہیں۔

”اچھا تو وہی تین ہزار گھوڑے جوڑے کے دے رہی ہیں۔“

”جی ہاں۔ ہمارے بھائی جان نے بھی سات سو روپے جمع کئے ہیں چھوٹی آپا کے لیے۔“

”اچھا تو اسی لیے آپ لوگ اتنی جلدی شادی کرنے والے ہیں جہیز وغیرہ سب تیار ہے۔“

جی ہاں۔۔۔ ہماری اماں جان بولتے چھوٹی آپا کی شادی جلد کر دینا نہیں تو انوں بھی بڑی آپا کی طرح بولنے لگیں گی ” کہ میں شادی نہیں کرتی۔

خیر سب کاروں میں لد کر چلے تو رضیہ کا دل ان لوگوں سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اور اسے شک تھا کہ ایسے پھٹیچر لوگ ہرگز تین ہزار نقد نہیں دے سکتے۔

وہاں جا کر یہ لوگ ایک چھوٹے سے بے سروسامان صاف ستھرے گھر میں اترے، جہاں نہایت مدقوق مسکین صورت دو خواتین نے ان کا استقبال کیا۔ ایک دلہن کی ماں تھیں اور دوسری بڑی بہن۔ دونوں حد سے زیادہ نحیف و نڈار۔ اس لیے فوزیہ

اور چاند بہت بور ہوئیں کہ ان کا فیشن اور چمک دمک سراہنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک دلہن کی بڑی بہن تھیں۔ تئیس پینتیس برس کی سوکھی کانتھا۔ جب کبھی انتہائی ضرورت پر مسکرانا چاہتیں تو یوں لگتا جیسے رونا چاہیں اور رونہ سکیں۔ دلہن کی ماں تھیں تو یوں ہانپتی کا نپتی مسلسل لمبی لمبی سانسیں لیے جارہی تھیں۔ اتنی سنجیدہ فضا کو دیکھ کر غزل تو فوراً اڑوس پڑوس کی اس لونڈ ہیا میں شامل ہو گئی جو ایسی زرق برق خواتین کو دیکھ کر اکٹھی ہو گئی تھی۔ اب وہ نہایت بے فکری سے آنگن میں بیٹھی بی بی اور لنگڑی پھوپو کی نقلیں اتار رہی تھی۔ پھر آم کے درخت پر کیریاں دیکھ کر فوراً بندر یا کی طرح درخت پر چڑھ گئی یہ دیکھ کر فوزیہ اور دلہن کا چھوٹا بھائی سرور چلانے لگا۔ فوزیہ کو اپنی فراک کے پھٹنے کاڑ رتھا اور سرور کو کیر ہوں کا۔

اجی غزل بیگم جھاڑ سے نیچے اترو۔۔۔ یہ آم ہم پارڈی کے ہاتھ بیچ دیے۔ ایک بھی کم ہوا تو وہ پیسے نہیں دے گا۔ ”

”چھی۔۔۔ تم لوگ اتنے کنجوس کیوں ہو۔ خود کیوں نہیں کھاتے۔؟“

غزل کو درخت پر چڑھتا دیکھ کر بی بی اور رضیہ بھی گھبرا گئیں۔

ارے بی بی ابھی کچے پھل ہیں۔ کھاؤ گی تو کھانسی ہو جائے گی۔ دلہن کی اماں نے نہایت رسان سے کہا۔

اصل میں ہمارے ہاں کسی کو آم پسند نہیں ہیں۔ اس لیے ہم نے اس درخت کی فصل بیچ دی ہے۔ ضائع کرنے سے کیا ”
”!فائدہ۔۔۔

جی ہاں۔۔۔ اچھا کیا۔۔۔“ بی بی نے تائید کی۔

اری غزل کی بچی۔۔۔ جلدی اتر۔۔۔ آج تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔“ نیچے سے لنگڑی پھوپو دانت کٹکٹارہی تھیں۔

نیچے اتر کر غزل کھانے پر ٹوٹی۔۔۔ اور مرغ سے لے کر شامی کباب تک نگل ڈالے کھانے کے دوران دلہن کی بہن نے گرانی کا مسئلہ چھیڑ کے بتادیا کہ مرغ پورے دو روپے کا تھا اور کھانے پر دس بارہ روپے خرچ ہو گئے ہیں۔

پھر غزل ان بند کمروں کے معائنے میں مصروف ہو گئی جن میں سارے گھر کا ٹوٹا پھوٹا سامان سمیٹ کر ان پر میلی چادر میں ڈال دی تھیں۔ اس کھڑاگ میں سے دو ایک تصویروں والی کتاب نکال کر لائی اور اچھے اچھے فوٹو پھاڑ کے کھانے بیٹھ گئی۔ ابھی دو تین فوٹو بھی نہ چبائے تھے کہ سرور آ گیا اور کتاب کی حالت دیکھ کر اسے کسی نے آگ میں جھونک دیا۔

”یہ کیا کر دیا ! پورے اٹھ آنے کی کتاب تھی۔“

”اس نے کتاب غزل کے ہاتھ سے چھینی تو غزل نے اس کا منہ چڑا دیا کنجوس مکھی چوس۔

جب دلہن کی اماں اور بہن دلہن کو لانے اندر گئیں تو لنگڑی پھوپو نے آہستہ سے کہا کہ مجھے تو یہ لوگ تین ہزار نقد دینے والے نظر نہیں آتے۔ اس لیے ان سے جہیز اور نقد رقم کی فہرست لے لینا چاہیئے۔ تا کہ ایسا نہ ہو کہ بعد میں حیل و حجت کریں اور حامد میاں یچارے ٹاپتے رہ جائیں۔ دلہن بھی اپنی بہن کی طرح بڈی چمڑے کا ڈھیر تھی۔ لمبی تاڑ کا جھاڑ۔۔۔ صورت شکل بھی بس کام چلاؤ۔

جہیز میں ہم دس برتن دیں گے۔ گیارہ جوڑے۔۔۔ جو ساری میں پہنے ہوں۔۔۔“ چالیس روپے کی ہے۔ یہ بھی جہیز ہی میں ”
دیں گے۔“ دلہن کی بہن نے جہیز کی فہرست کا رعب جمانا شروع کیا۔

اچھا تو آپ ہمیں جہیز کی فہرست ابھی لکھوادیں۔ اور اگلے جمعہ کو ”پاؤں ملیں“ کی رسم کر کے گھوڑے جوڑے ”
کے تین ہزار بھی دیدیں۔“ لنگڑی پھوپو نے بات صاف کر دی۔

ابھی۔ یہ کیسا ہو سکتا ہے!“ دلہن کی اماں ہکلانے لگیں۔

ہم تھوڑا تھوڑا کر کے جہیز جمع کر رہے ہیں۔ لیکن آپ ہماری بات پر یقین کیجئے۔ ہم کوئی ایسے ویسے لوگ نہیں ہیں۔ بچوں کے باپ کا بے وقت انتقال نہ ہوتا تو میں آپ کو لاکھوں کا جہیز دیتی۔“ لنگڑی پھوپھو نے منہ بنا کر ادھر ادھر دیکھا۔

اے ذرا پان لانا بھئی۔ پان نہ کھانے سے منہ دکھ رہا ہے۔“ بی بی نے جمائی لے کر کہا۔

ابھی بازار سے منگواتی ہوں۔ دلہن کی ماں نے ساڑی میں اڑی ہوئی میلی سی کپڑے کی تھیلی میں جیسے تلاش کیے۔

“! کیا بتاؤں خالہ جان میں نے پان کھانا چھوڑ دیا ہے۔ جوان لڑکیاں سامنے ہیں۔ کچھ آگے کی بھی سوچتا ہے نا ”

جب وہ لوگ جانے کے لیے اٹھے تو دلہن کی اماں نے پھر جہیز کی فہرست دہرائی۔

ان کے چچا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ منہ دکھائی میں دولہا کوسونے کی انگوٹھی دیں گے۔ اور ان کی پھوپھی لاکٹ دینے ”والی ہیں۔“

آپ سے ایک سچی سچی بات کہہ دوں۔۔۔؟“ دلہن کی بہن نے رکتے رکتے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

ڈیڑھ ہزار روپے تو ہم ابھی دے سکتے ہیں اور باقی ڈیڑھ ہزار روپے میں ہر مہینے سو روپے کر کے ادا کر دوں گی۔“

آپ لوگ ہماری زبان پر یقین کر لیجئے۔ آخر بڑے لوگوں کی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔“ ان کی امانگھگھپائی۔

یہ سن کر سب چونک پڑے۔

ادھار۔۔۔؟ ہائے اللہ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کہیں جوڑے کی رقم بھی ادھار ہوتی ہے۔۔۔؟“ لنگڑی پھوپھو نے تنک کر کہا۔

اور بھئی آپ کی بیٹی کی تنخواہ کا کیا بھروسہ۔ کل ہی کہیں شادی ہوگئی تو ان کے شوہر کیوں ادا کرنے لگے۔ آپ ”ہمیں پکے کاغذ پر لکھ کر دے دیں گی کیا۔۔۔؟“

میری شادی؟“ اولین کی بڑی بہن کہیں خلاء میں گھورنے لگی۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ مجھ سے؟ میرا مطلب ہے اب میری شادی۔ کیا میں کہیں جاسکتی ہوں۔۔۔؟“

اس نے گردن اٹھا کر رضیہ سے پوچھا۔ رضیہ نے اس کے سر پر کھلتی ہوئی دھوپ چھاؤں دیکھی۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا شام کا اندھیرا دیکھا اور لاجواب سی ہوگئی جیسے واقعی پکے کاغذ پر لکھوانے کی ضرورت نہ رہی ہو۔

جاتے وقت غزل پھر سرور کے پاس گئی اور اسے دھکا دے کر بولی۔

کنجوس مکھی چوس۔۔۔ اجاڑ صورت گدھے سور۔ آلو۔ پھر اس نے مارنے کو ٹانگ اٹھائی تھی کہ اوپر سے لنگڑی ”پھوپھو کی ٹوٹی ٹانگ کے دھمو کے اور مکے برسنا شروع ہو گئے۔“

اجی نکو مار وخالہ، بے ماں کی بچی ہے۔“ دلہن کی ماں کو ترس آ گیا۔ وہ سارے چہرے پر ناک اور آنسو لپک کر ”روں روں کر رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ سرور کی ناک سے خون نکل رہا تھا اور وہ بڑے صبر کے ساتھ نل کے نیچے بیٹھا غزل کو دیکھ رہا تھا۔

کار اسٹارٹ ہونے لگی تو وہ دوڑتا ہوا آیا اور خوشامد بھرے لہجے میں غزل سے پوچھنے لگا۔

”اب تو کبھی میرے کو نہیں ماریں گے نا۔۔۔؟“

جواب میں غزل نے اس کا منہ چڑا دیا۔

جب کار آگے بڑھی تو لنگڑی پھوپھو نے کہا۔

”ان کی ذمہ داری کوئی نکولو۔ یہ لوگ تو پانچ سو دینے والے بھی نظر نہیں آتے۔۔۔“

مگر آتے ہی رضیہ نے حامد بھائی کو خط لکھا۔

آپ کی سسرال والے بہت بڑے لوگ ہیں۔“

وہ تین ہزار ضرور دیں گے۔ اس کی ذمہ داری میں لیتی ہوں۔

اتنی چکا چوند اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔

اسٹیج کے بیچ میں ایک روشنی کے دائرے میں محصور و ممانی بیگم کی چوتھی کا دوپٹہ اوڑھے بال کھولے، ایک خاص پوز بنائے ساکت بیٹھی تھی۔ چاند آیا نے جتادیا تھا کہ ملک بھی جھپکائے تو سارا کام چوپٹ صورت ہے۔ ہو جائے گا۔ حالاں کہ لپ اسٹک لگانے سے اس کے ہونٹوں میں سخت بے چینی سی تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں والے ایک مرد نے اس کے چہرے پر جانے کتنے رنگ تھوپ دیئے تھے۔ دوپٹہ کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرن لگنے سے اسے ہنسی سی آرہی تھی۔ اچانک اسٹیج کی روشنیاں بجھ گئیں اور سامنے والا پردہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ اسٹیج کے ایک کونے میں مائک کے سامنے کھڑی چاند آیا بڑی سریلی آواز میں گا رہی تھیں۔

تیرے سروقامت سے اک قد آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

وہ انگڑائی لینے کے انداز میں جانے ساکت ہو چکی تھی یا ہوا مینمل گئی تھی۔ وہ آنکھوں میں پانی لانے والی تیز روشنی اوپر سے آرہی تھی یا پیچھے سے۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نیچے بال میں بھرے ہوئے ہجوم سے وہ نا واقف تھی، جو اسے دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا۔ صرف دھند کا ایک بادل تھا بادل پر لکیر ڈالتی ہوئی چاند آیا کی آواز۔

اسٹیج کا پردہ گر گیا۔ روشنیاں بجھ گئیں۔ چاند آیا کے فہمے اتنے شور میں صاف پہچانے جارہے تھے۔ وہ جانے کس کس کی خوشبو دار گوروں میں اُچھالی جارہی تھی۔

”آپ تو واقعی قیامت کے فتنے کو آج جانے کہاں سے لے آئیں۔“

”کمال ہو گیا صاحب۔۔۔ چاند کو آج مان گئے۔“

تھینک یو۔۔۔ تھینک یو۔۔۔“ چاند پھولوں کے گل دستے لیتے لیتے تھکی جارہی تھی۔

ممانی بیگم کے زیور اتارتے وقت اس کا جی دکھ رہا تھا۔ اتنے لوگوں نے اسے پیار کیا۔ مگر چاند آیا نے نہیں۔۔۔ پھر اس وقت اللہ میاں نے چاند آیا کو حکم دیا کہ وہ غزل سے آکر لیٹ جائیں اور اسے خوب پیار کریں۔ اس وقت غزل کو خوب اکڑنا چاہیئے مگر چاند آیا کے پیار نے اس کی پیاسی روح کو مدبوش سا کر دیا۔

دور اسٹیج کے اندھیرے کونے میں بیٹھے ہوئے ہمایوں نے آج پہلی بار غور کیا کہ غزل کافی خوب صورت ہے۔

باہر نکلنے کے بعد جب غزل ایک ایک سے تعریف اور شاباشی وصول کر رہی تھی تو اچانک کسی نے اوپر اٹھالیا اور اس کے گال پر زور سے پیار لے کر کہا۔

”تم نے سنا سنجیو آ۔۔۔ اس لڑکی کا نام غزل ہے غزل۔“

”اب خدارحم کرے حیدر آباد کے شاعروں پر۔“

چاند ہنسی کے مارے دو ہری ہو گئی۔

مجھے چھوڑیے۔۔۔“ اسے جانے کیوں اس آدمی کی گود سے وحشت ہو رہی تھی۔

نہیں اب تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔“ اس نے اپنے گالوں کے سخت بال پھر غزل کے چہرے سے رگڑے۔

چھوڑ دیجئے بھان صاحب اسے۔“ چاند نے سچ مچ برامان کر کہا۔

بڑی حسین ہے تمہاری بہن۔ تم تو اس کے سامنے ایک مطلع ہو۔ آرٹسٹ سعادت نے چاند سے کہا۔ ”

نہیں۔۔۔ مقطع۔۔۔“ کسی نے کہا اور سب ہنس پڑے۔ ”

”اچھا تو خواتین و حضرات۔ آپ سب پر سیز چلئے۔ ایک نئی آرٹسٹ کے آخر میں وہاں ڈنر ہے۔“

”آپ لوگ جائیے۔ میں ذرا سنجیو آ کے ساتھ جاری ہوں۔“

چاند سنجیو آ کا ہاتھ پکڑے اسے ڈھکیلتی ہوئی کسی طرف لیے جارہی تھی۔

اتنی دیر میں بہان صاحب کچھ اور خوبصورت خواتین کو اپنی بانہوں میں سمیٹ چکے تھے۔

آپ چلئے۔“ بہان صاحب نے جھک کر بڑے ادب کے ساتھ غزل سے کہا۔ ”

یہ رات میں کہاں جائے گی۔ سو جائے گی۔۔۔“ راشد نے کسی قدر ترش رو ہو کر کہا۔ ”

کار میں راشد اور رضیہ بے حد غصے میں بھرے ہوئے تھے۔

کئی بار راشد نے راہ گیروں کو ٹکر دینا چاہی۔ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی غزل کو وہ دونوں یوں بھولے بیٹھے تھے جیسے غزل آج انھیں اسٹیج پر نظر آئی تھی۔ نہ اب ان کے پاس کار میں ہے۔ کسی کے منہ سے تعریف کا ایک لفظ نہیں نکلا۔ راشد ماموں تو بہت غصے میں بڑبڑاتے جا رہے تھے۔

”سب کے سامنے میں کیسے روک لیتا۔ مگر تم تو سمجھا سکتی تھیں۔“

میں کیسے روک لیتی۔ جب سے سنجیو آ کو دیکھا تھا وہ تو بے قرار ہوئی جارہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی دلہن ممانی پلیز اس وقت مجھے مت رو کیے۔

”بس تم نے جانے دیا۔ یہ سب تمہارا ہی دلا رہے۔“

اوئی میرا دلار کیوں ہوتا۔ اللہ اس کے ماموں اور نانا کو سلامت رکھے۔“ رضیہ نے تنک کر کہا۔ ”

وہ تو دیکھ لینا اس دھمیڑ سے شادی کریگی۔ آخر بے کس باپ کی بیٹی۔ باپ نے بھی تو ایک ہندو عورت کو ڈال لیا ” بے۔“ جانے رضیہ کی بات میں کتنا ہر تھا کہ راشد نے جواب تک نہ دیا۔ صرف کار کی اسپید بڑھادی۔ جیسے کسی دیوار سے ٹکرا کے مرجانا چاہتا ہے۔

چاند آپا سنجیو آ چا چا کے ساتھ گئی ہیں۔“ غزل اب سمجھ گئی تھی کہ وہ دونوں چاند سے خفا ہیں۔ ”

تجھ سے کس نے کہا۔“ ماموں نے پلٹ کر پوچھا۔ ”

”کل سنجیو آ چا چارو ٹھے تھے نا کہ چاند آپا اسٹیج پر کیوں آتی ہیں تبھی تو چاند آپا دو پہر کوروری تھیں۔“

کیا سنجیو آ وز سوسائٹی کے آفس میں آتا ہے۔“ ممانی بیگم نے پوچھا۔ اچانک غزل کو احساس ہوا کہ وہ بڑی اہم بستی ” بن گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ماموں اور ممانی اس کی بات سن رہے تھے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سنجیو آ چا اور چاند آپا کی سب باتیں انھیں سنادے تا کہ ماموں چاند آپا کی شادی سنجیو آ چا سے کر دیں ورنہ وہ زہر کھا کے مرجائیں گی اور یہ بھی سنادے کہ ایک دن وائلن بجائے والے لونیس نے چاند آپا سے کچھ کہہ دیا تھا تو سنجیو آ سے مارکٹائی ہوئی تھی اس کی۔ اور ایک دن بہت دنوں بعد سنجیو آ آپا تو چاند آپا میک اپ روم میں تھیں اور ڈرامہ شروع ہونے والا تھا۔ مگر وہ سب چھوڑ کر سنجیو آ

کے ساتھ چلی گئیں۔ پھر بہان صاحب بہت خفا ہوئے۔ انہوں نے چاند کا اسکرپٹ اٹھا کر غزل پر پٹک دیا تو غزل کے ساتھ وہاں بیٹھے ہوئے تمام آرٹسٹوں کو ہنسی آ گئی تھی۔ غصے میں بہان صاحب ناچ ناچے پھر رہے تھے اور ان کے

چکنے سر پر پسینہ موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔

اس نے یہ سب باتیں ممانی بیگم کو بتادیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ”چاند آیا کی بیرے والی انگوٹھی کہیں گری تھوڑی ہے!“ انہوں نے زبر دستی قسم دے کر وہ انگوٹھی سنجیو آ چا چاک دے دی ہے۔

صبح ہمایوں نے دیکھا کہ غزل وہی اسٹیج والی کالی شامو کی فراک پہنے اچک اچک کر آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔

اب یہ فراک واپس کر دے۔ میں تجھے نئی فراک بنوادوں گا۔“

ہمایوں نے زندگی میں پہلی بار اپنی آواز میں انتہائی حلاوت گھول کر غزل سے کہا۔

بھان صاحب نے یہ فراک مجھے دے دیا ہے۔“ اس نے دلی مسرت سے مژدہ سنایا اور بڑے پیار سے فراک کی ”چکنی سطح پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

آج تو میں یہی فراک پہن کر اسکول جاؤں گی۔“

اس فرا کہ کو جی بھر کے میلا کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس لیے کمرے میں جا کر اس نے میلے فرش پر خوب لوٹیں لگائیں تا کہ فراک پر اپنی ملکیت کا احساس مستحکم ہو جائے۔ پھر دانتوں میں دبا کر خوب کھینچا تانی کی۔ اس کے بعد نل کے پاس جا کر فراک پر گرنے والے پانی کے قطروں کا تماشہ دیکھنے لگی۔

اب ہمایوں کو احساس ہوا کہ وہ اپنی سالی کی اس تعلیم یافتہ خوبصورت بیٹی سے خواہ مخواہ بدظن تھا۔ چلو مان لیا کہ وہ خالو پاشا کو کوئی لفٹ ہی نہیں دیتی اور کالج کے لفنگے لونڈوں کے پیچھے گھومتی ہے۔ یہ مگر دل کی اتنی بری نہیں ہے اب بھی دیکھو کہ غزل سے تھوڑا سا کام کروالیا تو مفت میں ایک فراک مل گئی۔

چنانچہ ایک بار پھر وہ ایوان غزل جانے لگا اور گھنٹوں، چاند کے پاس بیٹھا غزل کو اداکاری سکھانے کے مسئلے پر بات چیت کرتا تھا۔

ہیں۔ ہمارے ڈراما کلب کے پریسیڈنٹ بھان صاحب تو کہہ رہے (TALENT) خالو پاشا غزل میں اداکاری کے بہترین ”تھے کہ غزل اسٹیج ہی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اب آپ غزل کو مجھے دے دیجئے۔ میں اسے خوب پرفیکٹ کردوں گی۔

”مگر ہمارے مرشدوں میں بچیوں کو اسٹیج پر۔۔۔“

بس بس۔ رہنے دیجئے یہ پرانے باتاں۔ آپ بھی نا ناخضت سے کچھ کم نہیں ہیں۔“ غصہ کے مارے چاند نے اپنے بالوں ”کی لٹیں کھسوٹ ڈالیں۔

اور ڈر کے مارے ہمایوں سہم گیا۔ واقعی وہ کیا جانے کہ تعلیم یافتہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔

صبح بھان صاحب کی کار میں چاند غزل کو لینے آئی تو ہمایوں کا تاریک گھر اس کے وجود سے منور ہو گیا۔ ہمایوں بد حواسی میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ اس نے اپنے کرتے سے کرسیاں صاف کیں۔ بھان صاحب کی کار کا دروازہ کھول کر انہیں اندر لایا اور ایاز کو دو چار گالیاں دے کر دوڑایا کہ بوٹل سے دو کپ چائے لے آئے۔ مگر دونوں پیالیوں پر رکھے رکھے پیڑی جمتی رہی اور کھیاں بھنکتی رہیں۔ کیوں کہ چاند اتنی گندی پیالیوں میں بازاری چائے نہیں پیتی تھی اور بھان صاحب کی چائے کا وقت نہ تھا۔ وہ کھڑے رہے اور بار بار گھڑی دیکھے جارہے تھے۔ اس لیے اندر آ کر سستی سے کپڑے بدلنے پر ہمایوں نے ایک لات غزل کی پیٹھ پر جمائی اور ہاتھ پکڑ کے کار میں لا پٹکا۔ چوٹ لگنے سے غزل دیر تک روتی رہی۔ اور بار بار ناک سٹرسٹر کرنے پر چاند نے اسے پلٹ کر ڈانٹ دیا۔

شام کو وہ سب واپس آئے تو چاند نے اکٹھے پچیس روپے ہمایوں کو دیئے۔

”یہ غزل کے آنے جانے کا کرایہ ہے۔“

، تاریخ تھی اور جب ٹھنڈا چولاسلگانے کے لیے بار بار سایا نے اصرار کیا تو ہمایوں نے اُسے ڈانٹ دیا تھا۔ آج ہمایوں نے آنکھیں پھاڑ کر کبھی روپوں کو دیکھا اور بھی چاند کو۔

یہ واقعی روپے تھے۔

اب آفس سے واپس آنے کے بعد سایا کے نخرے سہنے کے بجائے ہمایوں کا سارا وقت ”ایوان غزل“ میں گذرنے لگا۔ جب ڈرامے میں چاند کام کرتی تھی اس کے سارے انتظامات وہ سنبھال لیتا۔ آرٹسٹوں کے گھر دوڑا جارہا ہے۔ ان کے لیے چائے کا انتظام کر رہا ہے۔ غزل کو مار مار کے ڈائلاگ یاد کروا رہا ہے۔۔۔ ہمایوں نے زندگی میں اتنی کڑواہٹ پی تھی کہ اس کے پاس اپنی بات منوانے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا۔۔۔ مار۔۔۔ یہ نسخہ اس نے ہر اس شخص پر آزمایا جسے مارنے کی قدرت اللہ میاں نے اسے عطا کی تھی۔

بہر حال غزل کے تو نصیب جاگ اٹھے تھے۔ اس کے پاس دو تین نئی فراکیں آگئی تھیں۔ بالکل فوزیہ کی فراکوں کی طرح چمکتی ہوئی۔ اماں کے مرتے ہی اسے ہر طرف سے دھکے ملے تھے۔ مگر اب تو یہ حال تھا کہ رضیہ اپنی سہیلیوں کو غزل کا گانا سنوائی تھی۔ چاند کے سارے دوست اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ وہ چاند آپا کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر سوسائٹی کے آفس جایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی لوگ چاہتے تھے کہ غزل ان کے ڈراموں میں کام کرے کیوں کہ اتنی ننھی سی لڑکی اسٹیج کے لیے کہیں نہیں ملتی تھی۔

صرف ایک حسد کی ماری فوزیہ تھی جو ابھی تک اسے وہی ناک ٹپکاتی ندیدی غزل سمجھتی تھی۔ رضیہ، فوزیہ کے سامنے سے بچا ہوا انڈے کا ٹکڑا اور روٹی کا نوالہ دے دیا کرتی تھی۔ اس روٹی کے انتظار میں وہ فوزیہ کو کھاتے دیکھ کر اس کے پاس جا بیٹھتی اور کسی طرح نہیں بہتی تھی۔

اب تو اس نے مارے تہذیب کے نانا سے لے کر شاہین تک کو آپ سے مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی فیاضی سے شاہین کو اپنے چاکلیٹ کھلاتی تھی۔ تحفوں کا کوئی شمار تھوڑی تھا۔ ٹافی کے ڈبے، کھلونے۔۔۔ فراکیں اور گڑیاں۔

ایاز اور شہزاد حسد کے مارے مرے جاتے تھے۔ ایاز بھی فلمی گانوں کی بڑی اچھی کاپی کرتا تھا۔ مگر اسے کوئی بھی نہ پوچھتا غزل شان کے مارے اکٹڑتی پھرتی۔

”رات ہمیں چاند آپا نے ایک ہوٹل میں لال لیمن پلایا تھا۔“

”پرسوں میڈیکل کالج میں یہ بڑی پیسٹری میں نے کھائی۔“

”بھان ماما نے کہا ہے کہ وہ میرے لیے ساری لائیں گے۔“

ساری۔۔۔ ایاز نے تعجب سے پوچھا۔ وہ غزل کی باتوں میں بیٹھا تھوک نگلا کرتا تھا۔ جب سے ابا کی توجہ غزل پر گئی تھی وہ دونوں بھائی ادھر ادھر آوارہ گردی کرتے پھرتے۔

ہاں۔۔۔ چاند آپا نے ان سے ساری کی فرمائش کی۔ میں نے بھی کی۔ اب میں بھی ٹاڈیا کی طرح سچ مچ کے گھوڑے پر ”بیٹھ کر لڑوں گی۔“

پھر تو بھی ناڈیا کی طرح دوزخ میں جلے گی۔“ ایاز نے جل کر کیا۔ ”

کیا۔۔۔؟“ وہ دھک سے رہ گئی۔ پلاسٹک کی گڑیا اس کے ہاتھ سے چھٹ کر گر پڑی اور وہ پلنگ کے باند کھسوٹنے لگی۔

اماں کہتی تھیں ناڈ یا دوزخ میں جلے گی۔ خوف کے مارے اس کے بدن میں کی کپکپی سی آگنی مگر ایاز کی وجہ سے ضبط کئے بیٹھی رہی ایک دم ایسا لگا جیسے چاند آیا کی محبت چیل جھپٹ کر لے گئی ہے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ اب دوزخ کا داروغہ ابا کی طرح باہیں پکڑ کے اسے آگ میں ڈھکیلنے آئے گا اور سانپ اپنی زبان کھولے اس کی طرف لپکیں گے۔ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔ مگر کوئی راستہ نہ ملا۔ پھر ایک سانپ پھن کھول کر آگے بڑھا اور وہ اچھل پڑی۔ ابا نے ایک روپیہ اس کی گود میں پھینکا تھا جو انگارے کی طرح اس کی پنڈلی کو جھلسا گیا۔۔۔ پھر ایک اور۔۔۔ پھر ایک اور ابا بڑے موڈ میں روپیہ پر روپیہ اچھال رہے تھے اور وہ چرکوں کی جلن سے رو پڑی۔

کیا ہوا۔۔۔؟“ اس نے پہلی بار ابا کے لہجے میں اتنی مٹھاس محسوس کی۔ ان کے مہربان ہاتھوں میں کتنی گرمی تھی۔ ”اپنے سینے سے لگا کر انہوں نے اتنی محبت سے پوچھا کہ اگر غزل پہلے سے نہ رورہی ہوتی تو اب ابا کی اس عنایت پر رو پڑتی۔ ابا کے بار بار پوچھنے پر بھی وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

تو پھر کیوں موت آرہی ہے۔۔۔؟“ وہ چلانے لگے۔

”میں ڈراموں میں کام نہیں کروں گی۔ فرشتے مجھے دوزخ میں ڈال دیں گے۔“

کیا۔۔۔؟“ ابا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ”

”اماں کہتی تھیں کہ نا ڈیا دوزخ میں جائے گی۔“

تمہاری اور تمہاری اماں کی۔۔۔“ ابانے ایک عام سی گالی دی۔

تم دونوں نے ہمیشہ وہی کام کیا جس سے مجھے تکلیف پہنچے۔ بیجاری چاند نے چار پیسے کی صورت پیدا کر دی ”ہے تو اب تیرے نخرے بڑھنے لگے۔۔۔ سالی فاقے کرا دوں گا۔ اگر کچھ چیں میں کی تو۔۔۔“ دوسرے دن رضیہ نے یہ بات سنی تو خوب ہنسی۔

اری تو انے اور کون سے اچھے کام کئے ہیں جو دوزخ سے بچ جائے گی!“ ایک دن اس نے چاند آپا سے بھی یہ بات کہنا چاہی مگر وہ اپنے آپے ہی میں نہ تھیں۔ نہ جانے کس بات پر اس دن ہمایوں اور چاند کے درمیان چل گئی تھی۔

”وہ حقے کی صورت بڑھا کھوسٹ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے“

چاند کا غصے کے مارے برا حال تھا اور وہ خواہ مخواہ الماری میں سے کپڑے نکال نکال کر چاروں طرف پھینک رہی تھی۔

”ہونہ مجھ سے اظہار عشق کرنے چلا ہے پہلے مر کی نالے میں منہ دھو آئے۔“

رضیہ بڑی شرمندہ سی ہو کر اسے چپ کرانے میں لگی ہوئی تھی۔

”اب چپ بیٹھو جی۔ تمہارے ماموں سن لیں گے۔“

دالان میں کھڑی ہوئی غزل آنکھیں پھاڑے چاند آپا کو تک رہی تھی اس وقت ان کے کٹے ہوئے بال سارے چہرے پر بکھر گئے تھے اور منہ چولہے میں دبے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

چاند آپا ہم آگئے۔۔۔“ غزل نے بڑے ناز سے اٹھلا کر اپنی آمد کی خوشخبری سنائی تاکہ وہ غصہ بھول کر مسکرانے لگیں۔ مگر غزل کو دیکھ کر تو چاند کو پر کسی نے انگاروں میں ڈھکیل دیا۔

اسی چھوکری کو گل پر لگا کے آگے بڑھ رہا تھا۔ چل نکل۔ جا اپنے باپ کے پاس انہوں نے باہیں پکڑ کے غزل کو باہر ڈھکیل دیا۔

”خیر دار۔۔۔ پھر میرے کمرے میں پاؤں رکھا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔“

غزل کا کلیجہ پھٹ گیا۔ اس سے بھی زیادہ کڑوے بول وہ ہنس ہنس کر سہہ جاتی تھی۔ کمرے سے ڈھکیلنا بھی کوئی ایسی بری بات نہ تھی۔ مگر اس وقت غزل کو یوں لگا جیسے چاند آپا کا غصہ وہ بالکل برداشت نہیں کر سکے گی۔ جیسے پہلی بار اس کی ذلت ہوئی ہوچھچھورا شاہین اور چغل خور فوزیہ، دونوں کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

اور کبھی کبھی ہنس رہے تھے۔ دالان کا ستون تھا مے وہ یوں رور ہی تھی کہ اماں کی موت پر بھی نہ روئی ہوگی۔

”جب سے ابا جان نے اس پھٹیچر آرٹسٹ سے ملنے کو منع کیا ہے نا اس کی یہی حالت ہوگئی ہے۔“

اپنے کمرے میں رضیہ لنگڑی پھوپو سے کہہ رہی تھی۔ بیس برس کی ہوگئی اب اس کی شادی کہیں نہ کہیں کرو۔ نہیں تو ایسے ہی دھڑوں چماروں میں جاملے گی لنگڑی پھوپو اپنی پھٹے ڈھول جیسی آواز کو دبا کر کہہ رہی تھیں۔

”میں بھی تو یہی کہتی ہوں۔ مگر زہر دستی کوئی کیسے کرے گا؟“

اللہ میاں۔ چاند آپا کو مر جانے دو۔ اماں کی طرح ان کی بھی قبر بنے۔۔۔ اللہ میاں کوئی بھی چاند آپاسے شادی نکو کرو۔

”

بہت دنوں کے بعد غزل کو آج کو سنے کا موقع ملا تھا۔

چپ چپ۔۔۔ اجاڑ صورت دونوں وقت ملتے کیوں کالی زبان نکال رہی ہے۔“

بی بی نے نماز کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔“

اس کے بعد غزل یتیموں کی سی صورت لیے سب کا منہ تکتی پھرتی کہ کوئی اس پر ترس کھائے۔ مگر اپنے اپنے کاموں میں کسے فرصت تھی کہ اس کی تنہائی پر غور کرتا۔ فوزیہ تو اپنے آپ کو بے حد سگھڑ اور اچھی بچی سمجھتی تھی۔ اس لیے الگ تھلگ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی اور غزل کو کسی بھی کھیل میں شریک نہیں کرتی تھی۔ شاہین کو تو اس کے گندے کپڑے اور گندی عادتوں سے بے حد نفرت تھی۔ وہ کبھی شاہین کا گلاس اٹھا لیتی تو شاہین اسے صابن سے دھوتا تھا۔ ایک دن شاہین سفید قمیص، سفید نیکر اور سفید جوتے پہن کر ٹینس کھیلنے جا رہا تھا تو غزل نے اس کی قمیص کو ہاتھ لگا دیا۔ بس ! غصے کے مارے وہ سارے گھر میں ناچتا پھرا اور دو قمیص بدل کر باہر گیا۔۔۔ ایسے نک چڑھے لڑکے سے کون بات کرتا

ہمایوں کو اس کی صورت ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ سایا کو بھی اس سے جنم جنم کا بیر تھا۔ جب تک بتول زندہ رہی غزل خوب من مانی شرارتیں کر کے سایا کو ستاتی تھی۔ مگر جب سے ہمایوں نے سایا کو گھر کی نائب صدارت سونپی تھی وہ سایا کے سینے پر مونگ دلتی تھی۔ گھر کی اس

بد انتظامی نے ایاز اور شہزاد کو اور شیر کر دیا تھا۔ کئی بار شہزاد گھر سے کوئی چیز لے کر بھاگا اور ہمایوں اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر واپس لے آیا پھر ایک بار وہ ہمایوں کی جیب سے پوری تنخواہ لے کر بھاگا اور کئی مہینے کے بعد اس کا بمبئی کے کسی پولیس اسٹیشن سے خط آیا کہ اگر سو روپے فوراً نہ بھیجے تو وہ پانچ مہینے تک جیل میں سڑے گا۔

سڑنے دو سالے کو۔ وہ اسی طرح ٹھیک ہوگا۔ دماغ کے سب کپڑے جھڑ جائیں گے۔“ ہمایوں نے لا پرواہی سے کہا۔“

شہزاد کے ٹھیک ہونے کی امید سے غزل بھی خوش ہو گئی۔ کیوں کہ لوگوں کو اس کے بھائیوں کی فکر کھائے جارہی ! تھی۔ نا ناحضت اور راشد ماموں اکثر یہی کہتے تھے کہ ایاز اور شہزاد آخر کیسے ٹھیک ہوں گے۔

اب صرف ایاز رہ گیا تھا۔ وہ بھی صرف کھانے کے وقت گھر آتا تھا اور پھر اپنے کسی دوست کے ہاں پڑھنے چلا جاتا تھا۔ کئی بار بی بی نے اسے اپنے پاس رکھنے کو بلا یا گروہ راضی نہیں ہوا۔ میں کیوں کسی کے گھر رہوں۔ میں تو خوب پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں گا۔ تو جا ”ایوان غزل“ کے جھوٹے ٹکڑے کھانے وہ غزل سے کہتا تھا۔

اب اس نے غزل کی رکابی میں سے بوٹیاں چھینا اور اسے مارنا بھی چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ تو اس کی ہر بات کا خیال رکھتا تھا۔ ابا کی ہر زیادتی خاموشی سے سہہ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ سایا کی گالیوں پر اس سے لڑنا بھی ایاز نے چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ایاز نے ہمایوں سے اسکول کی فیس مانگی۔ لیکن ہمایوں کا موڈ اس دن ٹھیک نہ تھا۔ وہ صبح سے اپنی سسرال کے ہر ہر فرد کو گالیاں دے رہا تھا لیکن ایاز کو غزل کی طرح وقت اور مصلحت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمایوں نے اس کی سب کتابیں پھاڑ کر پھینک دیں اور ایاز کو مارتے مارتے خود نڈھال ہو کر پڑ گیا۔ اس دن غزل کو بڑی ہنسی آئی، ابا آفس چلے گئے تو اس نے ایاز کو خوب چڑایا۔

”اجو بھائی، اور مانگو اسکول کی فیس۔“

”اگر اس وقت اماں ہو تیں تو تجھے مزہ چکھاتا۔“

”ا جو بھائی! بی اے پاس کرو گے۔۔۔؟“

ابی سالی تجھے کر کے بتادوں گا۔ اس نے جان کا دس کے انداز میں ہاتھ ہلا کے کہا اور پھٹی ہوئی کتابوں کے ورق ”جوڑنے لگا۔ اب غزل بارہویں سال میں آگئی تھی۔ اور اس قابل ہو گئی تھی کہ اپنے بالوں میں خود کنگھی کر لے۔ سوئی میں دھاگہ پرو کے ابا کا پھٹا ہوا پاجامہ سی دے۔ سایا کی مدد کے بغیر چائے بنالے۔ چولہا سلگا لے۔ بلکہ اس کا تو یہ بھی جی چاہتا تھا کہ سایا سے آٹا چھین کر خود روٹی پکانے بیٹھ جائے۔ اور فوزیہ کی نقل میں فریم پر کپڑا چڑھا کر پھول بنائے۔ فوزیہ تو آفت کی پر کالہ نکلی۔ ایک سے ایک خوب صورت پھول کاڑھ کے راشد اور شاہین کے غلافوں پر دیتی تھی۔ لنگڑی پھوپو کی سوئی میں دھاگہ پر ودیتی۔ کوئی مہمان آجا تا تھا تو رضیہ اس سے چائے بنواتی تھیں۔ ادھر اسکول کی رپورٹ آتی تو ہمیشہ شاہین پڑھ کر سناتا کہ فوزیہ اپنی کلاس میں فرسٹ آئی ہے۔ جوں جوں فوزیہ کا قد بڑھتا گیا۔ رضیہ کا احتساب بھی اس کے اوپر بڑھ رہا تھا۔ اب وہ ٹانگیں کھلی فراکیں پہنے کی بجائے تنگ پاجامہ، کار چوبی، واسکٹ اور اس کے اوپر کامدانی کی ٹوپی اوڑھتی تھی۔ کبھی ٹوپی کی بجائے کھڑا دو پٹہ پہن لیتی۔ رضیہ کہتی تھی کہ میں اپنی بیٹی کو آج کل کے رنگ میں نہیں رنگوں گی۔ اس کا مطلب صاف صاف یہ ہوتا کہ وہ اپنی نندوں کی بیٹیوں جیسی آزادی اپنی بیٹی کو دینا نہیں چاہتی۔ رضیہ کی بات پر بی بی سوچتیں۔ چاند کو یہ آزادی کس لئے دی گئی! تا کہ راشد اپنے دوستوں کا حلقہ وسیع کر سکے۔ اگر راشد سختی کرتا تو کیا چاند اتنی جرأت کر سکتی تھی۔ اور اب جب گھر میں چاند کی بدولت دولت کی ریل پیل تھی۔ رضیہ اپنی بیٹی کو اس آزادی سے بچانا چاہتی ہے۔

فوزیہ کی دوستی اب غزل سے برائے نام تھی۔ کیوں کہ فوزیہ بڑی مغرور تھی۔ اسے اپنی صورت شکل اور دولت کے علاوہ اپنے کردار کی بلندی کا بھی ابھی سے احساس تھا اگر اسے مذاق میں بھی کوئی گندی بچی کہہ دیتا تو وہ گھٹنوں روتی۔ رضیہ نے چاند اور غزل کی مثالیں دے کر اسے سمجھا دیا تھا کہ بے پردگی اور ناچنا گانا لڑکیوں کے لیے کتنی بری بات ہے۔ اس لیے وہ بات بات پر ناک سکور کے اپنی ماں کی طرح بڑے طنز کے ساتھ بات کرتی تھی۔

اوئی تم ابھی تک چھٹی کلاس میں ہو! میں تو اب نائنٹھ میں آجاؤں گی۔“

میں تو مسز ریڈی کے ہاں جا کر کپڑوں کی کٹنگ سیکھ رہی ہوں۔

ہائے اللہ، تمہیں ابھی تک چائے بنانی نہیں آتی! ”میں نے تو پرسوں پٹنگ بنائی تھی۔ ڈیڈی نے مجھے دس روپے انعام دیا تھا۔“

مجھے تو بچپن کے دن بھلا نہ دینا“ والا گیت پورا یاد ہو گیا ہے۔ غزل اترا کے کہتی۔“

امی تو مجھے گانے نہیں دیتیں۔ امی کہتی ہیں جو لڑکیاں گانا گاتی ہیں۔ وہ آوارہ ہو جاتی ہیں۔

آوارہ کیا...؟“ غزل تعجب سے پوچھتی۔

”میں کیا جانوں۔۔۔ بس امی کہتی ہیں۔“

”چل جھوٹی تجھے گانا نہیں آتا بول کہ مجھ سے جلتی ہے تو۔۔۔“

”اچھا چل امی سے پوچھیں گے؟“

نکو، میں نہیں جانتی۔۔۔“ غزل اپنا ہاتھ چھڑا لی۔ کیوں کہ ممانی بیگم کے پاس جب بھی جاتی وہ ضرور جلی کٹی ” نصیحتوں کا ایک پلندہ اسے تہمادیتی تھیں۔

اس لیے وہ چاند آپا کے کمرے میں جا کر ریڈیو سنا کرتی۔ اس کمرے میں آکر اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ لوگوں کی بے مروتی کی تلوار اس کے دل سے محو ہو جاتی تھی۔ حالاں کہ اب تو چاند آپا بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہ دیتی تھیں۔ بی بی بھی یہی چاہتیں کہ وہ کم سے کم یہاں آئے۔ کیوں کہ انھیں رضیہ کا نفرت بھرا برتاؤ غزل کے ساتھ پسند نہ تھا۔ اس لیے غزل آتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے اسے پھر گھر لوٹا دیتی تھیں۔ یوں بھی آج کل گھر کا ماحول درہم برہم تھا۔ راشد کو ایک منٹ کے لیے گھر میں ٹکنا محال تھا۔۔۔ واحد حسین بھی دن رات دوستوں میں گھرے بیٹھے سیاسی حالات پر تبصرہ کیے جاتے تھے۔

سنا تھا کہ انگریز اپنا بستر بوریا سمیٹ رہے تھے۔ ایسے وقت ریاستوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ کیوں کہ اتحاد المسلمین حیدر آباد کے الحاق کے حق میں نہ تھی اور نظام کو اپنی گدی نیچے سے کھسکتی نظر آرہی تھی۔ ادھر نہرو سوشلزم کے حامی تھے۔ اس لیے کانگریس راج میں کیا زمین داری اور جاگیرداری باقی رہ سکتی تھی۔؟ سب بھی سوچ رہے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن دہلی میں تھا۔۔۔ اس کے باوجود اس نے واحد حسین راشد اور تمام ہندوستان کے نوابوں، جاگیرداروں کا چین و سکون جناح اور نمبر کو بانٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایوان غزل“ کے وسیع ہال میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے واحد حسین لیٹے تھے۔۔۔ ان کے سامنے بیچ والے ” دروازے کے اوپر قلی قطب شاہ کا بڑا سارنگین فوٹو ٹنگا ہوا تھا۔۔۔ کمرے میں اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ مگر سب گم سم تھے اور ریڈیو پرا چار یہ کر پلانی، لیاقت علی خاں، پنڈت نہرو اور جناح کی وہ تقریریں سن رہے تھے جو ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام کی قسمت کا فیصلہ کر رہی تھیں۔

واحد حسین نے آنکھیں کھول کر اوپر لگے ہوئے قلی قطب شاہ کے فوٹو کو دیکھا اور اس کے مقابل سنہرے فریم میں لگا ہوا قد آدم فوٹو عثمان علی خاں کا تھا، وہ سلطنت آصفیہ کو ایک کتاب کی طرح سینے سے لگائے کھڑے تھے واحد حسین نے دیکھا قلی قطب شاہ کی آنکھوں میں بڑا سکون تھا۔ جیسے اقلیم سخن کا یہ شہنشاہ بڑے اطمینان سے بیٹھا۔ کسی غزل کی تلاش میں ہو۔ یا ممکن ہے وہ کہہ رہے ہوں کہ کس طرح اس نے گول کنڈے کے اوپر کھڑے ہو کر چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگل میں ایک حسین شہر کے خواب دیکھے اور پھر موسیٰ ندی کے آس پاس اس نے اپنے اس خواب کے جال بننا شروع کر دیئے اس نے ایک باغ کی طرح بھاگ متی کے رہنے کے لیے ایک شہر بسایا۔ اس میں کنول کے پھولوں کی طرح جگہ جگہ خوب صورت عمارتیں بنوا ئیں۔ جن میں تہذیب و ثقافت کے چراغ جل رہے تھے۔۔۔ اُردو کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اور دنیے سے دینے روشن ہوتے جاتے تھے۔۔۔ یا ممکن ہے وہ اپنی کسی محبوبہ سے کہہ رہا ہو کہ جلدی سے اٹھ کر جشن طرب منعقد کرو کیوں کہ وقت کم ہے۔۔۔ ادھر۔۔۔ چند صدیوں کی پہاڑیوں کے پیچھے سے وقت کے قافلے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔۔۔ کچھ دیر بعد لٹیرے یہاں ٹوٹ پڑیں گے۔ اور پھر گول کنڈے کے ملنے تلے لوگ ہماری کہانیاں ڈھونڈنے آئیں گے اور ہماری عظمت کے گرے پڑے زروں کو نایاب ہیرا سمجھ کر لے جائیں گے۔۔۔ پھر ہیرا کسی ملکہ کے تاج پر جگمگا کر ہمیشہ وہاں سورج کی روشنی قائم رکھے گا۔۔۔

یہ سوچ کر واحد حسین کو بڑا اطمینان ہوا کہ اس کمرے میں اب عثمان علی خان پورے جاہ و جلال کے ساتھ موجود ہیں۔۔۔ قلی قطب شاہ خواہ مخواہ اندیشوں میں مبتلا ہیں۔۔۔ لٹیروں کا قافلہ اب یہاں سے بہت دور چلا گیا ہے۔ سیکڑوں میل دور۔۔۔ دہلی پھر ایک بار اپنا چولا بدل رہی تھی۔

اور اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ریڈیو ہر طرف پھیلا رہا تھا۔ صوفے پر نیم دراز آنکھیں بند کئے واحد حسین نے سوچا کہ اب وقت آگیا ہے جب ہمارے اوپر کسی ریڈیڈنٹ کی مرضی نہیں چلے گی۔ اب سلطنت آصفیہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لے گی۔۔۔ جانے دہلی کا شہنشاہ اب کون ہو گا۔ نہرو یا گاندھی۔۔۔ اور شہنشاہ کا لباس تو یقیناً وہی رام اور کرشن والا ہوگا ہی۔۔۔ تخت طاؤس آگرے سے اٹھالا نہیں گے۔ شاید نہرو بھی اکبر اعظم کے نقش قدم پر چلیں۔۔۔ لیکن سردار پٹیل تو رام راجیہ کے قائل تھے۔۔۔ اللہ کی شان۔۔۔ پورے ایک ہزار سال بعد پھر آریاؤں کا زمانہ لوٹ رہا تھا۔۔۔ کوروں اور پانڈوں میں قسمت آزمائی تھی۔۔۔ جانے کس کی جیت ہوگی۔۔۔

واحد حسین تو چاہتے تھے کہ کسی طرح اعلیٰ حضرت اس وقت دہلی پر چڑھائی کر کے پورے ہندوستان کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ اور ہر جگہ خاندان آصفیہ کا بول بالا ہو جائے۔۔۔

بس یہی ایک راستہ تھا جس میں واحد حسین کی عزت دولت اور ان کے خاندان کا وقار محفوظ ہو سکتا تھا۔ لیکن مشکل تھی کہ وہ جب بھی اس بات کا ذکر کرتے راشد جھنجھلا جاتا۔

”آپ چپ بیٹھ کر تماشا دیکھو ابا جان۔“

”تو اس طرح ہم سب کا خاتمہ بالآخر ہوگا۔“

ایوان غزل“ میں بیٹھا راشد کسی سے بحث میں مصروف تھا۔

”اجی راجہ ! آپ کا کیا ہے۔ چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی۔“

جاگیریں گئیں تو حکومت کوئی بڑا عہدہ دیدے گی۔ اب آپ دہلی فوراً آجائیں۔ سنا ہے وہاں خوب منسٹریاں بٹ رہی ہیں۔

کیا لگاتے راشد نواب۔“ ملیشم نے بیزاری سے کہا۔

اجی حضت ، آپ بڑے آدمیوں کا کیا ہے۔ جاگیریں جائیں گی تو بڑے عہدے مل جائیں گے۔ مصیبت تو ہم نیچ ذات کے ” بندوؤں کی ہے۔ سنا ہے دہلی میں تو رام راجہ قائم ہوگا۔“ ملیشم بڑی اداسی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

جی نہیں، اب تو آپ ہی کا راج ہو گا۔“ راشد نے بڑے طنز کے ساتھ کہا۔

”نہرو تو سوشلزم کے قائل ہیں۔ مذہب و زہب سب ختم۔ مہتر ، چمار، مسلمان، برہمن سب ایک ذات کہلائیں گے۔“

اندر دالان میں کرسی پر لیٹے ہوئے واحد حسین راشد کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کے کانوں میں دل دھڑک رہا تھا ، اور بلڈ پر یشر اچانک ہائی ہو چکا تھا۔

جانیے جناب !۔ اب آپ سب دہلی تشریف لے جائیے۔“ راشد ملیشم سے کہہ رہا تھا۔ آپ کے ساتھ سلطنت آصفیہ میں ” انصاف نہیں ہوا۔ اب آپ دہلی کے دربار میں نورتنوں میں شمار ہوں گے۔ اب ہم بھی اپنی ایک خود مختار حکومت بنائیں گے جس میں دخل دینے کا حق کسی انگریز کے بچے کو نہیں ہوگا۔

واحد حسین مسکرا پڑے۔ جیسے سچ مچ ان کے بیٹے نے سلطنت آصفیہ کا تاج اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا ہو۔

اب دیکھنا کہ یہ سارے ” ہندوستانیوں“ جو حیدر آباد کو اشرفیوں کا پیڑ سمجھ کے بلانے آجاتے تھے۔ رفتہ رفتہ غائب ” ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اب ان کے ہاں بھی کوئی اکبر اعظم ، دہلی کے تخت پر بیٹھ کر ہندو اور مسلمانوں کو ایک گھاٹ پانی پلانے گا۔ اب وہاں آنے دن ہونے والے ہندو مسلم فساد ختم ہو جائیں گے۔

ہندوستانیوں کے اس ٹھاٹ کے تصور ہی سے واحد حسین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ چلتے چلتے انگریز سے ایک تگڑا اثر ڈلوایا جائے کہ راشد کو کہیں کوئی بڑا سا عہدہ مل جائے۔

بھئی اپن کو تو آم کھانے سے مطلب ہے۔۔۔

ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔۔۔

اندر کمرے میں راشد اور ملیشم اچانک چپ ہو گئے تھے۔ جانے انہیں کون سا خطرہ سامنے نظر آ رہا تھا۔۔۔ اور اندر کمرے میں چاند آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا

صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

تو کیا شام ہوگئی۔۔۔؟

واحد حسین نے چونک کر سوچا۔۔۔ ہاں۔۔۔ ڈھلتے سورج کا پیلا پن ان کے بالوں پر بکھر چکا ہے۔ جوانی کی وہ گرمی ختم ہو چکی ہے جس کی مدت مینتپ کر انہوں نے چودہ بیاضیں سیاہ کر ڈالی ہیں۔ چاند، غزل اور شاہین۔۔۔ ننھے ننھے ستاروں کی طرح نہیں رہے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں۔ رات آ رہی ہے۔ رات آ رہی ہے۔

صبح ہوئی تو راشد جانے کس ضروری کام سے ور نگل چلا گیا تھا۔۔۔ حامد کی شادی ہوچکی تھی اس لیے رضیہ بڑی مصروف تھی۔ بی بی کے سامنے چمکیلے رنگین کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سردیوں کی دھوپ کھانے واحد حسین آنگن میں کر یا پات تلے کرسی گھسیٹ لائے تو پاس ہی لنگڑی پھوپو بھی آ بیٹھیں۔ لنگڑی پھوپو کا ایک زمانے سے اصرار تھا کہ گھر میں کچھ لونڈیاں چھوکر یاں ہونی چاہئیں تا کہ گھر والوں کی امارت کا احساس ہو۔ اور پھر دن بھر لنگڑی پھوپو گالیاں دیں، حکم چلائیں۔ اب تو اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ تھا۔ راشد نے بہان صاحب کے ساتھ بیڑی اور سگریٹ کا

کارخانہ کیا کھولا کہ ”ایوان غزل“ کے ہلتے ہوئے در و بام سنبھل گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بنجارہ ہلز پر ایک بنگلہ بنوا کے کرایہ پر اٹھادیا، نئی کار خرید لی۔ فوزیہ کی شادی کے لیے پچاس ہزار بینک میں ڈلوادئیے۔

تو بھائی میرے کو چھو کر یاں ہونا۔ اللہ سلامت رکھے میرا شاہین پاشا بڑا بوربا ہے۔ اسے تو مینرا شد نواب کی طرح ” خشک مزاج نہیں بنواؤں گی۔ جیسا آپ نے اپنی طرح اپنے بیٹے کو کر دیا ہے کہ بس جو رو کا غلام بن کر رہ جائے۔ آپ آج احمد “! نواب کو خط لکھد و تا

ارے احمد نواب کے پاس کیا لونڈیوں کی کھیتی ہوتی ہے! اب زمانہ گیا گو ہر بیگم جب تم لونڈیاں پالتے تھے۔ “واحد ” حسین اکٹاہٹ سے خلال کرتے میں بولے۔

آپ لکھو تو۔ اجالا بھابی دس لونڈیاں بھجوادیں گی۔ نہیں تو اس قیصر مردار ہی کو بھیج دیں۔ میں چپل کے نیچے دبا ” کر اسے ٹھیک کرلوں گی۔

اسی وقت احمد نواب کا خط لیے شاہین اندر آیا۔ اور جلدی سے خط داد احضت پر پھینک کر باہر بھاگا۔ کیونکہ انگریزی اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے احمد نواب کا شکستہ خط شاہین کبھی ٹھیک طور سے نہیں پڑھ پاتا تھا۔ اس لیے واحد حسین اسے ہر ہر سطر پر جاہل اور گدھا ٹھیراتے جاتے تھے۔

اجی دلہن بھائی جلدی آؤ احمد بھائی کا خط آیا ہے۔ “لنگڑی پھوپو نے سر پر یوں ساری لپیٹی جیسے نماز پڑھنے والی ” ہوں۔

“اے اللہ فضل کرے۔ چھوٹے نواب تو ہمیشہ کسی ضرورت کے لیے ہی خط لکھتے ہیں۔“

بی بی پان کی گلوری ہاتھ میں تھا مے واحد حسین کے پیچھے کھڑی ہوئیں۔

مگر واحد حسین جانے کیوں خط کھولتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ اس لیے خط گود میں ڈالے پہلے تو وہ خلال کر کے دانتوں کا کوڑا کرکٹ صاف کرتے رہے۔ پھر جیب میں سے رومال نکال کر چہرے کا پسینہ پونچھا اور رومال کو اسی طرح تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ اس کے بعد عینک لگا کر انہوں نے لفافے پر لکھا ہوا پتہ اچھی طرح پڑھا۔

بملاحظہ گرامی برادر معظم دام بالا احترام حضرت قبلہ نواب واحد حسین خاں صاب مدظلہ دام ظلکم

“لا حول ولا۔۔۔ کتنا بد خط ہو گیا ہے یہ آدمی۔“

انہوں نے عینک کو ٹھیک زاویے پر جما کر کہا۔

اللہ توبہ۔۔۔ اب پڑھیے نا جلدی سے۔“ بی بی بی بی صبری سے بولیں۔“

انہوں نے احتیاط سے لفافہ چاک کر کے خط نکالا اور پڑھنے لگے۔

حضرت قبلہ و کعبہ۔ بعد سلام و قدمبوسی کے، عرض خدمت ہے کہ یہاں جمیع ارکان خاندان کی خیریت رہ کر وہاں ” جملہ تمام کی خیریت نیک مطلوب۔۔۔ اس وقت یہ عریضہ خدمت عالی مینانتہائی پریشانی کے عالم میں گزرانا جارہا ہے کہ۔۔۔“ رفتہ رفتہ واحد حسین کی آواز کم ہوتی ہوئی گم ہوگئی، صرف ان کے ہونٹ لرز رہے تھے اور احمد حسین کی تحریر کو ان کی آنکھیں نگل رہی تھیں۔

چپ کیوں ہو گئے۔۔۔ زور زور سے پڑھیے نا۔“ بی بی نے جھنجھلا کر کہا۔“

ہونہ۔۔۔“ واحد حسین کے چہرے کی سلوٹیں گہری ہو گئیں۔ کئی بار انہوں نے عینک کا زاویہ بدل کر کچھ اور پڑھنا ”
چاہا۔ چھوٹے نواب کافی بد خط تھے۔ مگر آج انہوں نے ایک بھی لفظ مشکوک نہیں لکھا تھا۔

اللہ میاں رحم کرو۔ کیا بات ہے جی۔۔۔!“ بی بی کا دل دھڑکنے لگا۔ اور لنگڑی پھوپو کے دل میں ایک امید کی کرن ”
جاگی کہ چھوٹے نواب کی دولت کا وہ حرامی وارث ختم ہو گیا، مگر اللہ کی اتنی بڑی عنایت کا انہیں یقین نہ تھا۔

اجی کچھ تو بولو بھائی۔ میرا دم رک رہا ہے۔“ لنگڑی پھولو نے گھبرا کے کہا۔

انہوں نے خط نہ کر کے لفافے میں رکھا اور عینک اتارنے لگے۔ جب گھر میں خاموشی چھا جائے تو پوری کائنات
غنودگی کے دھندلکے میں سمٹ جاتی ہے، مگر واحد حسین کو اُس وقت پورا گھر جاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ سوچتا ہوا۔ کچھ
کہتا ہوا۔۔۔

ہوتا کیا دی قیصر حرام زادی۔۔۔“

قیصر۔۔۔؟“ سب چونک پڑے۔

کیا ہوا قیصر کو۔۔۔ بتائیے، آپ خط مجھے دیدیجیے۔“ بی بی نے خط اٹھانا چاہا تو واحد حسین نے چھین لیا۔

“وہ چھوڑی اب کمیونسٹوں میں مل گئی ہے۔ اور وہاں غنٹوں کے ساتھ مل کر خوب اور ادم مچاری ہے۔“

بی بی اور لنگڑی پھوپو کا منہ حیرت کے مارے کھلا ہوا تھا۔

“یہ فاطمہ بیگم کو کیا ہو گیا ہے کہ جوان لڑکی کو کمیونسٹوں میں بھیج دیا۔“

اور اجاڑ صورت ہماری ہی دشمن ہو گئی ہے۔ چھوٹے نواب نے لکھا ہے کہ غلام رسول کو راتوں رات کہیں لے جا
”کر چھپا دیا ہے۔ اتنی غنڈہ گردی بڑھ گئی ہے کہ ہم لوگوں کی راتوں کی نیند حرام ہے دو ہفتے سے میں گاؤں نہیں جاسکا ہوں۔

بی بی جانے خلا میں کہاں گھور رہی تھیں۔ ان کا منہ تعجب کے مارے کھلا ہوا تھا اور ان کے گلے میں پڑا ہوا کالے
موتیوں کا لچھا سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ لرز رہا تھا۔

رضیہ صبح ہی شادی کے انتظام کے سلسلے میں کہیں چلی گئی تھی۔ اس لیے لنگڑی پھوپو ہانپتی کانپتی چولہے کے
پاس پہنچیں اور مسالہ پیستی رکو سے بولیں۔

دیکھا وہ پوٹی کمنستان کو رکھ لی کتے۔ اجاڑ صورت اس کے منہ کو آنچ آؤ۔ چھوٹے نواب کو تو بے حد غصہ آ رہا ”
”کتے۔ انوں لکھے ہیں کہ اب اسے پکڑو کے دھیروں سے جوتے لگواؤں گا۔

کون۔۔۔ کون بی بی۔۔۔؟“ رکو نے مسالے سے ہاتھ اٹھا لیے اور رک کر پوچھا تو پھوپو چونک پڑیں۔

تیرے کو کیا کرتا ہے ری ان باتوں سے؟ چل جلدی مسالہ اٹھا۔“ اس کے بعد دالان کے تخت پر بیٹھے ہوئے انہوں نے ”
سوچا کہ یہ کمیونسٹاں کون ہیں آخر؟ اور احمد نواب سے کابے کا بیر ہے؟ انہوں نے ناحق جلدی کی آنگن سے یہاں آنے میں
ابھی تو بڑے بھائی سے مزید اس مسئلہ پر تبادلہ خیال ہو سکتا تھا۔

اچانک چاند اندر آتی نظر آئی۔ فیروزی جارح کی ساری میں لیٹی۔ اداس صورت۔ پریشان ہال۔ و دو تین دن سے گھر
نہیں آئی تھی۔ اس لیے آج اسے ڈانٹتے کا نہ صرف لنگڑی پھوپو کو حق تھا بلکہ وہ واحد حسین اور راشد کو بھی اس کے خلاف
بھڑکا نا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے چاندی کے پاندان کو اپنی جانب گھسیٹ کر بی بی کو مخاطب کیا۔

”آج چار دن کے بعد اس دھیڑ عاشق نے اجازت دے دی آپ کی نواسی کو گھر جانے کی۔“

بی بی نے بڑی بیزاری کے ساتھ لنگڑی پھوپھو کی طرف دیکھا۔ پھر چاند کے کمرے کی طرف۔ پھر راشد کی باتیں سننے میں محو ہو گئیں۔

لنگڑی پھوپھو گھبرا گئیں۔ یقیناً اس وقت کوئی اہم بات ہے۔ جبھی تو چاند کے آنے کا نوٹس کسی نے نہیں لیا۔ اس لیے وہ پھر لکڑی کے سہارے گھسٹتی ہوئی ان کے قریب آئیں۔

”کیا ہوا۔۔ کیا بات ہے۔۔؟“

”کچھ نہیں جی۔۔۔“ راشد نے ان کا میلا ہاتھ شارک سکن کی سفید شیروانی پر سے جھٹک دیا۔

”گو ہر بیگم چار کپ اچھی چائے بنوا کر جلدی باہر بھجوادو۔“

بی بی نے انہیں وہاں سے ٹالنے کے لیے کہا۔

”مگر کون آیا ہے۔۔؟“ وہ معلوم کیے بغیر جانے کو تیار نہیں تھیں۔

”بیو پاری لوگ آئے ہیں گو ہر بیگم۔ راشد نواب ان سے کپڑا اور دوائیں خرید رہے ہیں۔“

واحد حسین نے رسان سے سمجھایا۔

اچھا اچھا گو ہر بیگم چولہے کی طرف جانے لگیں تو انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اصلی بات ان سے چھپائی گئی ہے۔

دو تین دن میں راشد نے بنجارہ ہلز والا مکان خالی کروا کے پٹرول، دواؤں اور ہتھیاروں سے بھر دیا۔ رات کو جب سب فرصت سے بیٹھے تو رضیہ اخبار اٹھا کر بی بی اور گو ہر پھوپھو کو ہیبت ناک خبریں سناتی تھی۔ سب کے دل دھڑکنے لگتے۔ اتنا دنگا فساد ہر طرف ہو رہا تھا۔

ارے تو بیچ بچاؤ کرنے والے سب مر گئے کیا۔“ پھوپھو نے گھبرا کے پوچھا۔

سنا ہے گاندھی بہت سمجھا رہے ہیں۔ وہ تو فساد کی جگہ خود جا کر مسلمانوں کو مارنے سے روکتے ہیں۔“ رضیہ نے ”راشد کی سنی ہوئی باتوں کو دہرانا شروع کیا۔

اونہ۔ یہاں تو سب چین ہے۔ کہیں لڑنے والے یہاں نہ آجائیں۔“ بی بی نے گھبرا کے کہا۔ دن بھر آنکھیں بند کیے واحد حسین آرام کرسی پر لیٹے خبریں سنتے رہتے تھے ریڈیو بند کرتے تو اخبار اٹھا لیتے۔ سارے ہندوستان میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ بہت سے لوگ پناہ لینے حیدر آباد آ گئے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حیدر آباد ہر ایک کو محبت کے ساتھ اپنے دل میں جگہ دیتا ہے۔ یہ دہلی کے معزز خاندانوں کے افراد تھے، جو اپنی وضع داری اور آن بان کے لیے جان کی پرواہ نہ کرتے تھے، مگر آج ان کی عورتیں اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے دوپٹے سے منہ ڈھانپنے ہاتھ پھیلائے سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھیں۔ شہر میں جگہ جگہ مہاجرین کیمپ کھل گئے تھے۔ لوگ بڑھ چڑھ کر چندے دیتے، کپڑے اور اناج تقسیم کرتے۔

رفتہ رفتہ راشد بھی پریشان ہونے لگا، کیوں کہ ادھر تو کمیونسٹوں نے ضلعوں میں زور اٹھایا تھا، ادھر انڈین یونین ریاست کے الحاق پر زور دے رہی تھی اور اب یہ مرحلہ بات چیت سے آگے بڑھ کر تشدد کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ قاسم رضوی ہر طرف غضب ناک اور جوشیلی تقریریں کر کے جذبات کو بھر کا رہے تھے ہر نو جو ان کے لیے فوجی پریڈ ضروری کر دی گئی۔

تیرہ چودہ برس کا شاہین بھی صبح سویرے اٹھ کر رضا کاروں کا ڈریس پہنے این سی سی۔ کی ٹریننگ کے لیے جانے لگا۔

واحد حسین شاہین کو رضا کاروں کے ڈریس میں دیکھتے تو جانے کیوں کا ان کا دل دھڑکنے لگتا۔ کیا اپنی ناموس بچانے کا صرف یہی ذریعہ ہے۔۔۔؟ انہوں نے زندگی میں ہر طرح کی جدو جہد کی تھی مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن ان کے بچوں کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ وہ جس طرف جائیں گے تلواریں ان کا استقبال کریں گی، موت ان کا راستہ گھیرے گی۔ آخر ہم اس لڑائی میں کیوں شریک ہوں۔۔۔؟ پائپ سلگاتے میں وہ سوچتے۔ میرے جیسے عام انسان، جو کسی سیاست میں، کسی پارٹی میں شریک نہیں ہیں۔ بس اپنے گھر میں گلزار سجائے کسی پیڑ کی چھاؤں تلے بیٹھے غزلیں لکھتے رہے ہیں، اپنے بیوی بچوں کے مسائل میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ہم اس لڑائی میں کیا رول ادا کریں گے۔ کس طرف سے لڑیں گے۔ اور پھر بڑی مایوسی کے ساتھ راشد سے پوچھتے۔

”کیاں میاں! سچی بھی سلطنت آصفیہ باقی نہیں رہے گی؟“

راشد جانتا تھا کہ اس کے خاندان کی رگوں میں سلطنت آصفیہ کا وقار خون بن کر دوڑتا رہا ہے۔ اس لیے وہ اپنے ابا کو تسلی دیتا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ابا جان۔ قاسم رضوی برگز اپنی شکست تسلیم نہیں کریں گے۔“

لیکن میاں کانگریس والے دھمکی دے رہے ہیں کہ فوجی کاروائی کریں گے انہوں نے تو سرحدوں پر فوجیں اکٹھی ”کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ کل آل انڈیا ریڈیو نے سنایا۔

اونہ، سب ڈرانے کی باتاں ہیں۔“ راشد لا پرواہی سے کہتا اور بابر کی طرف بھاگتا کیوں کہ خبر گرم تھی کہ حیدر ”آباد کا معاشی مقاطعہ ہونے والا ہے۔

اوئی اجاڑ صورت یہ غنڈے لوگ تو یزید کی اولاد ہیں۔ آپ ایک روپے کی مٹھائی منگووا، بھائی پاشا، میں ایک ”وظیفہ پڑھوں گی۔“ لنگڑی پھوپو نے سنا تو بی بی سے کہا۔

”میرا وظیفہ بڑا اجلائی ہے راتوں رات ساری پابندیاں برخاست ہو جائیں گے۔“

پھوپو کی بات سن کر راشد نوالہ ہاتھ میں تھامے دستر خوان سے اٹھا اور پھوپو کے آگے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر کہا۔

”گو ہر پھوپو۔۔۔ تمہارے اور شاہین کے لیے بنجارہ ہلز پر ایک بنگلہ اور بنوادوں۔“

”ہو، مگر آج میرے سے کیوں پوچھ رہے ہو میاں!“ پھوپو کا دل خوش ہو گیا بھتیجے کی اس سعادت مندی پر۔

”اور فوزیہ کے لیے پچاس ہزار روپیہ اور لادوں۔؟“

پھوپو پر کوہنسی آگئی، آج کیسا مسخرہ پن کر رہا تھا راشد۔

”تو اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ فوزیہ جہیز میں بنگلہ اور کار لیکر جائے تو کوئی وظیفہ وغیرہ مت پڑھنا۔“

ایو۔ کیوں میاں؟“ پھوپو نے تعجب سے کہا۔

اس لیے کہ اگر پٹرول، دوا ئیں اور دوسری چیزیں ہندوستان سے آنے لگیں تو اس سامان کا کیا ہوگا جو ہم نے پہلے ”سے بھر کے رکھا ہے۔“ راشد نے نوالہ منہ میں رکھ کر کہا۔

”مگر دواؤں کے بغیر بیماروں کا کیا ہوگا۔“

اللہ کی مرضی!“ راشد نے ہاتھ پھیلا کے بڑی عقیدت کے ساتھ چہت کی طرف دیکھا۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ موت کا وقت دواؤں سے ٹل جاتا ہے، یہ تو سب دل بہلانے کی باتاں ہیں۔“

”اچھا، اچھا، میں نہیں پڑھوں گی وظیفہ، جا، تو روٹی کھائے۔“

میری ایک بات سنو میاں، اگر یونین کی فوجیں آگئیں تو شاہین اور ایاز کو پکڑ لیں گی نا، ان کا رضا کاروں والا ”ڈریس اتر دادو۔“ بی بی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

ارے چھوڑو امی! یونین کی فوجاں آئیں تو اپنا کیا بگاڑیں گی۔ آپ مجھ پر بھروسہ رکھو، میں ہر طرف دیکھ رہا ہوں۔“ اور واقعی راشد ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اتحاد المسلمین کا ممبر تھا۔ ہر طرف جلسے کرواتا۔ چندے جمع کرتا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس آفس کمیٹی کا پریسیڈنٹ بھی تھا۔ الحاق کے سلسلے میں جو وفد دہلی بات چیت کرنے گیا تھا۔ راشد بھی اس میں شامل تھا۔ اور جب معاشی مقاطعہ ہوا تو اس نے اور ملیشزم نے ملکر خوب ہاتھ رنگے، اتحاد المسلمین کے ہاتھوں اس نے شراب کے بھاؤ پٹرول بیچا۔ سونے کے بھاؤ دوائیں نکالی گئیں۔۔۔ واحد حسین ہر چیز دیکھتے اور ریڈیو کا سوچ اتنی زور سے آن کر دیتے کہ ہر شور، ہر سوچ اس میں دب کر رہ جائے۔ انہوں نے با ہر آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا، کیوں کہ فوجی موٹریں، ٹرکس اور گڑ بڑ کی فضا سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ ہر طرف لوگوں میں خوف و وحشت تھا، ایسے میں کسی کو مشاعرے کی یاد تھی نہ کلچرل فنکشن کی۔

گھر میں دن بھر ایاز اور شاہین ہو حق مچائے رکھتے، ان دونوں لڑکوں کو تو جیسے ایک کھیل مل گیا تھا، کہیں :فائرنگ کی مشق ہو رہی ہے، کہیں تلوار چلائی جاتی، دونوں دن بھر چیخ چیخ کر گاتے

تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھیے۔ اور“

غازی ہیں، مجاہد ہیں، علم دار ہمیں ہیں

سالار ہیں، جزار ہیں، کرار ہمیں ہیں

دکن ریڈیو سے ابراہیم جلیس ایک پروگرام پیش کرتے۔ اور اسے سننے کے لیے سارا گھر واحد حسین کے اردگر داکٹھا ہو جاتا تھا۔

پھر رات کو جب حیدر آباد کے پناہ گزین اپنے اپنے گھروں کو ریڈیو کے ذریعے پیغام بھجواتے تھے تو بی بی اور لنگڑی پھوپھو اپنے آنسو پوچھنے لگتیں، اللہ کسی پر یہ وقت نہ لانے کہ آدمی اپنوں سے بچھڑ کے اتنی دور جا پڑے اور پھر لنگڑی پھوپھو شاہین اور ایاز کو ڈانٹتے لگتیں کہ یہ لڑائی کا کیا کھیل نکلا ہے؟ مگر شاہین بھی اب گھر کے دوسرے افراد کی طرح لنگڑی پھوپھو کی بات پر دھیان دینا چھوڑ چکا تھا۔ وہ پندرہ سولہ برس کا بانکا تر چھا گھنگھریالے بالوں والا نہایت عقل مند انسان بن چکا تھا، اب وہ ہائی اسکول کا امتحان دینے والا تھا، اچانک اس کی ساری نیکریں اور شیر و انیاں چھوٹی ہو گئی تھیں اب وہ اپنی گیند اور دو پہیوں والی چھوٹی سائیکل چھوڑ کر، شام کو کرکٹ کا بلا لیے باغ میں سے گزرتا تھا تو جھکی جھکی کیریوں کو ہٹ لگاتا چلتا، آج کل ایاز سے اس کی خوب گھٹ رہی تھی، حالانکہ ایاز کو اس گھر میں شاہین سمیت کبھی کسی نے لفٹ نہیں دی تھی۔ مگر ایاز جہاں رہتا تھا وہاں اتحاد المسلمین کا کیمپ تھا جہاں فوجی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ ایاز رضا کاروں میں شامل ہو چکا تھا اور قاسم رضوی کی تمام جوشیلی تقریریں اسے زبانی یاد تھیں، وہ اپنے محلے کے تمام لڑکوں کا لیڈر تھا، جو سلطنت آصفیہ کے لیے خون کا آخری قطرہ بہانے کو تیار ہو چکے تھے۔ جس وقت ایاز فوجی لباس پہنے اپنے کمرے سے باہر آتا تھا تو غزل کانپ جاتی تھی، کہیں وہ سچ مچ لڑنے کو نہ چلا جائے۔

کئی ہفتے بعد ایک دن غزل ”ایوان غزل“ گئی تو سارا گھر گم سم تھا، ہر طرف خاموشی لنگڑی پھوپھو تک چپ چاپ بیٹھی چھالیہ کترتی رہیں اور کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔

پھر وہ بھی فوزیہ کے ساتھ باغ کے ایک کونے میں جا بیٹھی اور نیچے گری ہوئی رات کی رانی کی کلیاں سوکھے پتوں میں سے چننے لگی۔ بچپن سے وہ دونوں فرصت کے وقت یہ کام انتہائی انہماک سے کرتی تھیں، پھر جب پوری کلیاں اکٹھی ہو جاتیں تو انہیں لا پرواہی سے کسی کونے میں ڈال دیتیں تاکہ لچھما کا مائن انہیں جھاڑوں میں سمیٹ لے جائے۔

”چاند آپا تو چلی بھی گئیں۔“

کہاں۔۔۔؟“ غزل کے ہاتھ سوکھی مٹی پر جم گئے۔

”شادی کرنے۔ انہوں نے ڈیڈی کو خط لکھا تھا کہ وہ سنجیو آ سے شادی کر رہی ہیں اور اسی کے ساتھ رہیں گی۔“

!اللہ۔۔۔ سچی۔۔۔! چاند آپا کی شادی کے تصور سے وہ خوشی کے مارے پاگل ہو رہی تھی۔۔۔

بہشت۔۔۔ یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہے؟“ فوزیہ نے ناک سکڑ کر کہا، فوزیہ میں اب خود نمائی، اس کی ستواں ” ناک کی طرح ابھر رہی تھی، بات بات پر اس کی بھنویں کھینچ جاتی تھیں۔

سنجیو آ تو دھیڑ ہے۔ اجاڑ صورت۔۔۔ ڈیڈی اب چاند آپا کو بھی گھر میں نہیں آنے دیں گے، یاد ہے اس دن ڈیڈی نے ” چاند آپا کو کیسے ڈانٹا تھا؟“

غزل کو وہ پورا منظر یاد آ گیا کہ کس طرح سنجیو آ آ کر بیٹھا تو راشد چاند کا ہاتھ پکڑ کر لایا اور تخت پر پٹک دیا۔

اجاڑ صورت چھو کری، ہم سب کی جانوں کے پیچھے پڑی ہے اس کمیونسٹ چھوکرے کو یہاں لا کر، اچھی طرح ”سن لے، اگر پھر بھی وہ چھو کر ایہاں آیا تو تجھے بھی اسکے ساتھ نکال دوں گا۔

غم کے مارے غزل کا کلیجہ پھٹ گیا، چاند آپا سے کیا اس طرح بھی بات کی جاتی ہے، چاند آپا نہ ہوئیں کہ غزل ہو گئی، آج ماموں کا یہ بدلہ ہوا روپ اس کی سمجھ میں نہ آیا لیکن ایک دن شام کو دستر خوان پر راشد ماموں نے خود سمجھایا۔

”بھئی یہ بھان صاحب ہیں یا اندر لال وغیرہ، ان کی دوسری بات ہے، بڑے آدمی ہیں جن سے تعلقات بڑھاؤ سو کام“ بنتے ہیں مگر یہ کمیونسٹ چھو کرا گھر آنے لگا تو کیا ہو گا۔

اس دن جب چاند آپا تخت پر سے اٹھی ہیں تو ان کی وہ ساری اکڑ فوں اور تنک مزاجی جانے کہاں چلی گئی تھی، وہ بلک بلک کر رو رہی تھیں، چاند آپا کی ایسی بے بسی پر غزل کو بھی رونا آگیا تھا، راشد ماموں کیسے بے رحم ہیں، بچارے سنجیو آنکل تو بڑے اچھے آدمی تھے، چاند کے دوسرے دوستوں کی طرح انہوں نے کبھی چاند کو نوچ کھسوتا تھانہ وہ غصہ کرتے تھے۔ غزل نے کئی بار دیکھا تھا کہ وہ کہیں جانا چاہتے اور چاند آپا ان کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ جاتیں، انہوں نے جانے کتنی بار منع کیا تھا کہ میرے ساتھ مت آؤ مگر چاند آپا خود ہی نہ مانتیں، تو پھر سنجیو آ کا کیا قصور تھا؟ اور بھئی سنجیو تو قطعی دھیمڑ نہیں لگتا تھا، اچھا خاصا تھا، شاندار اونچا پورا، اگر چاند آپا کے عروج ہی کو اب گھر میں گہن لگ چکا تھا، وہ ہر وقت اداس سی بیٹھی جانے کیا لکھتی رہتی تھیں۔ غزل کو تو اب انہوں نے یوں نظر انداز کر دیا تھا جیسے وہ ان کی پرانی چیل ہو اور خود گھر والوں نے بھی انہیں سر سے گرے ہوئے بال کی طرح جھٹک دیا تھا۔

ان کے نام پر نا ناحضت کے منہ میں کوئی کڑوی کسلی سی چیز آجاتی تھی جسے وہ کھنکار کے تھوک دیتے تھے، راشد ماموں ان کے کمرے کی طرف کبھی نہیں دیکھتے تھے۔ بی بی چاند آپا کے نام پر ٹھنڈی سانس بھر کے یوں سر پہ پلوسنبھالتیں جیسے اپنی مرحوم بیٹیوں کی ذکر پر کرتیں، رضیہ جان بوجھ کر چاند سے بات نہ کرتی، صرف لنگڑی پھوپو تھیں جو لاٹھی کے بل ان کے کمرے میں گھسیٹتی ہوئی جاتیں تو ساری زندگی کے دل میں دبائے ہوئے طنز اور گالیاں الٹ دیتی تھیں، لنگڑی پھوپو کی اتنی بکو اس کے جواب میں چاند آپا کی وہ تیز حاضر جواب زبان ذرا بھی نہ ہلتی، وہ منہ چھپا کر بالکل یوں سسکیاں لیتی تھیں جیسے مرنے سے پہلے غزل کی اماں روتی تھیں۔۔۔ ایسے وقت اکثر یہ ہوتا کہ غزل بھی ان کے کمرے میں چلی جاتی اور انہیں دیکھ دیکھ کر خود بھی رونے بیٹھ جاتی تھی، وہ دونوں گھنٹوں رونے جاتے، اس کے باوجود نہ تو کبھی اس نے چاند آپا سے پوچھا کہ آخر کیوں روتی ہیں اور نہ کبھی چاند آپا نے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں ساتھ دیتی ہے۔

اور جب آج فوزیہ نے سنایا کہ چاند آپا چلی گئیں ہیں تو اسے بڑا سکون ملا۔۔۔ وہ پھر اندر آ گئی۔

دالان میں تخت پر بیٹھی لنگڑی پھوپو کیریاں چھیل رہی تھیں اور پاس کرسی پر بیٹھے راشد ماموں سے بک بک کر رہی تھیں۔

ہم نے دھوپ میں بال تھوڑی سفید کیے ہیں میاں۔ پہلے بی جتاتے تھے کہ چھو کری کو اتنی آزادی مت دو۔“ اور پھر ”انہوں نے کیریوں کو چھری کے ساتھ سوپ میں رکھ کر اپنے ہاتھ دبائے ہوئے کہا۔

”دس دن ہو گئے، اب تک تو ستیا ناس کر دیا ہوگا اس چھو کرے نے۔“

بس کرو پھولو۔۔۔“ رضیہ تن پہن کرتی اپنے کمرے سے نکل کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

جیسے بڑی کنواری سینا ساوتری تھی تمہاری چاند۔ ایسے تو جانے کتنے وہ روز کرے گی، جب دل بھر جائے گا تو ”پھر آجائے گی اپنے ماموں کے پاس۔

راشد نے کچھ نہ کہا۔ صرف کیریوں کے چھلکوں سے کھیلتا رہا۔

آپ سنجیو آ کو گرفتار کیوں نہیں کرا دیتے؟“ رضیہ نے پوچھا۔

نکو دلہن بیگم۔۔۔ ایسا نکو بولو۔۔۔“ بی بی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

اب تو وہ چاند کا شوہر ہو گیا۔ اسی کے ساتھ مرنا جینا ہے، دیکھنا وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔ آخر بے کس نانا کی ”نواسی۔“ بی بی کے زخم جیسے برے ہو گئے تھے۔ جیسے وہ آج بھی واحد حسین کی اس مضبوط گرفت میں پڑی کسمسار رہی تھیں۔

ہاں دونوں نے سول میرج کر لی ہوگی۔“ راشد نے لا پرواہی سے کہا۔ ”مگر چاند نے بڑا غلط انتخاب کیا۔ اتنی شاہ“ خرچ فیشن ایبل لڑکی کو تو اپنے لیے کوئی نواب یا جاگیردار ڈھونڈنا چاہیے تھا کہ عیش کرتی، وہ لونڈا تو پہاڑوں جنگلوں میں ”چھپتا پھرتا ہے، چاند کو کیا کھلانے گا؟“

ارے یہ بات اس کے خاندان میں کسی نے نہیں سوچی، وہ کیا سوچے گی۔“ لنگڑی پھوپھو نے بڑی مایوسی کے ساتھ ہی ”بی کی طرف دیکھ کر کہا۔

لیکن سارا قصور تو آپ ہی کا ہے۔“ رضیہ ہیر پھیر کے پھر راشدی کے سر الزام تھوپنے لگی تو راشد نے بگڑ کر ”اخبار اٹھالیا جیسے اخبار میں وہ خبر ڈھونڈی لیں گے جس سے ان کی بے گناہی ثابت ہوگی، حالانکہ انہوں نے کہیں غلطی نہیں کی تھی، وہ چاند کے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک چاند ان کے مقاصد پوری کرتی رہی۔ اور ایک راشد ہی پر کیا منحصر تھا، یہ تو اس وقت کا عام رواج تھا، ایک خواجہ نواب تھے، وہ اپنی حسین و جمیل ایرانی نژاد بیوی کو خود اعلیٰ عہدیداروں کے کمرے میں پہنچاتے جاتے تھے اور جب بیوی کمرے سے باہر آتی تو سب سے پہلے اس کے ہاتھ میں سے وہ کاغذ لے کر پڑھتے جس میں ان کی ترقی کی نوید سنائی جاتی تھی، ان دونوں میاں بیوی میں بڑی محبت تھی۔۔۔ بھان صاحب تو اس خوبصورت شاندار جوڑے پر رشک کرتے تھے۔ مگر راشد کی رگوں میں شرافت کا خون تھا۔ اس لیے اس نے کبھی اپنی بیوی کو کسی عہدے دار سے نہیں ملایا، البتہ چاند کو اس کے ساتھ دیکھ کر بھان صاحب جیسے سرمایہ دار خود ہی کھنچے چلے آئیں تو اس کا کیا قصور، ایک بار چاند کو دیکھ کر کسی شاعر نے کہا تھا

”یہ ایوان غزل کی معشوقہ ہے۔“

راشد یوں انجان بن گیا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد جب اس شاعر سے کسی نے راشد کا تعارف کرایا تو اس نے صراحت کی۔۔۔

جی ہاں، ہمارے ہاں سو پشتوں سے شاعری ہوتی آئی ہے لیکن میں شاعر نہیں ہوں میں تو صرف ایک بزنس مین ”ہوں۔“ اور اس شاعر نے فوراً اپنے کسی دوست سے کہا۔

یارو، لوگ عورت کو کس کس طرح اکسپلائٹ کرتے ہیں۔“ لیکن کوئی کیا جانے کہ چاند خود کم ظرف تھی۔ ندیدی، ”جدھر دیکھتی، دیکھتی ہی رہ جاتی، پسند بھی آیا تو کون۔ ایک پھٹیچر آرٹسٹ جس نے جانے کیا الٹی سیدھی باتیں اسے سنائی تھیں۔

اس دن غزل بہت خوش رہی، چاند بھی شہزادی آپا کی طرح دلہن بنی ہوں گی اور باجے والوں نے ”چھوڑ بابل کا گھر“ بجایا ہو گا، نہ جانے ان کے ہاتھوں پر مہندی کس نے لگائی ہوگی۔ شہزادی آپا کی بہنوں نے تو اپنے ہاتھوں میں بھی خوب مہندی رچالی تھی اور ایک دوسری کے چکسا مل کر خوب گانے گائے تھے۔

ہر طرف سے اکتا کر غزل بھی اسکول کی سرگرمیوں میں کھو گئی، اب وہ اٹھویں کلاس میں تھی اور اپنی کلاس ٹیچر مس ریڈی کی چہیتی شاگرد کہلاتی تھی، مس ریڈی چاند آپا کی طرح حسین تو نہ تھیں مگر چاند آپا کی طرح بات بات پر قہقہے لگا یا کرتی تھیں، وہ ہر روز ایک نئے رنگ کی ساری پہنتیں، اسی رنگ کا بلا کر ہوتا اور اسی رنگ کے پھولوں کی بینی بالوں میں مہکتی لیکن ان کے کپڑوں کی خوشبو ہمیشہ ایک ہی ہوتی تھی، غزل کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کوئی ہزار عورتوں میں چھوڑ دیتا تو سونگھ کر مس ریڈی کو پہچان سکتی تھی۔ مس ریڈی خوبصورت چیزوں پر جان دیتی تھیں اس لیے انہیں غزل کا چمکیلا سارنگ اور سوئی ہوئی خمار آلود آنکھیں بہت پسند تھیں، لہذا مس ریڈی پر نچھاور ہونا غزل کا فرض تھا، اسکول میں مس ریڈی کے بارے میں ہمیشہ سرگوشیاں ہوتی تھیں، دوسری سوکھی چمڑخ ٹیچرس ان کے بھرے بھرے بدن سے بچ بچ کر چلتی تھیں۔ بڑی عمر کی لڑکیاں انہیں آتے دیکھ کر یوں رک جاتی تھیں جیسے بارات گزر رہی ہو۔ وہ چلی جاتی تو دبے دبے قہقہے بلند ہو جاتے۔

”گریبان دیکھا، اسکول کا پھاٹک ہے۔“

”سنا ہے ہر ایک کو اندر جانے کی اجازت ہے۔“

بڑی عمر کی لڑکیاں ان سے بہت جلتی تھیں، لیکن چھوٹی لڑکیوں میں وہ بہت ہی محبوب ٹیچر تھیں، اسکول میں جب بھی اعلیٰ حضرت کی سال گرہ پر کلچرل پروگرام ہوتا تھا تو مس ریڈی ہی ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا“ کی دھن بناتیں جسے غزل لیڈ کرتی تھی، وہ غزل کو سب لڑکیوں پر فوقیت دیتی تھیں، وہ ہر گیت، ہر نظم فوراً یاد کر لیتی تھی۔ میں ریڈی اس کے ذہن کی بہت تعریف کرتی تھیں کہ غزل ہر بات یا در کہتی ہے، چاہے پہاڑے ہوں یا سبق۔

چاند آیا کا غصہ ہو یا ابا کی جھڑکیاں۔ اس کا دل نفرت کی آگ سے اتنا بھر چکا تھا کہ اب کسی محبت، کسی چاہت کے لیے اندر جانے کا راستہ نہ رہا تھا۔

لیکن اب کئی مہینے کی چھٹی کے بعد مس ریڈی اسکول آئیں تو لوگوں نے انہیں مشکل سے پہچانا، اب ان کے بالوں میں پھول تھے نہ کپڑوں کا کوئی میچ، گریبان حلق تک بند ایک گھنٹہ میں وہ ایک بار مسکرائی ہوں گی، ٹیچروں نے لڑکیوں کو بتایا کہ وہ اب مسز پر کاشم بن گئی ہیں، شادی کا یہ عبرت ناک انجام غزل کو بالکل اچھا نہ لگا، اس نے ایک بار پھر انہیں باتوں میں رجھانا چاہا اور گیتوں سے بھی، مگر انہیں بالکل فرصت نہیں تھی کہ لڑکیوں کی صورت پر غور کرتی پھریں۔

ایک برس گذر گیا۔

غزل تنہائی کے اس پل صراط پر دھکے کھاتی پھری، اس اندھے کی طرح جو سانپ کو رسی سمجھ کر پکڑ لے۔ وہ محبت کی تلاش میں جانے کتنے خطروں میں کو دگنی۔

اسکول میں ٹیچرس اسے لفٹ نہیں دیتی تھیں کیوں کہ وہ گانے ناچنے اور کود پھاند کے علاوہ کوئی اچھی بات نہیں کرتی تھی، اس لیے وہ ٹیچروں کی نظروں میں سمانے کی خاطر کتابوں میں کھوئی رہتی تھی، اس طرح یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ سایا نے اس کے ساتھ کتنی نا انصافی کی ہے اور ابا نے کتنے تھپڑ لگائے۔ اسے تو سب سے بڑا غم اس بات کا تھا کہ بہان صاحب کی عنایت کردہ فراک اب اس کے بدن پر نہ چڑھتی تھی۔ اس لیے وہ مستقل طور پر فوزیہ کے پرانے کپڑوں میں زندگی گزارتی تھی، ایک بار سر میں جوئیں دیکھنے پر لنگڑی پھوپو نے اسے دو پیسے دیئے تو اس نے بھی فوزیہ کی نقل میں گولک خرید لی اور دوسرا پیسہ اس میں ڈال دیا، اس نے سوچا کہ فوزیہ کی طرح ایک آدھ مہینے بعد گولک توڑے گی تو وہ پیسوں سے بھری ہوگی، مگر شاہین نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔

”اری بولی، تو نے اپنے دونوں پیسے گنوا دیئے تا۔“

یہ سن کر وہ خوب روئی۔۔۔ شاید سارا دن روتی رہتی، اگر شاہین گولک توڑ کے اس کا پیسہ نہ نکال دیتا۔ ایک دن شام کو غزل اسکول سے آئی تو ایاز رضا کاروں کا ڈریس اتار کر اس کے پاس آبیٹھا۔

”آج سایا نے کچھ نہیں پکایا ہے۔“

: پھر تم نے کیا کھایا۔“ غزل نے بالکل اماں کے اسٹائل سے پوچھا

کچھ نہیں“ ایاز نے بڑی مسکین صورت بنا کر کیا۔“

غزل کا جی بیٹھ گیا، جب سے ایاز رضا کاروں میں شامل ہوا تھا، ان دونوں کی لڑائیاں بہت کم ہو گئی تھیں۔ خصوصاً جب سے ایاز رات کو ایک پیٹٹر کی دوکان پر کام کر کے اپنی اور غزل کی فیس جمع کرنے لگا تھا، غزل کو یوں لگتا جیسے اس کے سر پر امن و حفاظت کا ایک چھپر آ گیا تھا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بالکل ایک گریسٹن کے انداز میں اندر گئی اور سارے کنسترو اور ڈبے جھٹک ڈالے، مگر سچ مچ کی کہیں اناج کا ایک دانہ نہیں تھا۔

جانے دو ابا آکر لائیں گے۔“ ایاز نے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا، مگر اتفاقاً ایک لفافے مینتھوڑی سوچی مل گئی ”
،ڈبے میں گھی تو کافی تھا اور شکر کا ڈبہ تو بالکل ہی بھرا ہوا تھا، ایاز کا بھی بہت دنوں سے حلوہ کھانے کو جی چاہ رہا تھا
ان تینوں چیزوں کو ملا کر ہی تو اماں جلوہ پکایا کرتی تھیں۔

دھوپ ڈھل رہی تھی، ابا اور سایا، دونوں کے آنے کا وقت پور ہا تھا، اس لیے غزل نے جلدی جلدی دیگچی میں
سوچی شکر اور گھی ڈالا اور خوب بہت سا پانی ڈال کر بڑی نفاست کے ساتھ، بڑی عورتوں کے انداز میں کفگیر چلانے لگی۔
ایاز اس کے پاس چوکی پر بیٹھا اپنی چھوٹی سی بہن کی سمجھ بوجھ کا قائل ہو چکا تھا، غزل بالکل سایا کے انداز میں چوکی پر
بیٹھی تھی اور چولہے میں پھونکیں مار مار کے اس نے اپنے بالوں پر راکھ کی تہیں جمالی تھیں، ایاز بچارا دونوں ہاتھوں سے
، دھوئیں کے بادلوں کو ہٹا رہا تھا

”دھوئیں دھوئیں بھاگ تیرے بچے کو بجھونے کا ٹا۔“

مگر اس وحشت انگیز خبر نے بھی دھوئیں کو کہیں نہیں بھگایا۔

تھوڑی دیر تک تو غزل بڑی آسانی سے دیگچی میں کفگیر ہلاتی رہی مگر ایک دم حلوے کو جانے کیا سوچھی کہ اینٹھ
کر چاند آیا بن گیا اور دیگچی میں بیسیوں چھوٹی چھوٹی گیندیں پھدکنے لگیں، غزل اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جسم کی پوری
قوت لگا کر کفگیر ہلانے لگی، وہ چاہتی تھی کہ ابا کے آنے سے پہلے حلوہ تیار ہو جائے تا کہ آج وہ پہلی بار ایک چیز پکانے
کی شاباشی حاصل کر لے، اس گڑ بڑ میں ایاز نے اپنا ہاتھ بیچ میں لا کر جلا لیا اور اسے بچانے کی دھن میں غزل نے لکڑی کے
بجائے انگارے کو چھو لیا، پھر کفگیر پھینک پھانک روتی چلاتی وہ نل کے پاس بھاگی اور نل کی دھار تلے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اتنی
دیر میں ایاز نے حلوہ اتار کے ایک رکابی میں نکالا اور چمچے سے اس میں پڑی ہوئی گیندوں سے بلیرڈ کھیلنے لگا، حلوے کو
رکابی میں دیکھ کر غزل کی جان کچھ کم ہو گئی اور پھر یہ احساس کے سفید سفید میٹھی میٹھی چیز اس نے خود پکائی ہے، وہ
پھونک پھونک کر حلوہ ٹھنڈا کرنے لگی تا کہ سایا کے آنے سے پہلے اسے کھاپی کر قصہ پاک کر دیں، ایاز اس کے لیے بھی
ایک چمچ لے آیا۔ وہ دونوں پھونکیں مار کر حلوہ ٹھنڈا کر رہے تھے کہ سایا اندر آئی اس کے ساتھ اس کی جگری دوست ”علی
بی“ بھی تھی، سایا کو اس وقت اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرنا ضروری تھا اس لیے اس نے حلوے کی رکابی اٹھا کر دیوار پر پٹکی
اور دونوں کے ایک ایک دھپ رسید کیا۔

”ائیو، اماں کو کھا لیے دونوں پوٹے مل کر۔ میں کنیں نئیں دیکھا (ای سوئٹی پل) ایسے بچے۔“

وہ چلا چلا کر علی بی کی ہمدردی بٹور رہی تھی، علی بی نے بھی ایسے فتنوں کو دیکھنے سے صاف انکار کر دیا۔

ایاز تو کتابیں سمیٹ کر باہر چلا گیا اور غزل میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھی سسکیاں لیتی رہی، انگلی کی آگ بھڑک
کر اب پورے بدن کو جھلسائے دے رہی تھی سامنے دیوار پر برص کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا حلوہ اس کے سینے پر
چھریاں چلا رہا تھا، اگر وہ بھی ایاز کی طرح گرم گرم حلوے کے دو چار چمچے کھا لیتی تو محرومی کا احساس شاید اسے اتنا
شدید نہ ہوتا۔

ایاز بابو۔۔ ایاز علی شاہ۔“ باہر شاہین چلا رہا تھا۔“

غزل آنسو پوچھ کر اٹھ بیٹھی وہ بچپن کا سوکھا دبلا بدھو شاہین اب بڑا فیشن ایبل اور چالاک لڑکا بن گیا تھا، وہ بات
بات پر اب غزل کو احمق ثابت کر کے مانتا، اگر غزل کو روتا دیکھ کر حلوے کی کہانی سننا پڑی تو شاہین خوب مذاق بنائے
گا، اس لیے غزل آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایاز کہاں ہے ”شاہین سائیکل رکھ کر اندر آیا۔“

کہیں باہر گیا ہے۔“ غزل نے سسکیاں روک کر جواب دیا۔“

شابین نے بڑے غور سے غزل کو دیکھا اور بجائے اس کے کہ وہ غزل کے رونے کا مذاق اڑاتا اس نے آہستہ سے کہا۔

”لاحول ولا۔۔۔ جدھر جاؤ آنسو۔۔۔ رونا دھونا۔ آج چاند آیا آئی ہیں، بس وہ بھی روئے جارہی ہیں۔“

کیا چاند آیا آگئیں۔“ غزل خوشی کے مارے اچھل پڑی اور شابین کی خوشامد کرنے لگی کہ وہ اپنی سائیکل کے ”پیچھے بٹھا کر ”ایوان غزل“ پہنچا دے، پہلے توشابین حسب عادت ٹالتار ہا پھر کہا

”مگر ایک شرط ہے، تم اپنے گندے ہاتھ میری سفید قمیص پر نہیں لگاؤ گی۔“

”اللہ! میں تمہیں پکڑوں گی نہیں تو گر جاؤں گی۔“

وہ سب ہم نہیں جانتے۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔“

اچھا چلو جاؤ صورت ہمیں بھائی بھی ملے ہیں تو کیسی سڑی صورت والے۔“ وہ بڑ بڑانے لگی۔“

ابے او پوٹی۔ سڑی صورت بولی تو راستے میں پٹک دوں گا۔“ شابین نے دھمکی دی۔“

ہاں تو پٹک کر تو دیکھ تیری ساری سفید قمیص کو ہاتھوں سے میلا کر دوں گی، وہ راستے بھر شابین سے لڑتی رہی ”اور ”ایوان غزل“ پہنچتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ شابین اسے زبردستی لایا ہے، تاکہ کھانے کے وقت لنگڑی پھو پو سالن کی کمی اور مہنگائی کا رونا نہ شروع کر دیں۔ چاند آیا چپ چاپ رضیہ عالی کے کمرے میں بیٹھی کچھ لکھ لکھ کر مٹارہی تھیں پہلے تو غزل کو جھجک سی ہوئی کہ انہیں چاند آیا سمجھے یا کوئی ٹمٹماتا ہوا تاربو، ان کے چہرے پر جھلکتی ہوئی رنگوں کی لہریں جانے کس نے پونچھ ڈالی تھیں۔ وہ لہریے دار چمکیلے بالوں کے گھنگھرو اب مرے ہوئے سانپوں کی طرح سیدھے سیدھے لٹک رہے تھے، چمکتے ہوئے گالوں پر سیاہ دھبے ابھر آئے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے چاند آیا کوز رد رنگ میں غوطہ دے کر چھوڑ دیا ہو۔۔۔ وہ بڑی دیر تک چاند آیا کے سامنے بیٹھی جمانیاں لیتی رہی اور ہاتھ پاؤں پٹکتی رہی مگر وہ تو جیسے اپنی جھکی ہوئی گردن کو اٹھانا ہی بھول چکی تھیں، ورنڈے میں تخت پر بیٹھی فوزیہ بڑی شان سے بی بی کی ساری کاڑھ رہی تھی۔ بی بی، رضیہ اور لنگڑی پھوپو اپنے اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ غزل بھی فوزیہ کے پاس جا بیٹھی۔

چاند آیا کے دولہا کہاں ہیں۔۔۔!“ اس نے آہستہ سے کہا۔“

دولہا“ فوزیہ نے بالکل لنگڑی پھوپو کے انداز پر ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔“

”چاند آیا کی شادی کب ہوئی۔“

اچھا کیوں۔۔۔؟“ غزل دل ہی دل میں خوش ہوئی کہ چاند آیا کی شادی میں چکسا لگانے، ڈھولک بجانے اور دولہا کا جو ”تا چرانے کا ارمان پورا ہوسکتا ہے۔“

داد احضت اب ان کی شادی کسی مچی سے کریں گے۔“ فوزیہ کی بات پر غزل کو ہنسی آگئی۔“

تو پھر ان دنوں سے چاند آیا کہاں تھیں، ان کی خوبصورت کہاں کھو گئی! اور گردن جھکائے کیوں بیٹھی ہیں۔!“ غزل سوچے جارہی تھی۔

چاند آیا جانے کہاں کہاں سنجیو آ کو ڈھونڈتی پھریں، چاند آپانے اس سے کہا کہ پارٹی کا کام چھوڑ دو۔ وہ بھان صاحب سے کہہ کر سنجیو آ کو نوکری دلوادیں گی، مگر سنجیو آ نہیں مانا، بعد میں اس نے چاند آیا کو خط لکھ دیا کہ کسی بڑے آدمی سے

شادی کر کے مزے میں رہو، یہ سن کر چاند آپا بیمار پڑ گئیں، انہیں ٹی بی ہو گئی ہے، ڈیڈی انہیں بمبئی کے ایک ہاسپٹل سے ”لائے ہیں، ڈیڈی کے کسی دوست نے آکر بتایا تو بی بی نے زبردستی ڈیڈی کو بھیجا تھا۔

فوزیہ آپستہ آپستہ کہے جارہی تھی، اس کے لہجے میں چاند آپا کے لیے سخت نفرت اور حقارت تھی، فوزیہ کی کہسار پھسار سننے کے لئے غزل اس پر جھک گئی تھی، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور نہ جانے کیوں خوب رونے کو جی چادر ہا تھا۔

”اگر چاند آپا کی شادی ہوئی تو میں ہر ے مخمل کا سوٹ بناؤں گی۔“

فوزیہ نے یوں دوپٹہ سینے پر پھیلا کے کہا جیسے بہت کچھ چھپائے بیٹھی ہو۔ غزل بھی اس کی تائید کرنے والی تھی، مگر ہرے مخمل کا سوٹ اسے سو بار مرنے کے بعد بھی نہ ملتا، اس لیے وہ بڑے جاؤ سے بولی۔

”اور پن لوگ خوب مہندی لگا کر گانے گائیں گے نا۔۔۔؟“

آج جانے کیسے فوزیہ اس بات پر متفق ہو گئی اور ساری کے اوپر سوئی دھاگہ پھینک پھانک وہ دونوں بھاگیں باغ میں رات کی رانی کی کلیاں چننے، مگر آج جانے کیوں وہ دونوں اس کام سے بور ہو گئیں اور چھت کی طرف بھاگیں، تیرہ چودہ برس کی فوزیہ اب سیڑھیاں چڑھتی تو چوبی تختے اس کے بوجھ سے ہلنے لگتے تھے، غزل بھی اس سے کچھ کم نہ تھی، دونوں کسی غیر مرئی تار کی طرح کھینچتی چلی جارہی تھیں۔۔۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دھن میں چھت پر پہنچیں تو خیال آیا کہ یہاں کیوں آئے! فوزیہ منڈیر پر بیٹھ کر نیچے نوکروں کے کوارٹروں کا معائنہ کرنے لگی اور غزل نے منڈیر پر سے وہاں پڑی کوؤں کی بیٹ صاف کرنے کا عزم کر ڈالا۔۔۔ ”جانے کب ہوگی چاند آپا کی شادی؟“ غزل نے پھیلے ہوئے آسمان کو دور دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ”بشت۔۔۔ کون اجاڑ صورت مجھے گھور گھور کے دیکھ رہا ہے۔“ فوزیہ نے ”برا سامنہ بنا کر سینے پر دو پٹہ سنبھالا اور غزل کے پاس آبیٹھی۔۔۔“ یہ لنگڑی پھوپو ہیں نا بڑی خراب ہیں ماں۔

کیوں کیا کیے انوں۔“ غزل آج فوزیہ کی ہر بات پر چونک پڑتی تھی۔

انوں بولتے کتے اب چاند آپا سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔“ فوزیہ نے رکتے رکتے کہا۔ ”اونہ، ان کے بولنے سے ”کیا ہوتا، اللہ میاں ان کی شادی بھی کبھی نکو ہو۔ غزل نے یہ کہ سننے خود لنگڑی پھوپو سے ہی سیکھے تھے۔۔۔“ اس دن ڈیڈی سے بولی تھیں کہ اب فوزیہ کی شادی جلدی سے کر دو۔“ یہ بات کہتے وقت فوزیہ کا چہرہ سرخ مخمل بن گیا۔

بابا۔۔۔“ غزل جان بوجھ کر خوب زور سے ہنسی۔

داداحضت بھی بڑے وہ ہیں۔۔۔“ فوزیہ ر کے بغیر کہے گئی۔۔۔ ”کہنے لگے گوہر بیگم ٹھیک ہی کہی ہیں، لڑکیاں تو ”سالی پانی سے نکلی مچھلیاں ہیں۔

ایک دن بھی اٹھا کر رکھو تو بدبو کے مارے سارا گھر گندہ ہو جائے۔۔۔“ فوزیہ کی بات سن کر اچانک غزل کو چاند آپا کا سڑی مچھلی کی صورت چہرہ یاد آیا اور وہ چپ ہو گئی۔

پھر فوزیہ غزل کے اور پاس سرک آئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونے والے دولہا کی خوبیاں اور خامیاں گنانے لگی، اس وقت اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے فوزیہ کے سرکاموں بوجھ غزل کے دل پر جا پڑا تھا۔ فوزیہ غزل سے صرف دو مہینے بڑی تھی، اس کے باوجود غزل نے اس دنیا کے بارے میں کچھ نہ سوچا تھا جہاں فوزیہ جانے کب سے سیر کر رہی تھی، فوزیہ نے تو اپنے گھر شوہر کی محبت اور بچوں کی تعداد کے بارے میں بھی فیصلہ کر لیا تھا، کیا میری بھی شادی ہوگی! غزل نے پہلے کبھی یہ بات نہیں سوچی تھی، ابا بھی یہ بات تو اچھی جانتے ہی ہوں گے کہ زیادہ سینت کر رکھنے سے لڑکیاں مچھلیوں کی طرح سڑ جاتی ہیں۔

وہ دونوں نیچے اتر آئیں تو غزل کی آنکھوں میں نئے نئے رنگ بھرنے لگے، چاند آپا کی اداس صورت وہ بھول چکی تھی۔ آنگن میں اناج صاف کرتی ہوئی کا مٹین کھاتی ہوئی لنگڑی پھوپو اور ساری دنیا سے بے خبر چپ چاپ تخت پر بیٹھی ہوئی بی بی۔ ہر چیز گھوم رہی تھی۔ اپنے مرکز سے سرک چکی تھی۔۔۔ جیسے درودیوار نے شراب پی لی ہو۔

گجو یہاں آنا۔۔۔“ چاند آپا اسے نہایت کمزور آواز میں بلا رہی تھیں۔“

ہشت، اس کے پاس مت جانا۔ ٹی بی ہے۔“ لنگڑی پھوپو نے آہستہ سے کہا۔۔۔ مگر غزل کتیا کی طرح دانت نکو سے ”دورٹی ہوئی ان کے پاس گئی اس احتیاط کے ساتھ کہ چاند آپا کے اداس چہرے پر اس کے تجسس سے کوئی خراش نہ پڑ جائے۔

”تم کبھی کلب جاتی ہو۔۔۔؟“

اوپوں۔۔۔ غزل نے سر کے اشارے سے منع کیا۔“

”بس آپ ہی کے ساتھ ایک دو بار گئی تھی۔“

خیر، آج چلی جاؤ۔ مگر اکیلی جانا۔ یہ خط بہان صاحب کو دے آؤ۔ کہنا آج بی بابا کو بھجوا دیں۔ انہوں نے ادھر ادھر ”دیکھ کر خط غزل کی مٹھی میں تھما دیا۔۔۔ پھر ایک روپے کا نوٹ بھی اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ چاند آپا کا حکم ماننا غزل کی سرشت میں داخل تھا۔ مگر اکیلی کلب جانا کوئی معمولی بات تھوڑی تھی۔ اور پھر اس راز میں شاپین یا ایاز کو بھی شریک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر یہ بات رضیہ ممانی تک پہنچ گئی تو وہ چاند آپا کو اور رلائیں گی۔ غزل سمجھ چکی تھی کہ اب اس گھر میں کسی کو چاند آپا سے محبت نہیں رہی تھی۔

آخریدی ہمت کے بعد گھر جانے کے بہانے غزل نے تانگہ منگوا یا اور کلب پہنچ کر صرف پانچ منٹ کے لیے رکوا یا۔

جانے کتنے چپراسیوں اور کلرکوں کے مرحلوں سے نیٹ کر وہ اندر پہنچی تو بہان صاحب اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ بار بار اپنے گنجے سر پر ہال تلاش کر کے مسکراتے جارہے تھے۔

”آپ تو اب بڑی ہو گئیں بی بی۔۔۔ سچ مچ غزل بن گئیں ہیں۔۔۔؟“

وہ ہنس رہے تھے تو غزل کو بھی ہنسی آگئی۔ حالانکہ بہان صاحب کی نظروں سے وہ گھبرائی جارہی تھی۔

پھر انہوں نے آئس کریم منگوائی۔ سینڈوچ منگوائے۔ بسکٹ دودھ پیسٹری آئی۔۔۔ اور پانچ منٹ کی بجائے ایک گھنٹہ ہو گیا۔ چاند آپا کا وہ ضروری خط انہوں نے بغیر کھولے میز پر ڈال دیا اور غزل کو ایک مشکل شعر کی طرح مسکرا مسکرا کے پڑھتے رہے۔ بڑی دیر کی کوشش کے بعد جاتے وقت اس نے جواب مانگا تو بہان صاحب نے پائپ سلگا کر کہا۔

”چاندنی سے کہنا کہ سنجیوا جیل میں ہوتا تو اس کا خط پہنچوانے کی کوشش کرتا۔۔۔ وہ تو انڈر گراؤنڈ ہے۔“

وہ گھر آئی تو ابا اور سایا کمرہ بند کر کے سوچکے تھے۔ ایاز لالٹین سامنے رکھے اونگھ رہا تھا۔ غزل نے آتے ہی وضو کر کے چار رکعت نماز پڑھی کہ اس کا راز افشا نہ ہو اور پھر دھڑکتے دل کو لیے پلنگ پر جالیٹی۔۔۔ بہان ماما کا گنجا چمکدار سر بار بار اس کے سامنے جگمگا رہا تھا۔ اور آئس کریم کی ڈکاریں ابھی تک آرہی تھیں۔ آج وہ یاد کر رہی تھی کہ جانے ابا نے چاند آپا کی کون سی کل چھولی تھی جو اس دن سے چاند آپا اسے بھی بھول بیٹھیں۔ ورنہ آج وہ بھی چاند آپا کی طرح سیکڑوں ڈراموں میں کام کر چکی ہوتی۔

دوسرے دن وہ کیچڑ میں سنی ہوئی گڑیا کی چوٹی باندھ رہی تھی کہ دروازے پر کارکنے کی آواز آئی۔

آج بی بی کیوں آئی ہیں۔۔۔؟“ وہ باہر جاتے جاتے رک گئی۔ اور پھر جھری میں سے اماں کی طرح باہر جھانکنے لگی۔“

بہان صاحب ابا سے کہہ رہے تھے کہ بھارت کلا منڈل والے ایک بار پھر غزل کو اپنے ڈراموں میں لینا چاہتے ہیں۔ وہ ابا کو یقین دلا رہے تھے کہ غزل ان کی نگرانی میں رہے گی۔

ایک دم وہ جیسے سلاخوں کو توڑ کے بھاگی۔ جی چاہا بہان ماما سے لیٹ جائے۔ مگر ابا کی موجودگی میں وہ نہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔۔۔ ابا بھی اپنی مسرت کو دبائے مسکرائے جارہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ عذر بھی پیش کرتے کہ محض آپ کے حکم پر راضی ہوں ہا ہوں ورنہ ہم مرشد زادوں میں لڑکیوں کو سخت پردے میں رکھا جاتا ہے۔

بہان صاحب نے اپنے کپڑوں میں جانے کون سا عطر لگایا تھا کہ سارا کمرہ گلزار بن گیا۔ بہان صاحب بیٹھے ہوئے تھے تو کمرے کی سیاہ چھت غزل کو ان کی شفاف چند یا میں نظر آرہی تھی۔

چاند آپا بہان صاحب کے گنجے سر کا بہت مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ چاند آپا بڑی بے رحم تھیں۔ ریاض تمنائی جب ان کے حسن کی تعریف میں نظم لکھ کر سناتا تھا تو اس کا اتنا مذاق بناتیں کہ وہ بیچارا رونے لگتا تھا۔ جو آنکھ انہیں دیکھتی وہ اسے کچل کر ہنسے جاتی تھیں۔ اور پھر کلب کے دو دن بھی غزل کو یاد تھے جب سنجیو آپا نے سیاہ چہرے پر سیاہ بال بکھیرے ، لا پرواہی سے کسی کونے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جاتا تھا۔ اور چاند آپا تتلی کی طرح اس کے آس پاس منڈلانے جاتی تھیں۔ ایک بار پیچھے سے آ کر انہوں نے سنجیو کے کاندھے پر تھوڑی ٹکادی تھی تو اس نے ہاتھ سے ہٹا کر کہا تھا۔

”چاند پہلے سوچ لو تم ایسے کب تک میرے ساتھ چلو گی ؟“

اور چاند نے غزل کی موجودگی نظر انداز کر کے سنجیو کے بالوں کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

تم سامنے ہو تو میں کچھ نہیں سوچتی۔ جو ہوتا ہے ہو جائے۔“

جانے چاند آپا کو وہ اجاڑ صورت کالا بھجنگ کیا پسند آ گیا تھا جس نے ان کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ ایک بہان ماما ہیں کہ ابھی تک کتنے بینڈسم ہیں۔ کتنے گریس فل۔۔۔

ان کی بڑائی سے تو غزل اور ہمایوں بعد میں واقف ہوئے ، جب انہوں نے غزل کو اپنے کلب کا ممبر بنا کر چاند کو انگاروں پر لوٹنے کا سامان کر دیا۔ اس کے علاوہ بہان صاحب نے مکان کا کرایہ ادا نہ کرانے کی قرقی رکوا دی۔ ہمایوں کو آفس میں ترقی دلوانے کا وعدہ کیا۔ اور پھر اس بات کا بھی اقرار کیا کہ وہ ”الف لیلہ“ میں ہمایوں کا حصہ اس کے سوتیلے بھائیوں سے دلوادیں گے۔

غزل کے تو ٹھاٹھ ہو گئے۔ وہ ہر جگہ بہان ماما کے ساتھ کار میں گھومنے لگی۔ کلب کے سارے ممبر غزل کی طرف دیکھنے لگے۔

بلغرامی تک اسے دیکھ کر مسکرائے لگا۔ حالانکہ بلغرامی کا ایرانی حسن اسے خواتین میں بیحد مقبول بنائے رکھتا تھا اور ہر خاتون کا خیال تھا کہ بلغرامی پر جیسے ہی کسی فلم ڈائریکٹر کی نظر پڑیگی وہ بمبئی اڑ جائے گا۔ اس لیے سب کی کوشش ہوتی کہ مستقبل کے اس اشوک کمار کے ساتھ اپنے تعلقات کو جہاں تک ہو سکے آگے بڑھائیں۔ ویسے بھی بلغرامی کے سنہرے بال ، گورا رنگ اور خوب صورت بدن کو دیکھ کر عورتیں بے قرار ہو جاتی تھیں مگر غزل کبھی اس کی طرف نہ دیکھتی۔ کیوں کہ بہان ماما نے ایک بار سے بتایا تھا کہ بلغرامی سے بچ کر رہنا۔ وہ بڑا بد معاش ہے۔ اور وہ بلغرامی کے سائے سے بھی بچنے لگی۔ یوں بھی بہان ماما کا حکم ماننا اس پر فرض تھا۔ کیوں کہ وہ نہ صرف اس کے ابا پر احسان کئے جارہے تھے۔ بلکہ انہوں نے غزل کو بھی تحفے دینا شروع کر دیئے تھے۔ شرٹس کے پیس، دوپٹے، سونے کا لاکٹ اور نئی نئی قسم کی چپلیں۔

پھر ایک بار بہان ماما نے اسے ساری پہنے کا مشورہ دیا۔ اور پھر خود ہی اس کے لیے اکٹھی پانچ ساریاں لے آئے۔ ایسی قیمتی اور خوبصورت ساریاں کہ چاند آپا کی الماری میں بھی نہ ہوں گی۔ اس کے ساتھ لپ اسٹک، پاؤڈر اور جانے کیا کیا ”امیک اپ کا سامان تھا۔ غزل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان چیزوں کو کہاں اور کیسے استعمال کرے

جب کبھی شام کے وقت بہان ماما اسے پکچر لے جانے کے لیے آتے تھے تو ابا ڈرتے ڈرتے منع کرتے اور پھر خود ہی غزل کو جلدی تیار کر وا دیتے تھے۔ ایک دن بہان ماما اسے اپنے گھر لے گئے۔

ان کا بنگلہ تھا کہ کسی بادشاہ کا محل۔ غزل نے زندگی میں کبھی اتنا خوب صورت مکان نہ دیکھا تھا۔ مگر اس گھر میں نوکروں کے سوا اور کوئی نہ رہتا تھا۔ ایک بار چاند آپا نے بتایا تھا کہ بہان صاحب کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی۔ اس لیے وہ دو تین مکان بیچ کر ایک چھوٹے سے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ علیحدہ رہتی تھیں اور چاند آپا کے کالج میں پڑھاتی تھیں۔ ایک لڑکی تھی جو چاند آپا کے ساتھ ہی میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی اور ایک لڑکا تھا جو اب شاہین کا بڑا دوست بن گیا تھا۔ روز شام کو وہ ”ایوان غزل“ آتا تھا۔ شاہین کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ غزل نے چاند آپا سے ان کے بہت سے قصے سنے تھے کہ اتنے اچھے بہان صاحب سے ان کی بیوی بچوں کو سخت نفرت تھی۔ شاہین نے ایک بار کہا کہ بہان صاحب چاند آپا کے ساتھ ”کہینجار بے تھے تو ان کی بیوی نے غصہ سے کہا۔

”بوڑھے بندر کو کچی کیریاں کھانے کا بڑا شوق ہے۔“

غزل کا جی چاہتا تھا کہ کبھی بہان ماما کی بیوی سے جا کر خوب لڑے کہ انہوں نے اتنے اچھے آدمی کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ایسا سخی انسان، اتنا اچھا بنگلہ اور کیا چاہیے انہیں۔۔۔ بلکہ ایک دن تو اس نے وہاں جانے کا پکا ارادہ کر لیا لیکن بہان ماما نے روک دیا کہ نہیں میری طرف داری کرتے دیکھ کر وہ اور جلے گی۔

اب غزل کا زیادہ وقت بہان ماما کے ہاں گزرتا تھا۔ شام کی چائے وہیں پیتی۔ آفس سے ہمایوں بھی وہیں چلا جاتا تھا اور بیٹھا بہان صاحب کو روغن قاز ملا کرتا۔ ہمایوں کے باپ کے آگے لوگ سجدہ کرتے تھے۔ اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے ملتے اور ان کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ ہمایوں جانتا تھا کہ کسی چڑیل نے اس سحر کو توڑ دیا ہے اور وہ ”الف لیلہ“ کے عیش و آرام سے اٹھا کر اسے بھوتوں کے مسکن میں چھوڑ گئی ہے اب یہاں بھی ایک خدا کی حکمرانی تھی۔ جس کے آگے سجدہ کرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے اعجاز سے چودہ طبق روشن ہو سکتے ہیں۔

غزل اب بڑی سگھڑ ہو گئی تھی۔ وہ بہان ماما کے لیے چائے بناتی ان کے نہایت چھچھورے اور بڈھے دوستوں کی خاطر تواضع کرتی۔ ایک بار ان کے کسی دوست نے غزل کو گھر میں دیکھ کر بہان سے کہا۔

”تو کیاننی کار آگنی آپ کے ہاں؟“

ابھی نہیں“ انہوں نے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر کہا۔

”اس معاملے میں جلدی نہیں کرتا ہے۔“

کون سی کار ماما۔۔۔؟“ غزل نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

اور وہ پہلے والی۔۔۔؟“ ان کے دوست نے غزل کی موجودگی نظر انداز کر کے کہا۔

”ارے وہ تو اب بہت پرانی ہو گئی ہے۔“

”سنا ہے بیمار ہے۔۔۔؟“

”ہاں ایک کمیونسٹ چھوکرے کے عشق میں۔“

بہان ماما نے کسی کام سے غزل کو اندر بھیج دیا تو وہ پلنگ کے کونے پر جا بیٹھی یہ سب چاند آپا کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ کیا اتنی نا سمجھ ہے۔ یہ بہان صاحب کیسے بے درد ہیں۔ سامنے تو چاند آپا کی کتنی تعریفیں، کرتے تھے اور آج انہیں ”پرانی موٹر بنادیا جانے اب کون سی نئی موٹر خریدنے والے ہیں؟“

ایک غیر محسوس سا خوف اسے چاروں طرف سے گھیر نے لگا۔ بی بی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں یہ غیر لوگ ہمارے کون ہیں۔ میں کیوں یہاں آئی ہوں۔ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ غریب لڑکی ہے یہاں خوب اچھی اچھی چیزیں کھانے کو ملتی ہیں۔ اس لیے ندیدے پن میں آجاتی ہے۔۔۔ اب یچارے بہان ماما اتنے خلوص سے بلاتے ہیں تو انکار کیسے کیا جائے۔ انہوں نے اتنے ابا کے بگڑے کام بنادیے۔ جانے کتنے سو روپے تو انہوں نے ابا کو ابھی تک قرض دیئے تھے۔ جیہی تو وہ ضرورت سے زیادہ ان پر مہربان ہوئی جاتی تھی۔۔۔ بہان ماما کا ہر حکم سر آنکھوں پر لینا پڑتا۔ ان کی نہایت بے تکی باتوں پر وہ زبر دستی ہنستی۔ جس وقت وہ لڑکھڑاتے ہوئے جانے کیا اول فول بکنا شروع کرتے تھے۔ جب بھی غزل ان کے ساتھ ہنسی مذاق کیے جاتی۔ حالانکہ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔۔۔ مگر وہ بار بار غزل کو سناتے۔ کھاتے کھاتے اس کی پلیٹ چھین لیتے۔ پیچھے سے اچانک آ کر آنکھیں بند کر دیتے۔ اور پھر ایک بار انہوں نے کھیل میں غزل کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا تو وہ بہت گھبرا گئی۔ اس نے جانے کیسے ماما کو ڈھکیل دیا اور ایک انجانے خوف سے وہ کمرے سے باہر جو بھاگی تو گیٹ سے باہر تھی۔

جانے کیوں اس دن بہان ماما سے بہت ڈر لگ رہا تھا جیسے وہ اتنے اچھے خلوص والے انسان نہین کوئی اور آدمی بن گئے ہوں۔ ایک اجنبی۔ خوفناک صورت والے اور پھر کئی دن تک وہ بہان صاحب کے گھر نہیں گئی تو ایک دن انہوں نے آکر خوب شکایت کی۔

”غزل ہم سے خفا ہے۔ اس لئے اب ہم بھی کھانا نہیں کھائیں گے۔“

نہیں ماما میں کیوں خفا ہوتی آپ سے۔“ دل ہی دل میں وہ بے حد شرمندہ تھی کیسے اچھے ماماتو ہیں۔ اس کا اتنا خیال ”کرنے والے۔ غزل اجازت صورت تجھے کبھی کسی نے اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ کوئی تیرے خفا ہونے سے کھانا چھوڑ سکتا ہے۔ اور تو ہے کہ اثرائی جاری ہے۔ دیکھ لے چاند آپا کا حشر۔ اتنا غرور نکو کر منحوس صورت پوٹی۔

وہ بڑی دیر تک اپنے آپ کو خود ہی گالیاں دیتی رہی۔ اس نے کئی بار دل کی خود سری اور خواہ مخواہ کے اندیشے ظاہر کرنے پر اپنے آپ کو خیال ہی خیال میں کئی لاتیں ماریں۔ کس کس کر۔ اور بس پھر وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔۔۔ جیسے ابا کے جوتے کھانے کے بعد سو جایا کرتی تھی۔

اس نے تصور میں اپنے آپ کو بہت بڑا دیکھا۔ چاند آپا کی طرح اونچی پوری سچی بنی۔۔۔ اہم شخصیت کی مالک۔ لوگ اس کے وجود کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیسا عظیم واقعہ تھا۔ دنیا کا سب سے نا قابل یقین حادثہ۔ اور ان بہان ماما کو وہ کیا کرے! کیسے ان کی قدر کرے۔ ایسے انسان کی جو غزل جیسی حقیر اور غیر اہم ہستی کو اتنی اہمیت دے رہے تھے۔

اب اسے بھی چاند آپا کی طرح سوسائٹی میں بیٹھنے کے طور طریقے آگئے تھے۔ پھونکیں مار مار کے چائے پینا اب اس نے چھوڑ دی تھی۔ سامنے چاہیے کتنی ہی مزیدار چیزیں رکھی ہوں۔ مگر جب تک ایک چیز ختم نہ ہو جائے دوسری ہرگز نہ اٹھائے۔ جیسے ہی سب کھانا ختم کر کے اٹھتے تھے وہ بھی گودے کی ہڈی توڑنے کی کوشش چھوڑ کر اٹھ جاتی تھی۔

اب کئی ڈراموں میں اسے ساری باندھنا پڑی۔ مگر ساری پہننا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ کتنے ہی چکروں میں لپیٹو مگر پھر بھی ڈھیروں کپڑا بچ جاتا تھا۔ یہاں بھی بہان صاحب کام آئے۔ کیوں کہ وہ صرف ایک بزنس مین ہی نہیں تھے۔ بلکہ بھارت کلا منڈل کے پریسیڈنٹ بھی تھے۔ اس کے علاوہ ڈرامے لکھنے کے فن سے لے کر میک اپ کی جدید فن سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ غزل کو نئی طرح سے بدن کے ساتھ لپٹی ہوئی ساری پہننا بھی انہوں نے ہی سکھایا۔ مرنے سے پہلے اکثر امان کہا کرتی تھیں۔ اللہ جانے کہاں ہے۔ میری کیوں نہیں سنتا۔؟

اور اماں کے بعد ہر مصیبت کے وقت ہمیشہ پٹتے وقت وہ بھی آسمان کی وسعتوں میں اللہ میاں کو ڈھونڈتی۔ مگر کبھی اللہ میاں اسے نظر نہیں آئے۔ جانے وہ کتنی دور ہیں کبھی کسی کی فریاد نہیں سنتے۔۔۔ مگر اب اللہ نے اس کی سن لی تھی۔ وہ جو ہر نماز کے بعد سچ مچ سجدے میں گر کر جانماز بھگو دیتی تھی۔۔۔ جانے اللہ میاں سے کیا مانگتی۔ صرف اس کے ہونٹ لرزتے رہتے۔ ہاتھ پھیلے ہوئے۔ اور اس کا چہرہ آنسوؤں میں ڈوب جاتا۔ کیا اللہ میاں سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ باقاعدہ اپنی خوابشوں کی لسٹ انہیں سنائی جائے۔۔۔؟ پھر بھی اکثر غزل نے سوچا کہ وہ کیا چاہتی ہے تو وہ خود بھی اپنی کسی خواہش کا تجربہ نہ کر سکی۔۔۔ مگر ایک بار جب ابا کی باتوں سے دکھتا ہوا بدن لیے وہ اپنی پلنگ پر کروٹیں بدل رہی تھی تو اُسے اس بات پر رونا آیا تھا کہ اپنا دکھ وہ کسے سنائے۔۔۔؟ اس دُنیا میں اس کا کون تھا؟ اور پھر جانے کس خوف سے وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔۔ اندھیرے میں اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ابا اور سایا دوسرے کمرے میں تھے۔ اس کے پاس دوسرے پلنگ پر ایاز کسی گہری نیند میں مست تھا اس کی طرف سے کروٹ لیے۔ سب ہی اس کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ اس اندھیرے کے جنگلیں۔۔۔ خاموشی کے ناپیدا کنار سمندر میں، میں اکیلی ہوں۔ اس کے دل پر جیسے کوئی بھاری پتھر گر پڑا۔۔۔ یوں لگا جیسے اسے اکیلا پاکر سامنے سے بھوتوں کے قافلے آرہے ہیں۔ خوفناک درندے اس کی تاک میں کھڑے ہیں۔۔۔ اور پھر ایک کلا بھجنگ شیطان اس کی طرف بڑھا۔ سرخ سرخ زبان نکالے۔ اس کی آنکھوں میں شعلے دھک رہے تھے۔ اور ناخنروں کی طرح مڑے ہوئے تھے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ ابا۔۔۔ ایاز۔۔۔ بھائی مجھے بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔ وہ چیخ مار کے بیہوش ہو گئی۔ سب اٹھ گئے۔ اس دن سے ایک نئی مصیبت نے آگھیرا۔۔۔ دوسرے تیسرے دن اسے چلانے اور ڈرنے کا دورہ پڑنے لگا۔ جیسے ہی وہ اکیلی ہوتی اور خوفناک آنکھوں والے شیطان اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے۔

جمعرات کے دن دونوں وقت ملتے میں نہا کر چھت پر ٹہلی ہوگی۔ کوئی سایا ہے۔ بی بی نے نہایت وثوق سے کہا۔

میں شاہ صاحب کے پاس لے جاؤں گی۔ ایک تعویذ میں ٹھیک ہو جائے گی۔“ لنگڑی پھو ہونے تسلی دی۔

اس نے جانے کتنے فلیتے گھول کر بی ڈالے۔ لیکن ان بھوتوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔

اسی لیے وہ بھان ماما کے ہاں زیادہ وقت گزارتی۔ لیکن یہ بات ”ایوان غزل“ میں کسی کو پسند نہیں تھی۔ ایک دن فوزیہ نے اپنی لمبی ناک سکیر کر کہا۔

”چھی تم نے اپنے لیے کیا سڑی صورت بڈھا دولہا ڈھونڈا ہے غزل۔۔۔ انے تو ڈیڈی سے بھی بڑا ہے کتے۔“

فوزیہ کی اس غلط فہمی پر وہ بہت ہنسی۔۔۔ خفا بھی ہوئی۔ بھان صاحب تو اس کے ماما تھے۔ اب اگر اپنے ماما سے ہنسی مذاق کر دیا ان کے گھر چلے جاؤ تو کیا یہ کوئی بری بات ہوئی ہے؟ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ بھان ماما اس کے کون تھے! وہ اس کے مشکل کشا تھے۔ جنہوں نے اس کے سر پر اپنی مہربانیوں اور احسانوں کا اتنا بوجھ رکھ دیا ہے۔

مگر گھر آنے کے بعد فوزیہ کی بات یاد کر کے وہ بہت روئی۔ اللہ میاں۔ لوگ کتنے جل ککڑے ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی خوشی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس دن نماز کے بعد اس نے بھان ماما کی بیوی کے واپس آنے کی دُعا مانگی۔ تا کہ سب لوگ ایسی گندی باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ کئی بار اس نے سوچا کہ بھان صاحب کے ہاں جانا چھوڑ دے مگر گھر میں بھی جی لگتا نہ تھا۔ حالانکہ ایاز کے سوا سب ہی اس پر مہربان ہو گئے تھے۔ ابا تو جیسے زندگی بھر کی بے التفاتی کا کفارہ ادا کر رہے تھے سایا بھی اب بغیر مانگے کھانا دینے لگی تھی۔ مگر ایاز کو فوزیہ اور بی بی نے جانے کیا پٹی پڑھائی تھی کہ اسے غزل کا باہر گھومنا اور بھان کے ہاں جانا قطعاً پسند نہیں تھا۔ اس نے کئی بار اسے روکا۔ مارا۔۔۔ تو تو میں میں ہوئی۔۔۔ اور پھر یہ بھی دھمکی دی کہ اگر پھر کبھی بھان ماما کے ساتھ کہیں گئی تو ایاز گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ شہزاد اسی طرح گھر چھوڑ کر جو گیا تو۔۔۔ پھر نہیں آیا۔ اس لیے ایاز کی اس دھمکی پر وہ سہم گئی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ایاز کو فوزیہ نے بھڑکایا ہے۔ کیوں کہ وہ غزل سے بہت جلتی تھی۔ سب ہی کو اس پر غصہ آتا تھا۔ خاص طور سے چاند کو بھان کے ہاں غزل کا جانا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ کئی بار اپنی کمزور آواز میں چاند نے اسے ڈانٹا کہ بھان سے مت ملو۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

ارے جاؤ چاند آپا۔۔۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

بہان سے اچھا کون آدمی ہے؟ ہمیں بتاؤ نا...! تم تو خودی جھگڑا لوتھیں۔ ہر ایک سے لڑ جھگڑ کر آگئیں۔ اب میں کیا کروں...؟ کہاں جاؤں... اگر بہان ماما نہ ہوتے تو اب تک ابا اس کا قیمہ بنا کر چیل کو وں کو کھلا دیتے۔

پھر ایک دن چاند نے ہمایوں کو خط لکھا کہ وہ غزل کو بہان کے ہاں نہ جانے دے۔ اس نے بہان کے کردار کے نہایت گھناؤنے پہلو دکھائے تھے۔ وہ خط ہمایوں نے بہان کو دکھا دیا۔

پھر ایک بار ہمایوں سے لنگڑی پھوپھو کا مچپٹا ہوا۔ بعد میں واحد حسین اور راشد بھی ایک بار سمجھانے آئے۔

ہمایوں کہتا تھا کہ وہ لوگ چاہتے ہیں غزل ہمیشہ فوزیہ کی اترن پہنے۔ فقیر کی طرح ان کی جھوٹن کھانے کو وہاں پڑی رہے۔ یہ باتیں غزل کو بھی سچ لگتی تھیں ہمایوں کہتا تھا کہ سارے سسرالیے اس کے دشمن ہیں۔ بتول کی زندگی میں جب ہمایوں ”الف لیلہ“ سے نکالا گیا تو کبھی نانی کو بچوں کے مستقبل ی فکر نہ ہوئی اب جب غزل اتنی محنت کے بعد اعلیٰ سوسائٹی میں پہنچ گئی ہے تو سب کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔

غزل ایک دن ”بھارت کلا منڈل“ کے آفس میں بیٹھی بہان صاحب کا انتظار کر رہی تھی کہ بلگرامی آگئے۔ بلگرامی بہان صاحب کے دوست تھے اور بھارت کلا منڈل کے ہر ڈرامے میں چاند کے ساتھ ہیرو بنتے تھے۔ بہت ہی خوب صورت، صحت مند اور خوش مزاج۔ جب غزل چھوٹی سی تھی اور چاند آپا کے ساتھ یہاں آتی تھی تب بھی وہ بلگرامی کو دیکھے جاتی۔ یوں جیسے ایک خوبصورت گڈے کو دیکھتی تھی۔ سنا ہے بلگرامی کی اداکاری کی دھوم بمبئی تک مچی ہوئی تھی۔ جس وقت وہ اسٹیج پر چاند آپا کے ساتھ آتے تو یوں لگتا جیسے پری چہرہ نسیم اور پریم ادیب کی جوڑی آگئی ہو۔ اسی لیے جس دن سے چاند بھارت کلا منڈل سے نکلی۔ بلگرامی کو کسی لڑکی کے ساتھ کام کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ویسے وہ ہر لڑکی سے خوش مزاجی سے ملتے تھے۔ خصوصاً غزل کو تو چھوٹی بچوں کی طرح گود میں اٹھا لیتے تھے۔ ایک آدھ بار انہوں نے بہان صاحب سے کہا بھی کہ اب غزل کو اونچی ایڑی کا سینڈل پہنا کر ان کے ساتھ ہیروئن بنادو۔ لیکن بہان صاحب نے یہ بات نہیں مانی۔ حالانکہ بہان صاحب نے بھی سنا تھا کہ عورتوں کی طرح... بلگرامی پر مرتے تھے۔ اور بلگرامی کے عاشقوں میں خواتین کے علاوہ بہت سے حسن پرست مرد بھی شامل تھے۔ پھر سنا ہے چاند ہی کے سلسلہ ایک بار بلگرامی سے بہان صاحب کی کچھ تلخ کلامی ہوگئی، غزل کو یہ بات ذرا اچھی نہ لگتی تھی۔ یوں بھی کلا منڈل میں آنے دن جو تم بیزار ہوا کرتی تھی۔ کل عطیہ کی وجہ سے وائلن بجانے والے روئے اور میک اپ مین سعادت میں لڑائی ہوگئی۔ پھر کسی نے بلگرامی اور بہان صاحب کے رشتے پر بنسی مذاق کیا اور بلگرامی منہ سجانے بیٹھا ہے۔ کسی دن بلگرامی نے چاند کے بارے میں بہان صاحب سے کچھ کہہ دیا اور بہان صاحب ایک ایک سے نیٹتے پھر رہے ہیں۔ یوں بھی بلگرامی تو سب ہی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتا تھا۔ سب ہی اس کی خوب صورتی اور مقبولیت سے جلتے تھے... وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ باپ رائل فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ ماں ایرانی نژاد تھی اور کسی کالج میں فارسی پڑھاتی تھی۔ بلگرامی میں ایران کی خوبصورتی تھی اور شاہی خون کی نخوت اور جاہ و جلال بھی۔ ماں کی ذہانت اور باپ کی عیش پسندی بھی اس کے خون میں شامل تھی۔ جاگیر دار کالج سے بی۔اے میں تین بار فیل ہونے کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا اور گانے اور ایکٹنگ کی طرف نکل گیا۔ حیدر آباد کی ہر محفل موسیقی میں وہ ضرور شریک ہوتا۔ پھر جب عثمانیہ کے طالب علموں نے ڈرامے اسٹیج کرنا شروع کیے تو ان ڈراموں کا ہیرو بلگرامی ہی ہوتا تھا۔ اس کی سبز آنکھوں، سنہرے بالوں اور چمکدار ایرانی رنگت کی طرح اس کی آواز میں بھی بڑا جادو تھا، جو کنواری، بیباکی، سب ہی کو اس کے قدموں میں لا ڈالتا تھا۔ اکثر جب وہ غزل کے ساتھ کوئی ٹوٹ گا تا تھا تو اس کی تال سر سے گر جدار آواز میں غزل کی بے سری بار یک آواز بھٹکنے لگتی تھی۔ مگر پھر بھی وہ غزل کی بہت تعریف کرتا تھا تو خیر... آج بھی بلگرامی آئے تو انہوں نے تنہا بیٹھی ہوئی غزل کی اداسی بڑھالی۔

آج کل آپ مجھے اکثر اداس کی نظر آتی ہیں...؟“ بلگرامی پہلا آدمی تھا جو اسے تم کی بجائے آپ سے مخاطب کرتا ”
تھا اور اس طرح غزل کو فوراً اپنے بڑے پن کا احساس ہوتا۔

”نہیں تو۔۔۔“ مدت سے دبی ہوئی آہ اس کے دل سے نکلی اور وہ چونک پڑی۔ کیا اس کی اداسی اتنی اہمیت رکھتی ہے ” لوگ تو اسے رلا کر مار کر بھول جاتے ہیں بلگرامی نے اسے اتنے غور سے کیوں دیکھا۔۔۔؟ وہ جیسے کسی گرمی سے موم کی طرح چھلنے لگی۔

”آپ شاید اپنے مستقبل کے لیے فکر مند ہیں؟ آپ جیسی خوب صورت آرٹسٹ کا مستقبل واقعی شاندار ہونا چاہیے۔“ وہ غزل کے قریب آ بیٹھا۔ اب وہ کیسے کہتی کہ اللہ کے لیے اتنی عنایت مت کرواؤں میٹھے لہجے میں بات مت کرو کہ مٹھاس کازبر میری رگ رگ کو کاٹ دے۔

”ہونا ہی چاہیے۔“ وہ غزل کو دیکھے جارہا تھا۔

یہ سب بھان صاحب کی حماقت ہے۔ آپ جیسی آرٹسٹ اگر میرے ساتھ ہوتی تو جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ بھان صاحب کو برا کہنا اسے اچھا نہ لگا۔ مگر آج جانے منہ کو کیا ہو گیا تھا کہ کوئی بات نہ نکل سکی۔ سچ پوچھئے تو بھان صاحب کو اپنی عشق بازیوں سے فرصت ہی نہیں ہے اس لیے کلا منڈل میں کوئی ڈھنگ کا کام ” نہیں ہو رہا ہے۔

اب مارچ میں شوکت تھانوی کا ڈرامہ۔“ بڑی مشکل سے اس کی زبان ہلی۔

نہیں جی۔ یہ لوگ اب کوئی کام نہیں کریں گے سوائے عشق بازی کے۔۔۔“ بلگرامی نے غزل کی بات کاٹ کے سگریٹ ” سلگایا۔ غزل سر جھکائے اپنے پرس کے ستارے نوچے جارہی تھی۔

”بیچاری چاند کو بھان صاحب نے برباد کر کے چھوڑا۔ اور اب آپ کی باری۔۔۔“

”پھر وہ جھٹ بات چھوڑ کے دوسری بات لے بیٹھا۔“

”حیدر آباد آرٹ سوسائٹی والے تو اس سال اپنا ڈرامہ لے کر بمبئی جارہے ہیں۔“

!مگر غزل کے سینے پر تو کسی نے خنجر مار دیا تھا۔ چاند آپا کو بھان نے برباد کیا اور اب میری باری ہے۔

! تو کیا سچ مچ بھان مجھ سے عشق کرتا ہے۔۔۔ ہائے اللہ اب کیا ہوگا

ہونہ جانے دو نہیں کیا۔۔۔“ اس کا جی چاہ رہا تھا اب اٹھ کر بھاگ جائے۔ بلگرامی اس کی ساری حقیقوں سے واقف تھا۔

”میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اب حیدر آباد آرٹ سوسائٹی میں چلا جاؤں۔ کلا منڈل کو چھوڑ دوں۔“

اس نے اپنے چہرے پر اشوک کمار کی اداسی طاری کر کے کہا۔

کیوں۔۔۔؟“ غزل کو جیسے کسی نے دھکا دے دیا۔ اب بھان صاحب سے بھاگ کر وہ کہاں جائے گی۔ کون اسے اتنی ” عزت دے گا۔

”کیا کریں۔۔۔!“ یہاں کے ہماری پروا ہے۔؟“

اس نے غزل کے چہرے کو غور کر کے دیکھا۔

مگر سب لوگ آپ کی اداکاری کو بہت پسند کرتے ہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے لوگوں کی رائے کی کوئی پروا نہیں۔ سچ پوچھئے تو میں صرف آپ کی خاطر یہاں پڑا ہوا ہوں۔“

میری خاطر... میری خاطر... میری خاطر۔ میرے لیے۔ یہ اتنا خوبصورت آدمی۔ اتنا بڑا آدمی۔ اتنا مشہور۔ اس کی ہر ادا پر چاند سے لے کر رضیہ ممانی تک مرتی تھیں۔ اس کے پیچھے عورتیں آٹوگراف بک لیے پھر تیں۔ یہ خوب صورت شہزادوں کی صورت ہیرو میرے لیے۔ یا اللہ آج کیا ہو رہا ہے۔ کہیں میں مر نہ جاؤں۔ بلگرامی کا وہ جملہ جانے کتنے رنگوں میں ڈوبا۔ کتنے چاند بن کر چمکا۔ بارش بن کر آسمان سے آیا اور غزل کے سارے وجود کو سرشار کر گیا۔ اب کیا رکھا تھا اس میں جو وہ سینت کر رکھتی۔ اس نے کئی بار زکام کے بہانے اپنے کمبخت خود بخود ٹپکنے والے آنسوؤں کو پو نچھا۔ مگر بلگرامی نہایت اطمینان سے اس کا ہاتھ دیکھنے اور اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافیاں گنوانے میں وقت ضائع کرتا رہا۔ آج کلا منڈل کے وہ سارے بدنصیب فنکار جانے کہاں اجڑے تھے جو نگاہوں سے اڑتی چڑیوں کے پر گن لیتے تھے۔ مگر آج غزل کا ہاتھ بلگرامی کے ہاتھ میں تھا اور وہ احمق بالکل نہیں جانتا تھا کہ نفرت کے ریگستان میں بھٹکنے والی پیاسی چڑیا نے محبت کے ایک قطرے کی خاطر اس پر سب کچھ نچھاور کر ڈالا ہے۔ بلگرامی اس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے کے بہانے اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ اور وہ انتہائی گرمی میں بھی یوں کانپ رہی تھی جیسے جاڑا لگ رہا ہو۔ اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے اور وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔ بلگرامی اپنی پامسٹری کے بہت سے حیرت انگیز قصے سناتا رہا۔

ہے۔ ”وہ کچھ پریشان سا ہو کر سنبھل بیٹھا اور غور سے اس کے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھتا Typical آپ کا ہاتھ بڑا“ رہا۔ پھر جب غزل نے بہت اصرار کیا تو کچھ باتیں رک رک کر بتا لیں۔

آپ جن سے اچھائی کی آس لگائے بیٹھی ہیں وہ دراصل بڑا خود غرض ہے۔ آپ کو بچپن سے کوئی خوشی نہیں ملی۔ ”البتہ چند دن بعد آپ کا مستقبل بڑا شان دار ہے۔“

غزل نے بڑی جرأت کے بعد پہلی بار بلگرامی کی طرف دیکھا اور سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ جانے بلگرامی کو خبر بھی ہوئی یا نہیں کہ اسے کیا کیا مل گیا۔

”آپ کا دولہا بڑا خوبصورت ہوگا۔“

یہ سن کر ہاتھ چھڑا لیا اس نے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

لیکن آپ کے دل میں اس کی کوئی قدر نہ ہوگی۔“ بلگرامی نے اداسی سے کہا۔ اور پھر اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

”لا یہ میری فیس جلدی نکالے۔“

عین اسی وقت چغل خور روئے اندر آیا اور ان دونوں کو بڑے تجس بھرے انداز میں دیکھنے لگا۔

”کوئی تک ہے۔ ایک گھنٹہ سے مجھے اور غزالہ سلطانہ کو بلا کر بہان صاحب جانے کہاں رنگ رلیوں میں گم ہیں۔“

بلگرامی نے بگڑ کے روئے سے کہا اور پھر لپک کر جانے والی غزل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میری فیس نکالے جلدی۔“

میرے پاس نہیں ہے۔ ”اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔ سچ مچ وہ پرس تو فیشن کے لیے اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔“

ابا نے اسے آج تک بھی ایک رو پیہ بھی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے پاس رکھتی۔

اچھا تو بعد میں وصول کرلوں گا۔“ وہ اپنا سگریٹ کیس اٹھا کر گنگنانے لگا۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔۔۔ سیکھے ہیں۔۔۔ ارے سکھے ہیں۔۔۔

تقریب... اچھا چل دینے ٹاٹا...

اس رات غزل کو بالکل نیند نہ آئی۔

یوں لگتا جیسے وہ بہت بڑے میلے میں پہنچی گئی ہے۔ چاروں طرف ہوائی جہاز کا شور تھا۔ چرخوں کی گھوٹ گھوٹ۔ کہیں زور کا مینہ پڑ رہا تھا۔ پھر کسی موٹر کا ٹائر پھٹا...

اور اچانک سنائے میں بلگرامی کی گنگناہٹ ابھری۔

دیکھ دل کی زمین لرزتی ہے یا د جانان قدم سنبھال اپنا

اس نے کتنے بار بلگرامی سے یہ خوب صورت غزل اس کی کیف اور آواز میں سنی تھی۔ لوگ اس غزل پر مد ہوش ہو جاتے تھے۔ ہر محفل میں۔ ہر پارٹی میں اس غزل کی فرمائش ہوتی مگر کبھی اس نے یہ نہیں سوچا تھا۔ اتنا مقبول، اتنا مشہور گانے والا اس کے لیے...

اس کے دل میں جانے گھبراہٹ کا طوفان تھایا خوشی کا۔ اور جب اس نے اپنے آنسو پونچھے تو اسے بھان صاحب کی آوارہ گردی پر غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے چاند آپا کو تباہ کیا... چاند آپا بچاری بلدی کی گرہ بنی اکیلے کمرے میں پڑی رہتی ہیں اور بھان صاحب کبھی انہیں پوچھنے نہیں آئے... پھر اسے اپنے دولہا کی ناقدری کرنے پر غصہ آیا... جانے وہ کون ہوگا...؟ کہاں ہوگا۔ ہر کمسن لڑکی کی طرح اس نے بھی اپنے دولہا کی شبیہ میں رنگ نہیں بھرے تھے۔ وہ ایک موبوم سا سایا تھا۔ ایک دھندلی سی تصویر کی طرح ہمیشہ اس کے سامنے بھی رہتا اور کبھی نظر بھی نہیں آتا تھا۔ جب بھی وہ کسی مرد میں کوئی اہم بات دیکھتی تھی تو اسے اپنے دولہا کے تصور میں ٹانک دیتی۔

آخر میں اتنے اچھے آدمی کی قدر کیوں نہیں کروں گی...؟

اس نے پریشان ہو کر سوچا... اجاڑ صورت! ابا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ حماقتیں کرتی ہوں... تو کیا ان حماقتوں کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہو گا؟

جی چاہ رہا تھا اپنے یہ سارے اندیشے سارے دکھ کسی اور کے وجود میں انڈیل دے۔ مگر اس کی کوئی سہیلی بھی نہیں تھی جس کے ساتھ وہ گڑیوں کا بیاہ اور ”ہنڈ کلیا“ کے کھیل کھیل چکی ہو۔ اسے وقت ہی کہاں ملا ان چونچلوں کا۔

ہوش سنبھالتے ہی چاروں طرف سے لعنت اور جوتے پڑتے رہے۔ بچاری چاند آپا اگر اسے اسٹیج پر نہ لائیں تو آج بلگرامی یہ کہتا...

میں تو صرف آپ کی خاطر...

لے دے کے ایک فوز یہ تھی۔ مگر اب رضیہ ممانی اسے غزل کے سائے سے بھی بچاتی تھیں۔ وہ خود بھی بڑی نک چڑھی مغرور لڑکی بن گئی تھی۔ کالج کے تقریری مقابلوں میں حصہ لیتی اور پردے لگی موٹر میں کالج جاتی تھی۔ کیا مجال کہ شاہین کے کسی دوست کے سامنے نکل آئے۔ سارے رشتے ناطوں کے بھائیوں سے بھی اس کا سخت پردہ تھا۔ کیونکہ چاند کے انجام نے رضیہ ممانی کو بڑا محتاط بنا دیا تھا۔

شاہین اب ڈاکٹری پڑھنے علی گڑھ چلا گیا تھا... اور ایاز کو تو اس سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ پڑھنا چھوڑ کر اب اتحاد المسلمین کا بڑا سرگرم رکن بن گیا تھا۔ دن رات ان ہی جھمیلوں میں مصروف رہتا۔ ہمایوں اور غزل دونوں میں سے کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ ایاز کے بارے میں سوچیں۔

پھر اس نے طے کیا کہ صبح بھان صاحب آئیں گے تو ان سے کہے گی اب کے کسی ڈرامے میں وہ بلگرامی کے ساتھ بیروٹن بنے گی۔ مگر بھان صاحب دورے پر گئے ہوئے تھے۔

یہ بات شام کو بلگرامی گھر آیا تو اس نے بتائی۔ وہ اپنی کار میں آیا تھا۔۔۔ اپنے پھیچر سے کمرے میں میلی دری پر بلگرامی کو بٹھاتے ہوئے اسے بڑی شرم آئی۔

اب وہ ضرور سوچے گا کہ غزل کتنی معمولی سی لڑکی ہے۔ کتنی غریب ہے۔ وہ جو اتنی شاندار کار میں گھومتا ہے۔ اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اتنی قابل ماں کا پوت۔

!اللہ وہ کیوں گھر آیا ہے۔۔۔

جب تک ہمایوں لنگی اتار کے دھلا کرتا پاجامہ پہن کر باہر آتا۔ بلگرامی غزل کو کار میں بٹھا کر کار اسٹارٹ کر چکا تھا۔

ہمایوں کو بڑا غصہ آیا۔۔۔ یہی تو فرق ہے بھان صاحب اور ان چھچھورے لونڈوں میں۔۔۔ بھان صاحب نے بھی ہمایوں سے اجازت لئے بغیر غزل کو اپنے ساتھ لے جانے کی جرأت نہیں کی۔ لیکن ہمایوں کو معلوم تھا کہ آج نئے ڈرامے کے اداکاروں کی میٹنگ تھی اور اب تک انہیں وہاں پہنچ جانا تھا۔ شاید اسی لئے جلدی کے مارے بلگرامی نہیں اترا کار سے۔ اس لئے جلدی جلدی کپڑے بدل کر ہمایوں نے اپنی پرانی سائیکل اٹھائی اور پہنچا سوسائٹی کے آفس۔

لیکن وہاں بھان صاحب تنہا بیٹھے کچھ کاغذوں پر دستخط کر رہے تھے۔ ابھی چار نہیں بجے تھے، اس لئے کوئی آرٹسٹ نہیں آیا تھا۔ البتہ در گیا ہارمونیم لئے ایک کونے میں بیٹھار یں رہیں کر رہا تھا۔

دل کو بڑھتی ہوئی اداسی نے

کیا اکیلا سمجھ کر گھیرا ہے

کیا اکیلا --- سمجھ ---

اداسی نے -----

غزل کہاں ہے۔۔۔! ”ہمایوں نے مودبانہ سلام پیش کرنے کے بعد پوچھا۔“

”غزل۔۔۔؟“

”ہاں ابھی بلگرامی صاحب اپنی کار میں لے کر غزل کو آئے ہیں۔“

بلگرامی۔۔۔؟ اپنی کار میں۔۔۔؟ ”بھان صاحب کھڑے ہوئے اور پھر تیورا کر یوں بیٹھ گئے جیسے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ” ہو۔ پھر وہ بے چینی سے ہاتھ پاؤں پٹکنے لگے۔ ان کی خاموشی اور پریشانی دیکھ کر ہمایوں بھی گھبرا گیا۔

بس اب آتے ہی ہوں گے۔“ اس نے بھان صاحب کو تسلی دینا چاہی۔

”نہیں۔۔۔ آپ گھر جائیے۔ وہ وہیں آئیں گے۔“

بھان صاحب کی آواز کسی شدید دکھ سے بیٹھی جارہی تھی۔

سالی۔۔۔ حرام زادی۔ مجھ سے کہے بغیر چلی گئی۔ آج اسے مار ڈالوں گا۔“ ضبط کے باوجود ہمایوں اپنی زبان پر قابو ” نہ پاسکا۔

اسے بلگرامی مارے گا۔۔۔“ بھان صاحب نے شدت غم سے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

”ابا مجھے مار ڈالیں گے۔ ان سے اجازت تو لینے دیجئے۔“

غزل کا ہاتھ پکڑ کے بلگرامی نے اندر کھینچا تو وہ گھبرا گئی۔ پھر جب کا راستارٹ ہو گئی تو بلگرامی نے اسے بڑے غور سے مسکرا کے دیکھا۔

”آج ہم بھی آپ کو بہت ماریں گے۔“

کیوں۔۔۔؟“ وہ اپنے میلے کچیلے کپڑوں کو دوپٹے سے ڈھانپنے لگی اور سچ مچ گھبرا گئی۔

”آپ مجھے چھ مہینے سے ستا رہی ہیں۔“

میں۔۔۔؟“ سچ سچ وہ تعجب کے مارے چونک پڑی۔

اور نہیں تو کون۔۔۔“ بلگرامی اسے تکیے جار ہاتھا۔ بار بار سامنے کسی دوسری سواری کو آتے دیکھ کر اسے ہر یک ”دباننا پڑتا۔

اتنی بے رخی۔۔۔ اتنی لا پرواہی۔۔۔ آپ کو اپنے علاوہ اور نظر نہیں آتا۔۔۔؟“

غزل کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ جیسے کسی نے اسے بے ہوشی کا انجکشن دے دیا ہو۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔ میں نے تو اپنے وجود کی اہمیت بھی محسوس نہیں کی۔ کیا میری نگاہوں کی بھی کوئی نگرانی کر سکتا ہے۔

اچھا اور میری فیس کہاں ہے۔۔۔؟“ اس نے غزل کو گم سم دیکھ کر دوسرا سوال کیا۔

پھر جانے کہاں کی دبی ہوئی ہنسی غزل کے پاس آگئی۔ وہ ہنسنے جارہی تھی۔

چار مینار گزر گیا۔۔۔ پھر معظم جابی مارکیٹ آیا۔۔۔ پان کی ایک دکان پر بہت سے شاعر اور ادیب کھڑے تھے۔ غزل کی ہنسی سے انھوں نے چونک کر ادھر دیکھا تو بلگرامی نے ہاتھ ہلا کر سب کو وش کیا۔

پھر عابد روڈ آ گئی۔۔۔

بھارت کلا منڈل تو ادھر ہے۔۔۔“ اس نے ہنستے ہنستے کہا اور جھک کر ایک بار ات دیکھنے لگی۔ بڑی دھوم دھام کی ”بارات تھی۔ دنیا بھر کا جہیز۔ اللہ تا جہیز کہاں سے آئے گا۔۔۔؟ غزل نے گھبرا کے سوچا۔۔۔ بھیڑ کی وجہ سے بلگرامی کو کار کی رفتار دھیمی کرنی پڑی۔ دولہا گھوڑے پر سوار تھا۔ منہ سپرے سے ڈھانپے۔۔۔ اس کے ہاتھ میں سرخ رومال بندھا ہوا چاقو تھا۔ جس سے وہ بار بار ہجوم کو سلام کر رہا تھا۔

جی چاہتا ہے اس سالے کی لہن چھین لاؤں۔“ بلگرامی کو سچ مچ غصہ آ رہا تھا۔ اسے ہر دولہا پر غصہ آتا۔ اس کی ”دلہن لے بھاگنے کی ترکیبیں سوچا کرتا تھا۔

غزل کو اور ہنسی آئی۔ پھر جب وہ شہر کی آبادی کو کاٹتے ہوئے گول کنڈہ روڈ کی طرف سنسان سڑک پر جارہے تھے تو غزل نے ادھر ادھر دیکھا۔۔۔ شام کی خنک ہوا میں اس کے بالوں کو چھو رہی تھیں۔ بارکس کے فوجی ، ہا کی اور کرکٹ پلے گراؤنڈ کی طرف جا رہے تھے۔ دور کہیں بھاگ مٹی کا محل نظر آ رہا تھا۔ قلعے کے مقابل بنا ہوا پہاڑی محل۔ یہاں بیٹھ کر وہ گاتی تو قلعے میں سوتا ہوا قلی قطب شاہ اٹھ جاتا تھا۔

غزل میں اگر قلعے پر جا کر تمہیں پکاروں تو تم سنو گی۔۔۔؟“ بلگرامی نے بالکل اس پر جھک کر پوچھا۔

ہٹو۔۔۔“ اور پھر غزل نے دل میں کہا تم نہ پکارو گے تب بھی میں تمہاری آواز سنتی رہوں گی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں کسی فلم میں کام کر رہے ہیں۔ بالکل فلمی منظر تھا کہ بیرو اور بیرون کار میں بیٹھے جنگلوں میں سے چلے جارہے ہیں کہ اچانک پٹرول ختم ہو جائے۔ یا پھر ٹائر پھٹ جائے یا پھر بیرو کو راستہ یا دندر ہے۔ مگر بلگرامی ان سارے راستوں پر کئی بار جا چکا تھا۔ اس لئے اس نے عثمان ساگر کے ایک سنسان سے کونے پر کار روک دی۔ اور پھر بالکل اشوک کمار کے انداز میں اسے پکڑ کر نیچے اتارا

اللہ...کتنا پانی۔۔۔ غزل کو یوں لگ رہا تھا یہ پانی بھی اس کے دل میں ہنسی کی طرح بند تھا اور آج نکل نکل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔۔۔ اچھل رہا تھا۔۔۔ جھللا رہا تھا۔۔۔

تہہ بہ تہہ۔۔۔ کبھی پانی اتنا چمکتا ہے۔۔۔ کہیں سنہرا، کہیں رو پہلا۔۔۔ بہتی ہوئی موجوں کو دیکھنے سے اسے چکر سا آگیا۔۔۔ کہیں یہ خواب نہ ہو۔ اس نے گھبرا کے بلگرامی کو تھام لیا اور اس بات پر اسے پھر ہنسی آرہی تھی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔۔۔

اللہ کتنی اچھی جگہ ہے یہ۔۔۔!“ اس نے آسمان کی وسعتوں کو پہلی بار محسوس کیا۔“

پہلے تو کچھ بھی اچھی نہیں تھی۔ آج تمہارے آنے سے اتنی اچھی ہو گئی ہے۔“ بلگرامی اس کے قریب آیا تو اس کے ”منہ سے وہی پٹرول جیسی بدبو آئی جو بھان صاحب کے منہ سے آتی تھی۔ غزل کا اس بد بو سے جی متلاتا تھا اس لئے وہ دور ہٹ گئی۔ بلگرامی کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔

”بھان صاحب ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔“

وہ بڑی اداسی کے ساتھ سگریٹ سلگاتے سلگاتے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

”نفرت۔۔۔؟“ ہنستے ہنستے وہ اچانک رک گئی۔۔۔ ”مجھے آپ سے نفرت کیوں ہوتی۔۔۔؟“

زندگی بھر نفرت کا زہر پینے والی غزل لرز کر رہ گئی نہیں۔ اتنا بڑا عذاب میں کسی کو نہیں دوں گی۔ اپنے کسی شمن کو بھی نہیں۔

اچھا نفرت نہیں ہے تو پھر نکالنے میری فیس۔۔۔“ وہ پھر لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

یہ لو۔۔۔“ اس نے بلگرامی کے خالی ہاتھ پر تھپڑ مارا اور بھاگی چھروں کی طرف۔۔۔

بالکل چھوٹے بچوں کی طرح وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔۔۔ بلگرامی اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔۔۔ اور وہ اونچے نیچے پتھروں پر، خاردار زمین پر بھاگتی پھر رہی تھی۔ پھر اس نے گھبرا کے پانی میں ڈوبے ہوئے کائی لگے پتھروں پر پاؤں ٹیک دیے اور چلوؤں میں پانی بھر بھر کے بلگرامی پر پھینکنے لگی۔۔۔ بس اس کے آگے اور کوئی بچاؤ نہ تھا۔ کیونکہ آگے پانی ہی پانی تھا۔۔۔ شام کے دھندلے سرمئی آسمان کی سرحد، اس پانی سے جاملی تھی۔۔۔ دور تالاب کے آخری سرے پر مچھیرے کا لڑکا پانی میں جال ڈالے بیٹھا تھا۔ اتنے وسیع و عریض منظر میں وہ بالکل ننھا سا دھبہ لگ رہا تھا۔۔۔ اس نے سرخی آمیز سیاہ ہوتی ہوئی شام کی روشنی میں بہت دور دو انسانی سایوں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے دیکھا۔۔۔ اور پھر وہ دونوں جو ایک پتھر کی آڑ میں چھپے تو نکلتے ہی نہ تھے۔۔۔ رات آرہی ہے وہ دونوں سامنے آئیں تو میں جال سمیٹوں۔۔۔ مچھیرے کے لڑکے کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج اس کے جال میں یہی دونوں سائے پھنسے ہیں۔۔۔

رات کو ابا نے اس کے دکھتے ہوئے بدن پر اور چار لائیں رسید کیں تب بھی وہ ہنسے جارہی تھی۔ جیسے آج ابا کی لائیں پھول بن کر اسے لگ رہی ہوں۔۔۔ آج وہ بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ جیسے اس نے بلگرامی کے سارے احسانوں کا بدلہ چکا دیا ہو۔ اس نے اپنے دولہا کی قدر کرنے کا پہلا ثبوت دے دیا۔۔۔ کل بھان صاحب سے کہوں گی کہ وہ پوری بات ابا کو بتادیں۔ اس بات پر تو ابا بھی بہت خوش ہوں گے کہ انہیں اتنا مشہور امیر دامادل گیا۔

بس بہت سہ لٹے سب کے جوتے۔۔۔ اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔۔۔ کل بھان صاحب سے کہوں گی۔ وہ شادی کا انتظام جلدی کروادیں۔ مگر بھان صاحب دوسرے دن بھی نہیں آئے۔ لیکن غزل کو اپنی خوشی میں ان کا انتظار کرنا بھی یاد نہ رہا۔ البتہ بھان صاحب کے ہاں اس کی دو بھاری ساڑیاں پڑی تھیں اور پاؤڈر کاڈ ہے۔۔۔ ممکن ہے بلگرامی آج پھر

چوتھے دن بھی بھان صاحب نہ آئے تو وہ ڈر گئی۔ کہیں روئے نے کچھ لگائی بھائی نہ کی ہو کہ اس دن بلگرامی بھان صاحب کو غزل کے سامنے برا بھلا کہہ رہا تھا اور وہ چپکی بیٹھی سنتی رہی۔ ایک ہفتے بعد بھان صاحب کا ڈرائیور ایک بند لفافہ ہمایوں کو دے گیا جس میں دس دس کے دس نوٹ تھے جو انہیں غزل کو ادا کرنا تھے اور ایک پرچہ تھا کہ مصروفیت کے سبب وہ اب غزل اور ہمایوں کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے وہ خود اب ان کے یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔

غزل کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ ہمایوں تو خیر صرف گھبرا گیا۔ مگر وہ رونے لگی۔ بھان صاحب کی عنایتیں یاد آنے لگیں۔ اب ہمایوں کی ترقی کا کیا ہوگا؟ ”الف لیلہ“ کا حصہ کیسے ملے گا؟ قرض کیسے ادا ہوگا؟ اس کا ذلت کے مارے وہی حال ہوا جیسے آج پھر چاند آپا نے ہاتھ پکڑ کے اسے کمرے سے باہر پٹک دیا ہو۔ اگر بھان صاحب سامنے ہوتے تو وہ کسی دیوار سے سر ٹکرا کے مر جاتی۔ اسے شدید اذیت سے تو چھٹکارا مل جاتا۔

پھر وہ انتظار کرنے لگی کہ بلگرامی آئے تو اس کے ساتھ جا کر بھان ماما سے معافی مانگ لے گی۔

ہمایوں نے بھی بھان صاحب کے خط کو لا پرواہی سے پلنگ پر پھینک دیا۔ کیوں کہ اونچی سوسائٹی کو دیکھنے کے بعد یہ حقیقت اس پر عیاں ہو چکی تھی کہ غزل جیسی خوبصورت لڑکیوں کا بھاؤ بہت بڑھا ہوا تھا اور بھان صاحب جیسے احمق گلی گلی مل جاتے ہیں اب وہ لوگوں کے سامنے اپنا بہت اونچا معیار پیش کرتا تھا۔ مسکین علی شاہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس نے صرف دس پانچ ہندوستانی فلمیں دیکھی تھیں۔ اس نے کبھی اخبار کی خبروں کو اہمیت دی اور نہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر غور کیا تھا۔ ”الف لیلہ“ سے نکلنے کے بعد دن بھر وہ آفس کی فائلوں میں سرکھپاتا تھا۔ اس لئے جب پارٹیوں میں لوگ ہندوستان کے تشوش ناک سیاسی حالات پر بحث کرتے ، مارلن منزو کی ٹانگوں اور پکاسو کے آرٹ پر باتیں ہوتیں تو ہمایوں کرسی پیچھے کی طرف سرکا کے سگریٹ کے سٹے پر سٹے لگائے جاتا۔ پہلے پہل تو یہ ہوا کہ ہمایوں کو کوئی گھاس ہی نہ ڈالتا۔ غزل چاند اور بھان صاحب کے ساتھ پارٹی میں چلی جاتی اور وہ چیراسیوں اور بیرالوگوں کے ساتھ باہر لان میں ٹہلتا تھا۔ کیوں کہ وہ غزل کو کہیں تنہا بھیجنے پر تیار نہ ہوتا تھا اور اندر کے لوگوں میں فٹ نہ ہوتا۔ پھر کبھی بھان صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ کسی سے تعارف کرا دیتے۔

”آپ غزل بی بی کے فادر ہیں ہمایوں علی شاہ صاحب۔“

اور قادر۔۔۔ ایک آرٹسٹ کے والد ہونے کے ناطے فوراً اپنی معلومات کا اظہار شروع کر دیتے تھے۔ اچھے آرٹسٹوں کی کمیابی کا رونا۔۔۔ ایکٹنگ کی خصوصیات اور اسٹیج کی ضروریات کے بارے میں وہ تمام سنی سنائی باتیں جو ان کے کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ اس وقت یوں لگتا تھا جیسے مسکین علی شاہ کے خاندان میں پیری مریدی کی بجائے اسٹیج ڈرامے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔

لہذا ہمایوں نے سوچا کہ اس گنجے بڑھے کے چنگل سے غزل کو نکال لینا چاہیئے۔ بلگرامی بھی برا نہیں ہے۔ بنجارہ بلز کے اونچے لوگوں میں تو اس کی پہنچ ہے۔ غزل کہیں سے کہیں پہنچی جائے گی۔ بس پھر کیا تھا۔۔۔ دھوپ ابھی آنگن سے اوپر بھی نہ جاتی تھی کہ بلگرامی کا بارن دروازے پر اسی کی طرح بے قراری سے پکارنے لگتا۔۔۔ غزل گرم چائے کی پیالی پٹک دیتی۔ کبھی دوپٹہ اوڑھنا بھول جاتی کبھی چوٹی باندھنا۔۔۔ مچھیرے کا چھوٹا سا لڑکا پانی میں جال پھیلانے روز دور ادھر آخری سرے پر دو سایوں کو دیکھتا جو پتھروں کے پیچھے جانے کہاں کم ہو جاتے ہیں۔

وہ روز ان کا انتظار کرتے کرتے تھکا جا رہا تھا۔۔۔ بلگرامی کی طرح جو روز ایک ہی راستے پر چلتے چلتے اب بور ہونے لگا۔۔۔ مگر غزل تو اسے ہوا کی طرح چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ اتنی معصوم لڑکی۔۔۔ اتنی خوبصورت کہ بلگرامی یہ سوچتے ہوئے ڈرنے لگا تھا کہ اس لڑکی کو کوئی کیسے دھوکہ دے گا ان ہی دنوں مسٹر چڈھا حیدر آباد آئے۔ وہ یہاں فلموں کے لیے نئے چہرے تلاش کرنے آئے تھے۔ ان کے لیٹر پیڈ پر ”ملی بھگت پروڈکشن“ کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کمپنی کے پروڈیوسر، ڈائرکٹر اور اسٹوری رائٹر وہ خود تھے۔ صرف میوزک ڈائریکٹر کا نام پیڈ پر نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے حیدر آباد کی مختلف موسیقی کی محفلوں میں اپنی موسیقی کا وہ رعب جمایا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی اہمیت کے حیرت انگیز واقعات سنائے۔۔۔ مثلاً معمولی سے ”پیٹی ماسٹر“ نوشاد کی ساری مقبول دھنیں دراصل ان ہی کی بنائی ہوئی تھیں۔ برمن ان ہی کا شاگرد ہے اور لتائے کنٹریکٹس حاصل کرنے کے لئے ان کے گھر کے چکر لگایا کرتی ہے۔

اپنے بزنس کے سلسلے میں ہر گھڑی وہ کہیں نہ کہیں ٹرنک کال کرتے تھے۔ ان کی نوٹ بک میں دن رات کے ایک ایک لمحے کا پروگرام لکھا ہوا تھا۔

تو ان مسٹر چڈھا کو اپنی نئی فلم کے لئے ہیرو اور ہیروئن کی ضرورت تھی۔ مدر اس دہلی اور کلکتے میں وہ ہزاروں لڑکیوں کو ریجکٹ کر آئے تھے۔

لیکن بلگرامی نے انہیں آتے ہی یوں ہاتھوں ہاتھ لیا کہ سب منہ دیکھتے رہ گئے۔ بھان صاحب تو بہت ہی جلے۔ سنا تھا کہ اب بھان صاحب نے بھارت کلا منڈل آنا جانا چھوڑ دیا تھا اور ایک انجینئر کی لڑکی کو کھانا پکانے کا آرٹ سکھانے میں مشغول تھے۔

بلگرامی کی دیکھا دیکھی شہر کے اور بھی بہت سے معزز حضرات کلچرل انجمنوں اور آرٹسٹوں نے مسٹر چڈھا کو دعوتیں دیں، انہیں ایک سے ایک پری جمال چہرے دکھائے گئے۔ اس طرح چڈھا کے لئے ہیروئن کا انتخاب اور بھی مشکل ہو گیا۔ آئے تو تھے دو دن کے لئے مگر دو ہفتے گزر گئے اور لوگ انہیں ہلنے ہی نہ دیتے تھے۔

آخر انہوں نے بلگرامی کو ہیرو کے لئے انتخاب کر لیا۔ معاہدے کی بنا پر اس کی گیارہ سو روپے تنخواہ مقرر ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کی اداکاری کے جملہ حقوق ”ملی بھگت پروڈکشن“ کے لئے محفوظ ہو گئے اور اس خوشی میں جب بلگرامی نے سکندر آباد کے ایک ہوٹل میں پارٹی دی تو غزل گھر میں پڑی زار زار رو رہی تھی اس نے چڈھا کی نظروں میں چڑھنے کی ہزار کوشش کی مگر وہ تو بلگرامی کی ایک سابقہ ایرانی نژاد محبوبہ جمال پر ریجھا ہوا تھا اور بلگرامی کو اپنے ساتھ لئے جا رہا تھا۔ بلگرامی تو چونٹیوں بھرا کباب نکلا۔ ہر خوبصورت عورت اس کی طرف یوں بڑھتی تھی جیسے اپنے قابو میں نہ رہی ہو۔ ایک بار روئے نے غزل کو بتایا کہ بنجارہ ہلز پر جتنے شوہر اپنی بیویوں کو طلاق دیتے ہیں ان میں نوے فی صد عورتیں بلگرامی کی محبوبائیں ہیں۔ کتنی بار غزل اس کے ساتھ ہوتی اور وہ کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر بیقرار ہوا کرتا تھا۔ بعد میں وہ غزل کے سامنے صفائی پیش کرتا کہ خوبصورت عورتوں کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ ویسے اس کی نیت بخیر ہے۔ غزل صبر کرتی۔ صبر کیا کرتی۔ خود بلگرامی نے ہی جو پیشن گوئی تھی کہ اس کا خوبصورت دولہا اس کی قدر نہ کر سکے گا۔ سو وہ قسمت کا لکھا بھگت رہی تھی کہ ایک آدھ مہینے میں شادی ہو جائے تب وہ ممانی بیگم کی طرح اس پر دھونس جمایا کرے گی۔۔۔ اور آج بلگرامی بمبئی جا رہا تھا۔ یوں بھی شادی کی بات پر وہ کوئی دھیان نہ دیتا تھا۔ کبھی کہتا میری ممی بڑی سخت مزاج میں انہیں منانے میں دیر لگے گی، کبھی سنا تا کہ مجھے ایکٹر بنے دوور نہ بابا خرچ دینا بند کر دیں گے تو کیا ہوگا؟

دوسرے دن بلگرامی روڑا ہوا آیا اور یہ خبر سنائی کہ چڈھانے غزل کو ہیروئن کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ دراصل اس نے اسی وقت کیا تھا جب پہلی بار اس ہرنی کی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا۔

ہمایوں کی باجھیں کھل اٹھیں اور غزل خوشی کے مارے ہنسنا بھی بھول گئی لیکن بلگرامی کو یہ بات زیادہ اچھی نہیں لگی۔ کیوں کہ چڈھا ہر لڑکی سے یہی کہہ رہا تھا کہ اسی کا انتخاب ہوگا اور سب کو اپنے ساتھ بمبئی لیے جا رہا تھا۔

وہ کہتا تھا کہ ان میں سے ہر لڑکی کو وہ کسی نہ کسی ڈائریکٹر کے سپرد کر دے گا۔۔۔

اس لئے بلگرامی کہتا تھا کہ چڈھا کے ساتھ وہ فی الحال اکیلا جائے گا اور غزل کو بعد میں بلوائے گا۔۔۔ اس دن پہلی بار غزل بلگرامی سے خوب لڑی بالکل بیویوں کے انداز میں۔ جیسے ابھی گھڑی بھر بعد من جائے گی۔ اور اس نے بلگرامی کی پروا کیے بغیر معاہدے پر دستخط کر دیے جس کے لئے ایک ہزار روپے کی ضرورت پڑی۔ کیوں کہ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے یہ ڈیپازٹ رکھوانا ضروری تھا۔ ممکن ہے ہمایوں یہاں پر ہمت ہار جاتا۔ لیکن اس نے بتول سے چھین کر جو زیور سایا کو پہنا دیے تھے وہ آج کام آئے۔

چڈھا اتنا دلچسپ آدمی تھا کہ جتنی دیر بیٹھتا، سب اس کی باتیں سنتے، اسی کے دماغ سے سوچتے تھے۔ اتنا با اخلاق کہ اس نے چند ملاقاتوں میں ہمایوں کو بھی اپنی قابلیت اور اہمیت کا قائل کر دیا۔ اس نے بڑی تفصیل سے غزل کی صلاحیتوں پر بحث کی۔ کیوں کہ وہ ابھی بہت کم عمر ہے اس لئے چڈھا کو کوئی مہینے اسے ٹریننگ دینا ہوگی۔

لیکن مین روانگی کے دن بلگرامی سے چڈھا کا کسی بات پر سخت جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور بلگرامی نے اس کے ساتھ بمبئی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر لا کہ دوڑ دھوپ کرنے کے باوجود غزل اور ہمایوں کے کرایے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ اس لئے چڈھا باقی لڑکیوں کو سمیٹ کر روانہ ہوا کہ غزل بھی بہت جلد بمبئی پہنچ جائے گی۔ غزل کے جانے کی خبر سے حیدر آباد آرٹ سوسائٹی اور بھارت کلامنٹل میں صف ماتم بچہ گئی۔ سنا ہے بھان صاحب بھی، جواب غزل کے ہر معاملے سے دست بردار ہو چکے تھے، اس خبر سے نہایت آزرده ہوئے۔ اس کے باوجود غزل کے تمام چاہنے والوں کی طرف سے ایک شاندار الوداعی پارٹی دی گئی اور عین اسی وقت کسی نے اخبار میں یہ خبر پڑھ کر سنائی کہ بنگال کا ایک مشہور دھوکہ باز حیدر آباد سے بمبئی جاتے وقت پلین میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ لڑکیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔

لیجیے۔۔۔ جتنی تیزی سے یہ آندھی اٹھی تھی۔ اتنی ہی تیزی سے بیٹھ گئی۔۔۔ ساتھ میں بلگرامی اور حیدر آباد آرٹ سوسائٹی کو بھی لے اڑی۔

بلگرامی نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ غزل نے اس کی مرضی کے خلاف معاہدے پر دستخط کئے تھے۔۔۔ لہذا وہ کسی اور طرف مڑ گیا۔

ادھر بلگرامی گیا اور ادھر ہمایوں نے پھر جو تا سنبھال لیا۔ بس پھر کیا تھا۔۔۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ غزل کی ٹھکانی کرنے کے سوا ہمایوں کی اور کوئی مصروفیت ہی نہ رہی تھی۔ صبر کا ایسا ہر غزل نے پہلے کبھی نہیں پایا تھا۔

اس کا دماغ کسی دھماکے سے پاش پاش ہو چکا تھا۔ ہمایوں کی لعنت و ملامت اب جانے کس پر پڑتی تھی۔ وہ تو چپ چاپ بیٹھی خلا میں گھورے جاتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا کیسا خوبصورت پروگرام بنایا تھا۔ جب وہ بلگرامی کی دلہن بن کر بنجارہ ہلز کی عورتوں کو انگاروں پر سلا دے گی۔ جب وہ بلگرامی کے جیسے سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے بچوں میں گھر کے ڈرامے اور اداکاری سب کچھ بھول جائے گی۔

دن بھر ممانی بیگم کی طرح مسہری پر بیٹھا کرے گی۔ بچوں کی خاطر بلگرامی سے لڑائیاں ہوا کریں گی۔ کیوں کہ وہ ابا کی طرح بات بات پر بچوں کو پیا کریگا۔۔۔ غزل کانپ اٹھتی۔ اپنی روح کے سارے گھاؤ یاد آ جاتے اور وہ گھبرا کے بلگرامی کو پکارنے لگتی۔ بچوں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھانے کا پکا وعدہ لیتی اس نے جب بھی اپنے آپ کو ایک شادی شدہ عورت کے روپ میں دیکھا تو رضیہ ممانی سامنے آ جاتی تھیں۔۔۔ ساس کی آنکھوں کا تارہ۔۔۔ خسر کی راج دلاری ہو۔۔۔ جب دیکھو راشد ماموں سے چہلنہور رہی ہیں۔ بجے گھڑی گھڑی آکر ان سے لیٹ جاتے تھے۔

پھر ایک دن وہ بھی تھک ہار کے بی بی کی طرح قالین بچھے ہوئے تخت پر لیٹ جائے گی اور بلگرامی پنشن لے کر نانا حضت کی طرح گاجر کا مربہ بنایا کرے گا۔ اس کی بلا سے وہ مربے میں کشمش ڈالے یا کھو پرا۔۔۔ وہ تو بی بی کی طرح ہر بات سے بے نیاز پڑی رہے گی۔

اگر اس نے بلگرامی کے ساتھ شادی کے خواب نہ دیکھے ہوتے تو بھان صاحب کی طرح اسے بھی بھول جاتی۔ مگر اب تو باقاعدہ رنڈا ہے کا سوگ منانے کے لئے اس نے دنیا تیاگنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کیوں کہ آج۔۔۔ صرف چودہ برس کی عمر میں اس کا سہاگ اجر گیا تھا۔

آئینے میں بڑے غور سے اس نے اپنی صورت دیکھی۔۔۔ رونے کی وجہ سے گال سرخ انگارہ بن گئے تھے۔ بال چڑیلوں کی طرح بکھرے ہوئے۔۔۔ غزل کو ایسا لگا جیسے اس کے دانت بھی ٹوٹ گئے ہیں اور بال سفید ہو چکے ہیں۔ بیواؤں کی صورت تو ایسی ہی ہوتی ہے۔۔۔ پھر اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں بج اٹھیں۔۔۔ اس نے پتھر سے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں اور بڑی دیر تک ڈھونڈنے کے بعد اماں کے صندوق میں ایک سفید ساری اور سیاہ بلا وزمل گیا۔

اس روپ میں جب اس نے آئینہ دیکھا تو رو پڑی۔۔۔ بائے اللہ۔۔۔ کوئی بے درد اسے پرسہ دینے بھی تو نہ آیا۔۔۔ اس پر بنسنے والے سب کہاں چلے گئے۔۔۔ اماں۔۔۔ اماں ہوتیں تو اس کے غم پر چھاتی پیٹ لیتیں۔ صرف چودہ برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی۔۔۔

نہ جانے اس کے رونے میں کتنا درد تھا کہ سایا اندر آئی اور اسے گلے سے لگا کر سمجھانے لگی۔

”رو رو کر مر جائے گی کیا۔ تیرا ابا تو ہمیشہ ہی مارا کرتا ہے۔“

سایا کے محبت بھرے الفاظ نے اس کے سلگتے ہوئے سینے پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ وہ جانے کب تک سایا کے سینے سے لگی بیٹھی رہی۔ جانے کب اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے اور وہ لاش کی طرح پلنگ سے نیچے لڑھک گئی۔۔۔

بی بی کے یہاں خبر پہنچی تو واحد حسین گھبرائے ہوئے آئے۔

انہیں غزل سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔۔۔ مگر اس کو مرتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکے۔ ڈاکٹر آیا۔۔۔ سایا نے دوا پلائی۔ وہ ہوش میں آئی۔۔۔ تو بی بی اور فوزا سے دیکھنے آئیں۔

دنیا منہ موڑے مگر بی بی کے تو پیٹ کی آگ تھی۔ مری بیٹی کی نشانی۔ ان کی دونوں بیٹیاں ایک ایک سانپ جن کر ان کے لیے چھوڑ مری تھیں۔ غزل کو انہوں نے یوں دیکھا جیسے پہلی بار قبر پر پھول چڑھانے آئی ہوں۔

فوزیہ جتنی دیر بیٹھی رہی بات بات پر قہقہے لگاتی رہی۔

اس کی خوبصورت آنکھیں ، صحت مند جسم اور بے چین ہاتھ ہنسی کے مارے کھلے جارہے تھے۔ جیسے وہ رونا ہی نہ جانتی ہو۔

بی بی اس گھڑی کو کوسنے لگیں جب یہ سبز قدم داماد ان کے گھر میں آیا تھا۔ اللہ جانے کس رنڈی کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا کہ بیٹی کی کمانی کھاتا تھا۔ اس دن بی بی اور ہمایوں میں پھر ایک زبردست معرکہ ہوا۔ بی بی نے اسے بیٹی کی کمانی کھانے کے طعنے دیے اور اس نے بیٹی کے جہیز میں دھوکہ دینے کا الزام لگایا۔ اور پھر واحد حسین اور احمد حسین کی عیاشیوں کے بکھان کیے کہ ”ایوان غزل“ میں جتنے شاعر گزرے سب رنڈیوں کی اولاد تھے جنہوں نے سوائے عشق بازی کے دوسرا کوئی کام نہیں کیا۔

اس تو تو میں میں کے بعد غزل کے لیے پھر ”ایوان غزل“ کے دروازے کھل گئے۔ کیوں کہ اس وقت وہ نانی سے لپٹ کر خوب روئی اور بعد میں لنگڑی پھوپو اور ممانی بیگم کے سامنے رو رو کر اپنی مظلومی کی کہانی سنائی کہ سارا قصور ابا کا ہے جو زبردستی اسے ہر جگہ بھیجا کرتے تھے۔ پھر اس نے بلگرامی کا قصہ سنایا۔ جس پر لنگڑی پھوپو نے اس کے ایک دھمو کا رسید کر کے چپ کرایا اور ممانی بیگم نے رو رو کر بی بی سے کہا۔

”بی بی خدا کے لیے غزل کی زبان بند کروائیے۔ ابھی فوزیہ کو اٹھانا ہے۔“

اور اس دن سے بی بی کی ہدایت پر نہ صرف وہ ان قصوں کو زبان پر نہ لائی بلکہ بھول جانے کی بھی کوشش کرتی رہی۔

پھر جب بعد میں فوزیہ نے میٹرک پاس کیا تو بی بی کے ہاں بڑی شاندار دعوت ہوئی۔ غزل تو بلگرامی کے سوگ میں پڑی تھی۔ مگر لوگوں کو یہ بات تھوڑی بنانا تھی۔

مجبوراً اس نے ایک سادہ ساری پہنی۔ اور لٹٹورے ہاتھ کان لئے چلی گئی۔ بہت سی عورتوں کے ہجوم میں اسے وحشت ہوتی تھی۔ چیخ پکار، لڑائیاں فضحتے اور ایک دوسرے سے جلنے کا انداز۔۔۔ وہ مردوں کی محفلوں کا خلوص اور خوش دلی یہاں بالکل نہ ملتی۔ وہاں غزل کیسے ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔۔۔ لیکن شادی بیاہ کی محفلوں میں عورتیں اسے یوں دیکھتی تھیں جیسے وہ بھی نمائش میں رکھے ہوئے بچے کی طرح دس سر اور بارہ ہاتھ لے کر پیدا ہوئی ہے۔

چاند آیا دو مہینے تک اننت گیری سینی ٹوریم میں رہ کر آئی تھیں۔ مگر انہوں نے ابھی تک سنجیوا کا انتظار نہیں چھوڑا تھا۔ غزل سوچتی کہ ایسے ایسے خوبصورت مردوں کو نظر انداز کر دینے والی چاند آپانے کیسے سنجیوا کے لیے خود کو مٹادیا۔

یہ کون سا جذبہ ہوتا ہے۔۔۔؟

غزل کو بھی بھان ماما اچھے لگتے تھے۔ بلگرامی کو اس نے اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ اس کے باوجود بلگرامی کی یاد اس کے سینے میں کبھی دھو کے نہ لگاتی تھی۔ بلکہ اب تو اس کا جی چاہتا تھا کہ بلگرامی آئے تو اس کے منہ پر تھوک دے۔

ابھی مہمان آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔۔۔ چاند آیا اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹی کوئی انگریزی ناول پڑھ رہی تھیں۔ ان کی صورت کتنی بدل گئی تھی، وہ چھوٹے سے تنگ بلاوز جن کے اندر سے ان کا سینہ ا بلا پڑتا تھا اور گولائی غضب ڈھاتی تھی، اب ان کی سوکھی بابوں میں لٹک رہا تھا وہ اپنے حسن کا ایک واہمہ سا بن کر رہ گئی تھیں۔ سوکھے خشک بالوں کی ایک مری چو بیا جیسی چوٹی لٹک رہی تھی۔ گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اور سنہری سیب جیسی رنگت زرد ہو چکی تھی۔

آئے والی بیبیاں سخت تعجب سے بھی چاند کا بے میک اپ والا بد رونق چہرا دیکھتیں۔ کبھی رنگ اور شادابی میں ڈوبی ہوئی غزل کو دیکھ کر ساتھ والی کے کان میں جھک جاتیں۔

”اجی پاں کا تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔“

”ایوان غزل“ میں ہمیشہ ایسے ہی کھیل کھیلے گئے۔

”اتنی کمائی آتی ہے۔ جبھی تو ایسی شاندار دعوتیں ہوتی ہیں۔“

چاند آیا تو تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئی تھیں۔ اس لئے انہوں نے کچھ نہ سنا۔ مگر غزل کو تو بہت سے کاموں کے لیے ادھر ادھر آنا جانا پڑا۔

بیبیاں بڑے اشتیاق سے اسے پاس بلا کر دیکھتیں۔

”یہ ہے مسکین علی شاہ کی پوتی۔۔۔ غزل۔۔۔؟“

”ہاں یہی ہیں مشہور اسٹیج اداکارہ بی بی غزالہ۔“

”اب تو شاید مس غزالہ ہو گئی ہیں۔“

ممکن ہے مسز غزالہ بھی ہوں۔۔۔“ پھر سب ہنسنے لگے۔

”اجی بی بی یہ ہاتھ ، کان ننگے کر کے کیوں آئے ہیں آپ۔“

”یہ بھی کوئی فیشن نکلا ہے کیا۔؟“

”تو کیا شریف بیبیوں میں بھی منہ پر چونا لگا کر مٹکنے کا ارادہ ہے۔؟“

غزل کا جی چاہا کہ وہ بھی چاند آپا کی طرح ٹی۔ بی کے سارے اسٹیج ایک جست میں پار کر جائے۔ چہت گر پڑے یا قیامت آجائے۔ مگر کچھ نہ ہوا۔

اکتا کر وہ خود بھاگی چاند آپا کی پناہ میں۔۔۔ جی چاہا ان سے لپٹ کر خوب روئے۔ جیسے سارے خاندان کے جنازے سامنے رکھے ہوں۔

آج بہت دنوں بعد پہلی بار چاند آپا نے اس سے باتیں کیں۔ بھارت کلا منڈل کا حال پوچھتی رہیں۔۔۔ غزل نے ان سے کچھ نہ چھپایا۔ بہان صاحب کی دست درازیوں سے لے کر بلگرامی کی بے وفائی تک سب حال سنا ڈالا

”جی چاہتا ہے چاند آپا بلگرامی مل جائے تو اس کی بوٹیاں کر ڈالوں۔“

اس نے بے حد غصہ میں کہا۔

ہوں۔۔۔“ چاند آپا نے کسی گہری سوچ میں ڈوب کر کہا۔“

”یہ اچھا ہوا کہ تم نے بلگرامی کے حوالے صرف اپنا بدن ہی کیا تھا۔۔۔ اور کچھ نہ دیا۔۔۔“

غزل کی سمجھ میں خاک نہ آیا وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

ور نہ میری طرح دو ہری آگ میں جلتیں۔۔۔“ وہ کہے گئیں۔“

”میں نے کتنی بار التجائیں کیں۔ مگر اس نے مجھے کبھی نہ چھوا۔۔۔ اور پھر بھی وہ میرا سب کچھ لے گیا۔۔۔“

کیا سچ مچ۔۔۔؟“ غزل سخت حیران تھی کہ کوئی ایسا بھی مرد ہوسکتا ہے جو چاند آپا جیسی خوبصورت عورت کو ”
! چھوئے بغیر چلا گیا

”ہاں۔۔۔ جانے وہ کیسا تھا۔ اسے مجھ پر بھروسہ ہی نہ تھا۔۔۔“

آج الٹی بات ہوئی۔ چاند آپا خشک آنکھیں لئے بیٹھی تھیں اور غزل سسک سسک کر رو رہی تھی۔

چاند آپا سمجھیں وہ اپنی محرومیوں پر رو رہی ہے۔

برس میں موت کے کنارے کھڑی ہوں۔ لیکن غزل تو بھی خود چلنا چھوڑ دے۔ اپنی تقدیر ۲۶ میں تو صرف چھبیس ”
خود بنانے کا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا۔ اس لئے اپنی باگیں بی بی کے ہاتھ میں تھما دے۔ ورنہ راشد ماموں اور خالو پاشا
”تجھ سے اپنی کامیابیوں کے قفل کھولیں گے۔ اور تجھے پھینک دیں گے۔

غزل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔۔۔ وہ چاند کے کانپتے ہوئے لب دیکھتی رہی۔۔۔ ان کا چہرا سفید کپڑے کی طرح شکن
آلودہ ہو گیا تھا اور بڑی بڑی سنہری آنکھیں سیاہ حلقوں میں یوں چپکتی تھیں جیسے ڈوب رہی ہوں۔

گھر آ کر غزل نے پہلا کام یہ کیا کہ بلگرامی کا سوگ جھٹک کر رنگین سلک کا جوڑا پہن لیے۔

بی بی کے ہاں بڑا ہنگامہ مچ رہا تھا۔۔۔ چاند اور غزل کا حشر دیکھنے کے بعد رضیہ اور

بی بی کے لیے فوزیہ سینے کا پتھر بن گئی تھی اور وہ کسی طرح جلدی سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔۔۔ جب دیکھو رضیہ راشد اور واحد حسین بیٹھے کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ ایک تو فضا بہت خراب ہو رہی تھی۔ سنا ہے رضا کاروں سے انڈین یونین کی فوجوں کی جھڑپیں ہونے لگی تھیں۔

اور قاسم رضوی نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ میدان میں لڑنے کو تیار ہیں۔ اعلیٰ حضرت اتحاد المسلمین کی طاقت سے گھبرا کر کوئی معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ ادھر تو راشد کو باہر کی ہزار پریشانیاں لگی تھی اور ادھر لڑکوں کے پیغاموں والے سرخ لفافے ادھر سے ادھر سر کائے جاتے تھے۔ اور پھر ایک دن فوزیہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ سنا تھا کہ لڑکا لندن سے ڈاکٹری کی ڈگری لے کر بس ابھی ابھی پلین سے اترتا تھا۔۔۔ اور پھر باپ کی خاندانی جائداد تھی۔ بہت بڑے لوگ تھے۔ صرف پچاس ہزار جوڑے گھوڑے اور ایک مکان اور چالیس تولے سونے پر بات پکی ہو گئی تھی۔

رضیہ اور راشد بیٹھے خود ہی اپنی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔

منگنی کی رسم کے لیے لنگڑی پھوپو نے کوئی سو خط رشتے داروں کو لکھوائے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو اس خاندان کی لڑکیوں پر نام دھرتے تھے۔ اب اسی خاندان کی ایک ساوتری کیسی اونچی جگہ بیابی جاری تھی۔ لنگڑی پھوپو یہ اعلان کرنا چاہتی تھیں۔

واحد حسین نے اپنی شاعری چھوڑ چھاڑ ان خطوں کو لکھتے اور پھر وہ گھر کی پوری مجلس مشاورت میں پڑھ کر سنایا جاتا۔ پھر مجلس خود ہی فیصلہ کرتی کہ کون سا جملہ کسی رشتے دار کے لیے غیر ضروری تھا۔ کس طرح خطاب کرنا چاہیے۔ محبت اور دعوت کا اظہار کس انداز میں ہو۔

لنگڑی پھوپو چاہتی تھیں کہ اس موقع پر اجالا بیگم بھی احمد حسین اور نصیر کے ساتھ آجائیں تا کہ نصیر کی پیدائش سے جو دوری چلی آ رہی ہے۔ وہ اب ختم ہو جائے۔ سنا تھا کہ وہ حرامی لونڈا تو اب بی۔اے پاس جوان مرد بن چکا تھا۔ لیکن اجالا بیگم نے قسم کھائی تھی کہ وہ ”ایوان غزل“ کی چوکھٹ نہیں الا نگھے گا کیوں کہ وہاں اس کے دشمن بستے تھے۔ یہ بات پر سے کو ابن کر جب واحد حسین کے کانوں تک آئی تو بس انہوں نے بھی طے کر لیا کہ احمد حسین کے یہاں نہیں جائیں گے۔ اب صرف بیماری اور موت اور کسی خوشی کے موقع پر رسمی خط و کتابت باقی تھی۔ لیکن لنگڑی پھوپو پورتنی رتی کی خبر رکھتی تھیں کہ احمد حسین نے نصیر کو بھی حکومت کرنے کے سب داؤں بیچ سکھا دیئے ہیں اور اجالا بیگم نے اس کے لیے بہت ہی چھو کر یاں پالی تھیں۔ ان چھوکرہوں کی فوج کے بیچ وہ سائنڈ بنا شعر کہتا تھا۔ اجالا بیگم نے اسے خاص طور پر شاعری کا شوق دلایا تھا تا کہ وہ اپنے خاندان کا فرد لگے اور راشد کی طرح خاندانی روایتوں کو توڑ کر حرامی نہ کہلائے۔

اور جب یہ خط اور نگ آباد گیا تو اجالا بیگم نے جانے کون سے منصوبہ کے تحت نصیر کو بھیج دیا۔

اب فوزیہ کی رسم میں کوئی اور رشتے دار آئے یا نہ آئے لیکن سارا گھر نصیر کی خاطر تواضع میں لگ گیا۔ کیوں کہ وہ پہلی بارتا یا ابا سے ملنے اپنے خاندانی گھر میں آیا تھا۔

رضیہ کا بس چلتا تو اس کا گلا گھونٹ کر پھینک دیتیں لیکن ظاہری طور پر بڑی لٹو پتو کرنا پڑی۔ اسی لیے جب ہمایوں نے غزل کو گھر بلوایا تو بی بی نے منع کروادیا۔

”اتنا کام کاج کیسے ہوگا۔ کم سے کم غزل ہی گھر میں رہے۔“

دماغ میں کوئی روشنی دھک سے کوند گئی اور پھیلنے لگی۔ پھر سرخ رنگ کا ایک دریا سا پھوٹ بہا۔

اس کے خم کھانے ہوئے شاداب ہونٹوں کو ایک جگہ قرار ہی نہ تھا۔ بیک گراؤنڈ میں پاؤڈر لگے ہوئے چہرے کی دل آویزی اور اس کے پیچھے سیاہ بالوں کی پہاڑیاں۔۔۔ جن کے نیچے سنہرے موتیوں کے ٹاپس جھرنوں کی طرح روشنی کی دھاریاں ٹپکار رہے تھے اور آنکھیں۔۔۔ آنکھیں۔۔۔ وحشی غزالی آنکھیں۔ جادو بھری معصوم۔۔۔ بے رحم اور لا پرواہ آنکھیں۔ صرف آنکھیں ہی نصیر کے تصور میں نہ آتی تھیں۔۔۔ وہ بے حد خوبصورت تو نہ تھی۔۔۔ مگر اس کے بادامی رنگ میں کشش تھی یا تنی ہوئی بھوؤں میں۔۔۔ آنکھیں تو کٹے ہوئے چاند کی طرح نیم وا رہتی تھیں۔ ابھرے ہوئے پیوٹوں تلے دبی دبی۔۔۔ پہلی نظر میں یوں لگتا جیسے وہ آنسو پونچھ کر آئی ہو۔ مگر اس کے مسکراتے ہوئے لبوں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں کو جھوٹا ٹھہرایا۔

اندر کمرے میں چینی کے برتن سے ٹوٹ رہے تھے۔

قالین پر بیٹھی وہ سب جانے کن کن باتوں پر ہنس رہی تھیں۔ غالباً وہی موضوع سخن ہوگا۔۔۔؟

جس دن وہ یہاں آیا تھا تو شاہین نے خبر دار کر دیا تھا کہ شہر کی سڑکوں پر سائیکل مت چلانا۔۔۔ اور غزل سے دوستی مت بڑھانا۔ کیونکہ سڑک پر سیکل چلانے اور غزل سے دوستی بڑھانے کے چند حدود ہیں۔۔۔ اور دونوں کو نہ جاننے کی صورت میں جان کی خیر نہیں۔

نصیر بھائی تو راشد کا تھا۔۔۔ لیکن وہ ایک ہی دن میں نہ صرف شاہین کا بھائی بن گیا بلکہ دونوں مینے حد دوستی بھی ہوگئی۔۔۔ نوک جھونک۔۔۔ اور نوجوان لڑکوں کے پر اسرار مذاق۔۔۔ سب ہی مراحل انہوں نے طے کر ڈالے۔ شاہین نے دو تین دن ہی میں اسے عثمانیہ یونیورسٹی سے لے کر ”گنڈی پیٹ“ تک دکھا ڈالا تھا اور اب وہ لوگ روزانہ بمبئی ٹاکیز کی ”قسمت“ میں بڑھی ممتاز شانتی کو دیکھتے دیکھتے عاجز آچکے تھے۔ اس لئے نصیر نے ممنوعہ اشیاء کو چھونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ ان باتوں میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ شاہین اسے بالکل ہی گاؤں کا گنوار سمجھ کر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بچارا سمجھتا ہوگا کہ نصیر نے بھی حیدر آباد نہیں دیکھا تو دنیابی نہیں دیکھی۔ اب وہ شاہین کو کیا بتاتا کہ اس نے دنیا میں کیا کیا دیکھ ڈالا ہے۔ دنیا کا ہر مزہ چکھ چکا ہے۔ وہ تو ہر چٹھی میں بمبئی جاتا تھا۔ موج منانے۔ کیونکہ ابا جان یہ چاہتے تھے کہ وہ عیش کرنا سیکھے۔ خود اماں جان بھی اس کی رنگ رلیوں پر خوشی کے مارے ہنس پڑتیں۔ اور پھر بناوٹی غصہ سے بھوئیں سکپٹر کے کہتیں۔

”اجاڑ صورت آخر گیا نا باپ کی چالوں پر۔“

مگر اماں جان کو اس کا باہر گھومنا پسند نہیں تھا۔ کیوں کہ انہیں اپنی خاندانی روایتوں سے پیار تھا۔ انہیں مردانہ حصہ ہو حق، ناچ رنگ کی محفلوں سے آباد، بہت اچھا لگتا تھا۔ اس لئے انہوں نے لونڈیوں چھو کر یوں کی پلٹتیں ڈیوڑھی میں ہر طرف کھڑی کر دی تھیں نصیر کے لئے

یہ ڈیوڑھی اورنگ آباد کے ایک قصبے میں تھی جہاں ریل کا ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ وہاں سے پٹریاں غزل کے شہر تک آتی تھیں مگر نصیر ان پر کبھی نہیں چلا تھا۔۔۔ لیکن اب اس نے بی اے پاس کر لیا تھا۔ اپنے ابا کے ساتھ شہر کے مشاعروں میں جاتا تھا۔ اپنی جاگیر کا دورہ کرتا۔ اور گیہوں کے اکوڑے سے لے کر عورت تک کی اصلیت سے واقف ہو چلا تھا۔۔۔ یہاں تک کہ آج اماں جان اور ابا جان کو قائل معقول کر کے وہ حیدر آباد بھی آ گیا تھا۔ مشہور شاعروں کے شعروں میں پیوند لگا لگا کر اس نے اپنے شہر میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔۔۔ اس کے ابا اس بات پر نہال تھے بلکہ ایک زمانے سے ان کا یہ ڈر کہ نصیر ان کی بجائے غلام رسول کا بیٹا نہ ہو، نصیر کے شاعرانہ ذوق نے دور بھگا دیا تھا۔ کیوں کہ شاعری سے احمد ! حسین کی نسلوں کا خمیر اٹھا تھا۔۔۔ اب کیا شک ہے کہ نصیر ان کی اولاد نہیں ہے۔

اور آج اس کا شاعرانہ موڈ زوروں پر تھا۔۔۔ وہ غزل کے خمیدہ، شاداب ہونٹوں کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اس نے پچاسیوں لڑکیاں دیکھی تھی۔ مگر یہ لڑکی ان ساری لڑکیوں سے مختلف تھی جو اجالا بیگم گھیر گھار کر اس کے لئے اکھٹی

کرتی تھیں۔ نہ جانے کیوں بجلی کی طرف کوند نے والی اس لڑکی سے اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اور کوئی کشش اس کی جانب کھینچے بھی لیے جارہی تھی۔

آج راشد اس سے بے تکلفی پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ بڑے بزرگوں کے انداز میں اس سے مستقبل کے بارے میں باتیں کیں۔ پھر کچھ ہنسی مذاق بھی ہوئے اور ایک آدھ بار انہوں نے ہاتھ پکڑ کے اسے دھول بھی رسید کر دی۔ بظاہر تو وہ بھی راشد بھائی سے مارکٹائی میں مصروف تھا لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ آج ضرور وہ غزل سے بھی بے تکلفی بڑھائے گا۔

ورانڈے میں بیٹھے ہوئے راشد بھائی اپنی ہانکے جارہے تھے اور وہ مسلسل دو گھنٹے سے بیٹھا انتہائی دلچسپی کے ساتھ کبھی سیمنٹ کے منافع کا حال سن رہا تھا کبھی پٹرول میں گھاتے کا۔۔۔

اور پھر ایک دم مسکرا اڑا۔۔۔ جیسے دواؤں کے کاروبار میں اچانک پو بارے ہو گئے ہوں۔ سامنے کھڑی غزل کو دیکھ کر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہاتھ پکڑ کے کہہ دے

”آج تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

اور وہ سچ مچ گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

کیا ہوا۔۔۔؟“ دواؤں کے ڈھیر تلے سے ہانپتے ہوئے راشد بھائی نے گھبرا کے پوچھا۔

کچھ نہیں۔۔۔“ اس طرح اچانک کھڑے ہو جانے پر وہ شرمندہ سا ہو گیا اور خود خواہ کپڑے جھٹکنے لگا۔

”شاید کسی مکوڑے کوڑے نے کاٹ لیا۔“

کیا ہوا۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟“ ایک دم جانے کہاں سے لوگ نکل پڑے۔ ہنستی مسکراتی لڑکیوں کا ہجوم دالان میں اکھٹا ہو گیا۔ ایک دوسری کو ڈھکیلتی وہ سب کپڑے جھاڑتے ہوئے نصیر کو یوں دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اس کی آستین سے سانپ نکلنے والا ہو۔ پھر ان سب کے درمیان دو خمیدہ ہونٹ وا ہوئے۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“

آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ مگر وہ یہ بات پھر نہ کہہ سکا۔

تو خیر، فرض کرو کہ ہمارا معاشی مقاطعہ نہ ہو، تب بھی ایک سال تک میں سیمنٹ کا گھانا برداشت کر سکتا ہوں۔ راشد بھائی نے نیا سگریٹ سلگا کر پھر سے باتوں کا سلسلہ جوڑا۔

لیکن میں اب ایک منٹ کے لیے بھی کوئی گھاتا برداشت نہیں کر سکتا۔“ (نصیر نے سوچا)

ابھی ابھی جہاں لڑکیاں کھڑی تھیں وہاں ررنگین دھبے ناچ رہے تھے اور نیلے پھولوں والے پردے کو قرار ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی جب ہوا کا جھونکا پردے کو ذرا سا ہلا جاتا تھا تو گورے گورے نرم و نازک پاؤں ادھر ادھر دوڑتے نظر آتے۔

جسے دیکھو اسی کمرے میں کھنچا جارہا ہے۔ کسی نوکر کے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکریاں ہیں۔ کہیں کپڑوں پر استری ہو کر آ رہی ہے۔ بی بی ایک طرف بیٹھی ناریل، مصری اور پانوں کے بیڑے کشتیوں میں سجا رہی تھیں۔ لنگڑی پھو پومردا نیکی طرف لاٹھی تھامے باورچیوں کی نگرانی میں مصروف تھیں۔ ابھی مہمانوں کے آنے میں بہت دیر تھی۔ اس کے باوجود محلے کے بچے گیٹ پر بجتی ہوئی نوبت کو سننے اکٹھے ہو چکے تھے اور کواڑوں کھڑکیوں میں کھڑے بڑی دلچسپی سے اندر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

نصیر کا جی چاہ رہا تھا، بار بار کمرے میں دوڑنے والی اس چھوٹی سی بچی کو گود میں اٹھالے جس کی ناک بہہ رہی تھی اور اس کے گندے کپڑے میل اور کیچڑ میں سننے ہوئے تھے۔ پھر جب وہ اس منی سی بچی کو پکڑنے لپکا تو جانے کیسے پردہ اس کے سر میں الجھ گیا اور اس کی نگاہ خود بخود دادھر اٹھ گئی جہاں فرش پر وہ لڑکیوں کے درمیان بیٹھی تھی اور کان کے پاس ایک جھمکار کھ کر پوچھ رہی تھی

”میں کیسی لگ رہی ہوں؟“

آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ مگر یوں سب کے سامنے کیسے کہہ دیتا ”

”اجی بی بی۔۔ فوزیہ کو سرخ کتان کی ساری پہنا دوں؟“

رضیہ حیران پریشان سی ساس کے پاس کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”غزل کہہ رہی ہے گلابی جار جٹ کی ساری پہناؤ۔“

فوزیہ کو دیکھنے سمجھنے آ رہی تھیں۔ اس لئے اسے سجانے سنوارنے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ غزل نے اسے سنوارنے کا ذمہ لیا تھا۔ وہ ہر ہر زاویہ سے فوزیہ کو سجا رہی تھی۔ ساتھ ہی لڑکیوں میں قہقہے بھی بانٹتی جاتی۔

لڑکیوں کو سجانا بھی کتنی حماقت ہے جیسے جلتی ہوئی شمع پر غلاف چڑھا دیا جائے اور پھر فوزیہ اتنے بناؤ سنگار کے باوجود غزل کے سامنے یونٹھمار ہی تھی جیسے دوپہر کے وقت چراغ جل رہا ہو۔ کہیں وہ لوگ فوزیہ کی بجائے غزل کا انتخاب نہ کر لیں۔ نصیر نے اس خطرے سے غزل کو آگاہ کرنا چاہا اس ایک لمحہ میں وہ کتنی زور زور سے چلایا۔۔۔ بیلو۔۔۔ اور پھر اس نے ساری دنیا کے ٹیلی گراف آفس کھٹکھٹا ڈالے۔ سب ریڈیو اسٹیشنوں نے یہ خبر براڈ کاسٹ کی۔۔۔ مگر غزل نے پھر بھی نہ سنی۔

جب لڑکیاں ہنس رہی ہوں تو روشنی کی کیا ضرورت ہے۔۔۔! اس کے باوجود رضیہ نے عین ان کے سروں کے اوپر آج وہ فانوس جلایا تھا جو وہ جہیز میں لائی تھی۔ نیچے قالین پر زیوروں کے ڈبے، چوڑیاں اور طرح طرح کی ساریاں کھلی پڑی تھیں۔ ان رنگینیوں کے بیچ میں بیٹھی وہ ہنسے جاری تھی۔۔۔ کتنے دنوں کے بعد آج غزل کو ہنسنے کا موقع ملا تھا۔ وہ چاہتی تھی آج اپنے آپ کو بھول جائے۔ بس فوزیہ ہی کو دیکھے جائے۔

نصیر نے سوچا کہ کسی جاہل نے اس کا نام غزل رکھا ہے۔؟ وہ تو خیام کے پورے دیوان میں بھی نہیں سماسکتی۔ اس کے جسم کا ہر ہر عضو ایک علاحدہ موضوع سخن رکھتا ہے۔

اور پھر وہ سوچنے لگا کہ آج سے ہزاروں سال پہلے جب کسی شاعر نے پہلا شعر کہا ہوگا تو اس نے غزل ہی کا تصور کیا ہوگا۔۔۔ ”ایوان غزل“ کی دیواروں سے لگے سارے بوڑھے شاعر جیسے غزل ہی کا انتظار کرتے کرتے مر گئے تھے۔ آج تک شاعری صرف اسی کی تلاش کا نام ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ اس طویل سفر کو یاد کر کے اس کے ہاتھ پاؤں دکھنے لگے۔ بے شمار شاعروں کے دیوان اس کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ اپنی صحرائوردی پر اسے خود تعجب ہو رہا تھا۔ جیسے وہ خود ہی تھا جس نے قرون کی مسافت ان زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے انتظار ہی میں گزار دی تھی۔۔۔ غزل کی ایک نگاہ کی خاطر سینکڑوں جوان بدلے۔ امید کا دیا پکڑے نگر نگر اسے ڈھونڈتا پھرا اور اب صدیوں کا سفر طے کر کے اس کمرے کے سامنے آ بیٹھا ہے، جو غزل سے صرف تین گز کے فاصلے پر تھا۔

چنانچہ اتنی دیر میں ایک زور دار غزل تیار ہو گئی جسے پنسل سے سگریٹ کی ڈبیا پر لکھ کر وہ راشد بھائی کو سنانے پر تل گیا۔ انہوں نے بھی تو اینٹ پتھر کے بیوپار میں اس کی ہمدردیاں بٹوری تھیں۔۔۔ مگر اس سے کیا ہوتا! وہ لاکھ چیخ چیخ کر اس کی تعریف کرتا رہا۔ راشد بھائی نے بھی کڑک کڑک کر داد دی۔ اس کے باوجود اندر کمرے میں کسی کو فرصت نہ ملی کہ اس کے اشعار پر داد دیتا۔ وہ تو ایک ایک زیور اپنے چہرے پر رکھ کر دیکھتی اور پھر فوزیہ کے چہرے پر لگاتی۔

لڑکیاں اس لئے خوبصورت ہوتی ہیں کہ وہ ہنستی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس مردوں کو ہنسنے کے لیے کتنی جستجو کرنا پڑتی ہے۔ لطیفوں اور تعجب خیز خبروں کا کنواں کھودنا پڑتا ہے۔ تب کہیں کوئی قہقہہ اُبلتا ہے۔ ادھر لڑکیاں ہیں کہ ایک انگوٹھی کی ڈبیہ کھول کر اتنی زور زور سے ہنستی ہیں کہ شاعر اپنی غزل سننا بھول جائے۔۔۔

راشد بھائی بلیک میں خریدی ہوئی دواؤں کی ویگنیں لیے کھڑے تھے۔ مگر نصیر کو ہوش ہی کہاں تھا کہ ان کے سر سے یہ بوجھ اتارتا۔ خود اس کے اوپر کوئی سیکٹروں من وزنی پتھر اوند با گیا تھا۔

لڑکیوں کی ہنسی اور بڑھ گئی۔۔۔ جیسے دھیمے دھیمے برستے برستے موسلا دھار بارش ہونے لگے۔ آدمی چاہے تو ایک انگوٹھی دیکھ کر تصور میں ایک بارات لے آئے۔ اس وقت فوزیہ کے آس پاس بیٹھی ہوئی لڑکیاں بھی اُن لمحوں میں کھو گئی تھیں۔ جب کوئی انگوٹھی لے کر ان کا ہاتھ تھامے گا اور بچاؤ کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے۔

نصیر نے ایک بار پھر سیمنٹ کے تھیلوں اور دواؤں کی پیٹیوں کو ہٹا کر پردے کے پیچھے دیکھنا چاہا اب تک وہی یقیناً جھمکے پہن چکی ہوگی۔

اور جب وہ صراحیوں کے پاس کھڑا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا تو وہ جاتے جاتے رک گئی۔

آپ کو کیا چاہیے۔۔۔؟“ اس نے نصیر کو اتنا پریشان دیکھ کر پوچھا اور وہ جانے کیوں گھبرا گیا۔ اس کی بدحواسی پر ” غزل کو اتنے زور کی ہنسی آئی کہ ادھر ادھر جاتے ہوئے لوگ ٹھہر گئے۔ اور وہ گھبرا کے شاہین کا کمرہ ڈھونڈنے لگا۔

آدھی رات کو وہ شاہین کے کمرے سے سوتے سوتے اٹھا اور باغ کی سیڑھیوں پر بیٹھا سگریٹ پینے لگا۔

آدھی رات کا چاند بیچ آسمان پر چمک رہا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ گرمی کے مارے سانس گھٹی جاتی تھی۔۔۔ آنگن سونا پڑا تھا۔ بچے سو چکے تھے۔ بریانی اور بھگاریے بیگن اور مرغ کے ڈونگے فرش پر سے اٹھا لیے گئے تھے۔ اب سارے گھر کی عورتیں اس کمرے میں گھسی ہوئی تھیں جہاں فوزیہ کی ہونے والی ساس، ننڈیں اس کی رگ رگ ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں۔ لین دین پر بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا، واحد حسین اور شاہین غالباً سوچکے تھے۔

”آپ اٹھ گئے۔۔۔؟ میں اس وقت سے تین بار کمرے میں آچکی ہوں۔“

نصیر نے چونک کر دیکھا۔۔۔ سامنے غزل کھڑی تھی۔ بنی سنوری۔۔۔ آنکھوں میں نیند کا خمار لیے۔

”آپ۔۔۔ آپ میرے کمرے میں آئی تھیں۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ آپ نے کھانا جو نہیں کھایا۔ ممانی بیگم نے کھدیا ہے کہ جب تک آپ کھانا نہ کھا لیں میں آج نہیں سو سکتی۔“

تو پھر آئیے۔ یہاں بیٹھ کر جاگیں گے آج کی رات۔۔۔؟“ سے ہنسی آ گئی۔

کیوں۔۔۔؟ آپ کھانا نہیں کھا ئیں گے۔۔۔؟“ غزل گھبرا گئی۔

کیوں کھاؤں میں کھانا۔ یہاں کسے پروا ہے میری۔“ اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

کیوں۔۔۔؟ کیا ہوا۔۔۔؟“ غزل چونک پڑی۔۔۔ وہ اجالا بیگم اور واحد حسین کے سارے اختلافات سے واقف تھی نصیر کے ” آئے سے پہلے گھر میں ایک باقاعدہ میٹنگ ہوئی تھی جس میں طے کیا گیا تھا کہ نصیر کی بے حد خاطر تواضع ہوگی اور بہت عزت دشان و شوکت کے ساتھ رکھا جائے گا۔

”اب یہی دیکھئے کہ مجھے آئے آج چار دن ہو گئے۔ لیکن آپ نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔“

ہاں یہ تو صحیح ہے۔ غزل نے سوچا۔ اس نے جان بوجھ کر نصیر کو نظر انداز کیا تھا۔ کیوں کہ وہ اپنی سماجی حیثیت سے واقف ہو چکی تھی۔ اس لیے خاندان والوں کے آگے وہ جتنی کم آئے اتنا ہی اچھا تھا۔ سنا ہے اجالا بیگم تو بات کو بتنگڑ بنانے میں استاد ہیں۔

میں۔۔۔؟“ اس نے تعجب سے کہا۔

میرا کیا ہے۔۔۔؟ آپ کی خاطر تواضع کرنے والے تو راشد ماموں ہیں۔ ممانی بیگم ہیں۔ شابین ہیں۔ ہم غریب لوگ اپنے گھر آپ کو کیا بلائیں۔ کیا دکھا ئیں۔“ اس نے بڑی اداسی کے ساتھ کہا۔

آپ قریب ہیں۔۔۔؟“ نصیر نے چونک کر تعجب سے پوچھا۔

میں نے تو آپ جیسی امیر لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ جس کے پاس اتنا روپ ہو۔ اتنا حسن۔۔۔ ایسی بے پناہ کشش۔۔۔ وہ سچ مچ کہتے کہتے سرشار ہو گیا۔

دیوار کو تھامے ہوئے غزل کے ہاتھ خود بخود نیچے گر پڑے۔ اور وہ جیسے کسی سحر سے بے سدھ ہو کر بولی۔

”مجھ سے شاعری مت کیجیے۔ آج جانے کتنی نیندی آرہی ہے۔“

ایسی کی نیسی شاعری کی۔۔۔!“ نصیر نے چڑھ کر کہا۔

”جائیں آپ سو جائیں۔۔۔ جب آپ ہوش میں ہوں گی تب میری بات سن لیتا۔۔۔“

اس کے پاؤں پتھر بن چکے تھے۔ مگر وہ جانے کس طرح چل کر ایک اندھیرے کمرے تک آئی جہاں بچے ہوئے کھانے کی دیگیں، میٹھے کی جھوٹی پلیٹیں اور لقمیونکے ٹوکڑے رکھے تھے۔ وہیں جھوٹے دستر خوانوں کے ڈھیر پروہ گر پڑی اور کلیجہ پہاڑ کے رونے لگی۔۔۔

جانے کیوں اپنی تعریف سنتے ہی اس پر ایک سحر سا چھا جاتا تھا۔ کہنے والے کی آواز پہلے تو دل میں شہد گھولتی اور پھر ابھی تک تشنہ رہنے والی خوشیوں کا زہر اس کی رگ رگ کو جلانے لگتا۔۔۔ چھلی حقارتوں اور نفرتوں کی قطارسی سامنے اکھڑی ہوتی اور اتنی نفرت، اتنی تاریکی کو دیکھ کر وہ رو پڑتی تھی۔۔۔ اب کیا ہوگا۔۔۔ اب وہ مجھ سے کیا کہے گا۔۔۔؟

دوسری رات پھر نصیر باغ کی سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔ مگر آج چاند اس کے بہت پاس سرک آیا تھا اور اس کے کان میں ”جھک کر پوچھ رہا تھا۔“ اب کیا ارادے ہیں نصیر میاں۔؟

ابھی ابھی غزل اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی۔ اور نصیر کو یقین تھا کہ باغ کی طرف سے آنے والی یہ بھیٹی بھیٹی موتیا کی خوشبو در اصل غزل کے تصور سے آرہی تھی۔۔۔ ان تین گھنٹوں میں اس نے غزل سے کتنی باتیں کر ڈالیں۔۔۔ غزل نے اپنی ماں کی بے وقت موت اور باپ کی بے رخی سے لیکر ان مردونک کا حال سنایا تھا جو اسے دھوکا دے گئے تھے۔ اس کے باوجود نصیر نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا اور اس کے ساتھ اپنی زندگی کا تمام پروگرام بنا ڈالا۔ اس نے غزل کو ہر ہر روپ میں دیکھا۔۔۔ اجالا بیگم کی بہو کے روپ میں۔ اپنی محبوبہ کے روپ میں دیکھا۔۔۔ اپنے بچوں کو گود میں لیے۔۔۔ اور پھر اس نے وہ انگوٹھی انگلی سے اتار کے غزل کو پہنادی جو حالا بیگم کے ہاں خاندان کی بہو کے ہاتھ میں پہنائی جاتی تھی۔

یہ بیرے کی انگوٹھی ان کے ہاں سات پشتوں سے لڑ کے رونمائی میں اپنی دلہن کو پہناتے آئے تھے۔ لیکن وہ ایک بار بھی اپنی جلد بازی پر نہ گھبرا یا۔۔۔ البتہ جب اس نے انگوٹھی والے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا نا چاہا تو غزل نے گھبرا کے ہاتھ کھینچ لیا۔

”میرے پاس مت آنا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

اس نے زبردستی ہاتھ پکڑ لیا۔

کیونکہ تم آگ ہو آگ۔۔۔ میں جل جاؤں گی۔“ اس نے واقعی گھبرا کے کہا۔ ”

تمہیں اس آگ میں جلنا اچھا نہیں لگتا۔۔۔؟“ اس نے غزل کی آنکھوں پر جھک کر کہا۔ ”

”تم نے کبھی چر کے کھائے ہوں تو معلوم ہو کہ جلنا کسے کہتے ہیں۔“

اس نے گھبرا کے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح اذان سے پہلے وہ نصیر کے کمرے میں آئی۔ نصیر خوشی کے مارے اٹھ بیٹھا۔ شاید رات کو وہ ہاتھ چھڑا کے چلی جانے پر پچھتائی ہوساری رات سونہ سکی ہو۔

نصیر۔۔۔ ! میں نے ساری رات سوچا۔ بہت غور کیا۔۔۔ ایسا لگا کہ یہ انگوٹھی مجھے سچ مچ تمہارا بنادے گی۔ وہ جیسا ” کہانیوں میں لکھا ہے تا۔۔۔!“ نصیر کو یوں لگا جیسے وہ خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

”کیا لکھا ہے کہانیوں میں۔۔۔؟“

کہ انگوٹھی میں کسی شہزادی کی جان ہوتی تھی۔ اور وہ انگوٹھی کسی دوسرے کے پاس چلی جاتی تو شہزادی مرجاتی ” تھی۔

”تو کیا ہوا۔۔۔“ اس نے غزل کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے پاس بٹھالیا۔۔۔ ”تو کیوں گھبرا رہی ہے پگلی۔۔۔؟“

نہیں یا انگوٹھی تم واپس لے لو ورنہ بات بہت آگے بڑھ جائے گی۔“ وہ انگوٹھی اتارنے لگی۔ ”

”بات تو آگے بڑھ چکی ہے اس انگوٹھی کی کیا اہمیت ہے۔ میری تو جان پر بن گئی ہے۔“

غزل گھبرا گئی۔ نصیر نے اس کے کاندھے سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔

”اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں مرجاؤں گا۔ تو مجھے دھوکا تو نہیں دے گی نا۔۔۔“

اور غزل جو محبت کی ذرا سی نمی پا کر مصری کی طرح پگھل جاتی تھی پگھلنے لگی۔ معدوم ہونے لگی۔ اس کا اپنا وجود آہستہ آہستہ مٹتا گیا اور وہ نصیر میں سما گئی۔

نصیر کی آنکھ کھلی تو زندگی کی ایک حسین صبح اس کا استقبال کر رہی تھی۔ نہ جانے کب غزل اس کے پاس سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ مگر تکیے پر اس کے وجود کی گرمی باقی تھی۔ اس کی خوشبو سے بستر مہک رہا تھا۔ اور اس خوشبو نے نصیر کے انگ انگ میں جانے کیسی مستی بھر دی تھی۔ وہ اس انوکھی سرشاری سے ابھی تک واقف نہ تھا۔ اسے اپنے اوپر رشک بھی آ رہا تھا اور شک بھی ہو رہا تھا۔۔۔ چولہے کے پاس دیوار کو تھامے غزل کھڑی تھی۔۔۔ بے حد تھکی ہوئی ہوئی۔ کھوئی کھوئی۔۔۔ اس کے پریشان بال چہرے پر اڑ رہے تھے۔۔۔ آنکھیں سوچی ہوئی سی تھیں۔ جیسے وہ ساری رات روتی رہی ہو۔۔۔ وہ ابلتی ہوئی ہانڈی پر نظریں جمائے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اف کیسی بے پناہ کشش تھی اس لڑکی میں۔۔۔ ملگجے ، بد رنگے کپڑوں میں بھی وہ سونے کی مورت بنی دمکتی تھی۔۔۔ اس کی طرف نظر بھر کے دیکھتے ہی جانے نصیر کو کیا ہو جاتا تھا۔۔۔ وہ چونک کر سنبھل گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ سارے گھر کی موجودگی بھول کر غزل کی ساری اداسیاں اپنے ہونٹوں میں سمیٹنے پہنچ جائے۔

آج گھر میں سب ہی چپ چپ تھے۔ رات سے چاند کی طبیعت بہت خراب تھی۔ فوزیہ سے لے کر واحد حسین تک ان کے کمرے میں ڈاکٹر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ نصیر بھی تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ لیکن آج اس کے دل میں خوشیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اس لئے کمرے کے تکلیف دہ ماحول میں وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکا۔

پھر اپنے کمرے میں آ کر اس تکیے کو سینے سے لگا کر لیٹ گیا۔ جس پر رات غزل نے سر رکھا تھا۔ قسمت اس کے لئے کیسا انمول ہیرا لیے بیٹھی تھی۔ اس بات کی خبر کل شام تک خود اسے بھی نہ تھی۔ لیکن اب اس راز کو کیسے چھپایا جائے۔ غزل تو ہیرے کی دو انگوٹھی انگلی مینچمچماتی پھر رہی تھی۔ جیسے اسے کسی کا ڈر ہی نہ ہو۔

دو پہر میں ہمایوں نے آ کر کہاں کہ آج شام غزل کو ایک ڈرامے کی ریہرسل کے لئے جاتا ہے۔ تو غزل نے ہمایوں کے سامنے نصیر سے بھی کہا کہ وہ بھی ریہرسل دیکھنے ضرور آئے۔ شام کو اس نے نصیر کے لئے خود شیروانی پسند کر کے بکس میں سے نکالی۔ اس کے جوتوں پر پالش کی اور بڑا اصرار کیا کہ وہ غزل کا گھر دیکھ لے۔ جہاں وہ کپس اور شیلڈز رکھی تھیں۔ جو اس نے اداکاری پر جیتی تھیں۔

دوسرا دن نصیر نے غزل کے ہاں گزارا۔ وہ دونوں دن بھر جانے کس کس بات پر بنستے رہے۔ اور دو پہر کو ”نجمہ“ دیکھنے گئے۔

زمر محل کی بالکنی میں بیٹھے بیٹھے غزل کو یوں لگا جیسے نصیر کے ساتھ رہتے ہوئے زمانے بیت گئے ہوں۔ نصیر کے پیار کی گرمی اس کے لئے بہت پرانی سی بات ہو چکی تھی۔ وہ بالکل گریست بیویوں کے انداز میں اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتی تھی۔ اس بدن میں کیا تھا جسے بجائے بجائے پھرتی۔۔۔؟ اس نے تو اپنی روح پہلی بار ایک مرد کو سونپی تھی۔ اور اس کے بعد ہر چیز بھول جانا چاہتی تھی۔

وہ گھر آئے تو نصیر پریشان سا تھا کہ جانے ہمایوں اس پر کتنا شک کرے گا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ غزل کے ہاتھ میں ایک نئی انگوٹھی سب نے یوں نظر انداز کر دی۔ جیسے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔۔۔

دوسرے دن جب وہ صبح اٹھ کر دالان میں آیا تو شاہین نے شیو کرتے کرتے پلٹ کر اس سے کہا۔

”اب تو غالباً آپ ایک آدھ مہینہ اور قیام کریں گے۔۔۔؟“

وہ کھسیا کے ہنسنے لگا۔ کیوں کے پرسوں شام جب شاہین نے بڑے اصرار سے ایک ہفتہ اور رکنے پر اصرار کیا تھا ! تو اس نے انکار کر دیا تھا کہ جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن آج شاہین جان چکا تھا کہ وہ کس چکر میں پھنس چکا ہے

اسے شاہین کی چالاکی پر رشک آرہا تھا۔ شاہین اس کی عمر کا ہوگا! مگر یہ شہری لونڈ سے اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔

کیوں پکی ہے نابات...؟ ملاؤ ہاتھ یار...“ شاہین نے ہنس کر ہاتھ بڑھایا تو دونوں خوب ہنسنے لگے۔ ”

راشد اور رضیہ فوزیہ کا جہیز خریدنے گئے تھے۔ چاند اپنے کمرے میں پڑی کراہ رہی تھی۔

دالان کے تخت پر فوزیہ اور لنگڑی پھو بو بیٹھی کپڑے قطع کر رہی تھیں۔ نصیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہاں کیسے بیٹھے۔ اپنے پاس کھڑا دیکھ کر لنگڑی پھوپھو نے اپنی عینک ٹھیک کی اور وہ گھبرا گیا۔

اب اس کے عشق کا نشہ اتارا جائے گا۔ لنگڑی پھوپھو اپنی نصیحتوں کا پٹارہ کھولنے ہی والی ہیں۔

”اجی نصیر بابا، آپ کیا کھا رہے ہیں۔ آپ کو کچھ بھی یہاں آرام نہیں مل رہا ہے۔“

”جی نہیں پھوپھو میں تو بہت مزے میں ہوں۔“

اجی پھوپھو یہ تو ضرورت سے زیادہ ہی مزے میں ہیں۔“ شاہین نے شیو کرتے کرتے مڑ کے کہا تو اسے پھر ہنسی آگئی۔ اور مارنے دوڑا شاہین کو۔

کیا ہے کی ماں۔“ ہم لوگ تو چاند کی وجہ اتنے پریشان ہیں۔ میں غزل کو بولی تھی کہ ذرا نصیر بابا کے کھانے پینے کا خیال رکھو۔“ لنگڑی پھوپھو نے کپڑا تخت پر پھیلا کر کہا۔

بس یہی آپ نے بہت اچھا کیا۔“ شاہین نے نصیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

غزل نے ان کی بہت خاطر و تواضع کی ہے۔ کیا کیا کھلایا ہے اب تک اجی ذرا پھوپھو کو بتاؤ نا حضرت...؟“ اور ”اپنی بات پر شاہین خود بھی نصیر کے ساتھ ہنسنے لگا۔

چل یہ ایک چھچھورا بچہ ہے۔“ لنگڑی پھوپھو نے ہنس کر کہا۔

آپ کو کیا پسند ہے بولو میں وہی پکواؤں گی۔ لنگڑی پھوپھو نے پرقینچی ہاتھ میں اٹھالیں۔

آبا آبا۔ کیا اچھی بات ہو چھا ہے پھوپھو آپ نے۔“ شاہین اچھل پڑا۔

”دیکھو نصیر میاں ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔ ہاں جلدی بتاؤ آپ کو کیا پسند ہے۔؟“

آپ خاموش بیٹھتے ہیں کہ میں آؤں۔“ نصیر شاہین کو مارنے بھاگا۔ اور وہ دونوں لڑتے جھگڑتے باہر کی طرف بھاگے۔

پھر نصیر نے ایک مہینہ حیدر آباد میں یوں گزارا کہ دن پر لگا کے اڑ گئے۔ اس نے باپ سے چوری چھپے اماں جان سے ایک ہزار روپے منگوائے۔ یوں تو اجالا بیگم دمڑی دمڑی پر جان دیتی تھیں۔ مگر ان کا بیٹا پہلی بار حیدر آباد گیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھیں کہ واحد حسین کے سامنے وہ اپنے خوب ٹھاٹھ باٹ دکھائے۔ اس نے غزل کے ساتھ ٹیکسیوں میں خوب سیریں کیں۔ اس کے لئے تھے خریدے۔ ہمایوں کبھی زیادہ دنوں تک غزل کو بی بی کے ہاں چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ لیکن نصیر روز شام کو ہمایوں کے ہاں اتنے تحفے لے کر جانے لگا کہ ہمایوں نے غزل پر سختی کرنا چھوڑ دی۔

اب غزل کو احساس ہونے لگا کہ وہ نصیر کے ساتھ حیدر آباد میں نہیں رہ سکتی۔ ہر طرف اسے شناسا نظریں دکھائی دیتیں۔ لوگ اسے نصیر کے ساتھ دیکھتے تو مسکرانے لگتے اس لئے اس نے نصیر سے کہہ دیا کہ میں کبھی حیدر آباد نہیں آیا

کروں گی۔۔۔ بس وہیں کہیں اجٹا کے غاروں کی طرح وہ بھی ایک کٹیا بنا کر رہا کریں گے۔ لیکن نصیر اپنا حال سننا شروع کر دیتا۔ ایک چھوٹے سے قصبے کا حال۔ جہاں پرانے زمانے کی ایک عظیم الشان ڈیوڑھی ہے۔ اس میں نصیر کی سخت مزاج اماں جان رہتی ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر نصیر کا بھی نہیں توڑ سکتا۔ وہاں نصیر کے کھیت ہیں۔ جن میں وہ غزل کے ساتھ ٹریکٹر چلایا کریگا۔ وہاں کے گاؤں میں لوگوں نے کبھی پیسٹری نہیں کھائی اسٹیج ڈرامے نہیں دیکھے۔ وہاں بوٹ کلب نہیں ہیں اور نہ بلگرامی اور بھان جیسے سوشل ور کرس۔

غزل نے یہ باتیں سنیں تو خوشی سے جھوم اٹھی۔ ایسی خوبصورت فضا۔ اتنے سادہ مزاج لوگ! بوٹ کلب اور بھارت کلا منڈل کی گندی فضا سے وہ جگہ کتنی مختلف ہوگی! وہاں وہ کسی کے اوپر بوجھ بن کر نہیں رہے گی۔ اس گھر میں سب اس کی عزت کریں گے۔ وہ بھی فوزیہ کی طرح دلہن بن کر وہاں چلی جائے گی۔

ایک دن نصیر نے غزل کو لمبے لمبے ناخنوں پر پالش لگاتے دیکھا تو ہنس کر کہا۔

”اورنگ آباد جانے سے پہلے تم کو یہ ناخن کاٹنا ہوں گے۔ اماں جان کو بڑی گھن آتی ہے لمبے ناخنوں سے۔“

یہ سن کر غزل کو بڑی ہنسی آئی۔ نانا حضت اور بی بی کو بھی اس کے اور فوزیہ کے لمبے ناخنوں سے بڑی چڑ تھی۔

”اور وہاں عورتیں بے پردہ نہیں پھر تیں نہ لپ اسٹک لگاتی ہیں۔“

پھر ایک دن کھانا کھاتے میں نصیر نے پوچھا

تمہیں بریائی پکانا آتی ہے۔۔۔؟“ اس وقت نصیر کو وہ خوبصورت سی دہلی پٹلی لڑکی یاد آ رہی تھی۔ جسے بہو بنائے ” کا اعلان کرتے وقت اماں جان بار بار یہی کہتی تھیں کہ اچھی اجی میرا تو دل نفیس کی سلیقہ مندی پر آگیا ہے۔۔۔ کیا بتاؤنچچی ماں اس دن مرغ کی بریائی تو ایسی اچھی پکانی تھی کہ اجاڑ صورت باور چی شرما جائیں۔ خود نصیر کو بھی یہ گوری گوری بیوقوف سی لڑکی خاصی پسند تھی۔ لیکن اچھا ہوا کہ اماں جان نے ابھی وہاں باقاعدہ پیغام نہیں بھیجا تھا۔

میرے کو تو کچھ بھی پکانا نہیں آتا۔“ غزل نے بڑی شان سے کہا۔۔۔ چاند آپا کی صحبت میں وہ اس بات کو جان چکی ” تھی کہ اس کے خوبصورت ہاتھ روٹی پکانے اور چولہا جلانے کے لئے نہیں بنے ہیں۔

”پھر تو ہماری ماں جان آپ کے عورت ہونے میں شک کریں گی۔“

اس پر خود غزل کو بھی ہنسی آگئی۔

نصیر کے جاتے وقت وہ دونوں خوب روئے۔ غزل نے اس سے بے شمار وعدے لئے اور اس نے غزل کو تاکید کر دی کہ وہ آئندہ کسی ڈرامے میں کام نہ کرے اور باقاعدہ پردہ کرنے کی عادت ڈالے۔ کیوں کہ اس کی اماں جان بے پردہ عورت کو رنڈی سمجھتی ہیں۔

جانے سے پہلے نصیر تھوڑی دیر کے لئے بی بی کے پاس آبیٹھا اور بی بی کو سنا دیا کہ عنقریب اجالا بیگم غزل کا پیغام یہاں بھیجنے والی ہیں۔ بی بی تعجب کے مارے اچھل پڑیں! راشد اور رضیہ کا غصہ اور جلن کے مارے برا حال ہو گیا۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ یہاں تو کسی نے خواب میں بھی یہ بات نہ سوچی تھی کہ یہ آوارہ چھوکری اجالا بیگم کی بہو بن کر راج رجبے گی۔ اس بات پر سب سے پہلے اقرار کرنے والے واحد حسین تھے۔ اور سب سے بعد میں رضیہ تیار ہوئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایک بار پھر نئے سرے سے نصیر آئے اور وہ غزل کو دھکا دے کر فوزیہ کو اس کے کمرے میں بھیج دے۔ حد ہوگئی۔۔۔ فوزیہ کے لئے کہاں کہاں بڑا گھر ڈھونڈا اور ملا بھی توبہ توبہ بوڑھا ڈاکٹر جس کے مطالبے کم ہی نہ ہوتے تھے۔ ادھر یہ دنیا کی خوار خراب چھوکری اور اس نے رضیہ ہی کے گھر میں بیٹھ کر نصیر کو چھین لیا۔

دوسرے دن غزل اندر بیٹھی نصیر کو یاد کر کے رو رہی تھی تو جانے کیسے ٹگمگاتے قدموں سے چل کر چاند اس کے پاس آبیٹھی اور اپنا سوکھا مارا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا۔

”نصیر کو یاد کر نا چھوڑ دے گجو۔۔۔ بچوں کو چاند کس نے لا کر دیا ہے؟“

غزل چاند کی بات سن کر چونک پڑی اور اس نے بڑے غور سے چاند کو دیکھا۔

تم مجھے پاگل سمجھتی ہو۔۔۔! لیکن میرا کلیجہ دہل جاتا ہے جب سوچتی ہوں کہ تم اتنی یادوں کو لے کر کیسے ”جیوگی۔۔۔؟“

انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کے پاس تخت پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔

یہ چاند آپا کیسی بدشگونی کی باتیں کرتی ہیں! غزل کو اب چاند آپا سے کوئی ہمدردی نہ رہی تھی۔ یہ بھی شاید ممانی بیگم کی طرح اس کے نصیب جاگنے پر جل رہی ہیں

”چاند آپا انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اپنا کوئی شعر میرے ذکر کے بغیر پورا نہ کریں گے۔“

ہولی دیوانی۔۔۔“ چاند آپا کی مسکراہٹ میں نیم کے پتے کھلے ہوئے تھے۔۔۔“

”ان کے شعروں کی تکمیل سے کیا تیری زندگی سنور جائے گی۔۔۔“

وہ اپنی سانس ٹھیک کرنے کے لیے رک گئیں۔

یہ آرٹسٹ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔۔۔ انہیں کسی کی رفاقت نہیں چاہیے۔ زندگی کو خوبصورت بنانے والی یاد میں ”چاہئیں۔“

خیر، چاند آپا کچھ بھی بکتی رہیں۔ لیکن نصیر کا خیال تو اس کی روح میں رچ گیا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ نصیر بلگرامی نہیں ہے۔ یہ تو اس کی قسمت تھی کہ اس کا دولہا اتنی بڑی جائداد کا مالک ہے۔ ورنہ وہ تو غریب نصیر کو بھی اسی طرح قبول کر لیتی۔ نصیر نے کہہ دیا تھا کہ اسے جہیز نہیں چاہیے۔۔۔ ایک فوزیہ تھی کہ اس کا میاں مجھے سات سو روپے کمانے والا ڈاکٹر تھا۔ اس پر بھی سسرال والوں کی ناک سیدھی نہ ہوتی تھی۔ ممانی بیگم جہیز کی فہرست بڑھاتے بڑھاتے تھکی جارہی تھیں۔ ابھی انہوں نے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے شاہین کو بھی یورپ بھیجا تھا۔ اب وہ بیٹی کی شادی پر زیادہ پیسہ اٹھانے کو تیار نہیں تھیں۔ فوزیہ کی ساس کہہ گئی تھیں کہ زیور چڑھانا اور ولیمہ کرنا ان لوگوں کو راس نہیں ہے۔ اس لئے وہ صرف دلہن کے کپڑے لا ئیں گی۔

فوزیہ نے ابھی تک اپنے ہونے والے دولہا کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کے باوجود سنی سنائی باتوں پر اس نے صرف اپنے دولہا کی صورت کا تصور کر لیا تھا۔ بلکہ اس کی عادت و اطوار سے بھی پوری طرح واقف ہو چکی تھی۔

”انہیں مسی پسند نہیں ہے۔ کہہ دیا ہے کہ جلوے کے دن میرے مسی مت لگانا۔۔۔“

سنا ہے گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ فضول خرچی سے بڑی چڑ ہے۔۔۔ بڑے صفائی پسند ہیں۔۔۔“

وہ غزل کو چپکے چپکے سناتی اور پھر خود ہی ہنسنے لگتی تھی۔

فوزیہ کی باتیں سن سن کر غزل اپنے خیالوں میں ڈوب جاتی۔

کھانے پینے کا تو کچھ شوق ہی نہیں ہے۔۔۔ بس میں سامنے بیٹھی رہوں اور وہ شاعری کرتے رہیں۔۔۔

کہتے ہیں میری آنکھوں پر تو وہ ایک ہزار سال تک شعر کہتے رہیں گے۔ انہیں کنجوسی سے بڑی چڑ ہے۔۔۔ ”وہ کہہ گئے ہیں کہ میں اب کبھی ڈرامے میں کام نہ کروں۔۔“

لیکن ہمایوں کیوں مانتا! اور سچی بات تو یہ تھی کہ ہمایوں بھی کوشش نہیں کرتا تھا۔ لوگ خود ہی چلے آتے تھے۔ ہمایوں کی خوشامد کرنے وہ لوگ اپنی مجبوریوں کو اس طرح ظاہر کرتے کہ غزل کا دل بھی پسیج جاتا تھا۔

خور داد کا مہینہ آ گیا۔

ہلکی ہلکی بدلیاں چھانی رہتی تھی۔ اور بدلتے موسم کا مد و جز رتلوں میں بھی کھلبلی مچائے ہوئے تھا۔

حیدر آباد کی سرحدوں پر انڈین یونین کی فوجیں آچکی تھیں۔ ہر طرف سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ کیوں کہ اعلیٰ حضرت نے سر والٹر مانکن کے ذریعے دہلی جو تجاویز بھیجی تھیں وہ نا منظور ہو چکی تھیں۔ ادھر قاسم رضوی جناح سے بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ لیکن اس بات سے ناواقف تھے کہ حیدر آباد سے جانے والے خطوط ٹیلیگرام اور خبروں کا سارا ریکارڈ انڈیا کے ایجنٹ کے ایم منشی کے پاس تھا۔ لیکن قاسم رضوی نے عوام کو یہ باور کر رکھا تھا کہ پاکستانی ہوائی جہاز فوجی کمک لے کر بیگم پیٹھ کے ہوائے اڑے پر اترنے والے ہیں۔ مگر مسٹر جناح جانتے تھے کہ حیدر آباد کا مستقبل کا حل فوجی کارروائی میں نہیں ہے۔ اس لئے وہ کسی بھی جارحانہ ایکشن کے خلاف تھے۔ اس نازک مرحلے پر بھی قاسم رضوی اپنا مشن واپس لینے کو تیار نہیں ہوئے۔

کیوں کہ عوام میں سلطنت آصفیہ کو بچانے کے لئے بڑا جوش و خروش تھا۔ اس لئے قاسم رضوی نے اپنے طور پر رضا کاروں کو سرحدوں پر لڑنے کا حکم دے دیا تھا۔

کنگ کوٹھی“ میں بیٹھے ہوئے ”اعلیٰ حضرت“ دہلی کے بدمعاشوں اور رضا کار غنڈوں کا منہ توڑنے کا حکم دیتے ” رہے۔ لیکن اس وقت تک نہتے نو جوان انڈین یونین کی فوج کا مقابلہ کرنے پہنچ گئے اور تینکوں کے نیچے تنکوں کی طرح پسے لگے۔

اس وقت راشد بڑے غور سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مختلف چیزوں کی تجارت سے اتنا کمالے ” کہ ”ایوان غزل“ کا سارا قرض بے باق ہو جائے۔ اب حیدرآباد کا ہر تاجر نفع نقصان کی تر از و تھامے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کا پلڑا کس طرف جھکنا چاہیے؟

ہر طرف ہما ہمی تھی۔ سب فرار کے راستے ڈھونڈ رہے تھے۔ مفاد پرست خود ساختہ لیڈر معصوم اور نہتے نو جوانوں کو بہکا رہے تھے۔ فضا نعروں اور تکبیروں سے گونج رہی تھی۔

”آگے بڑھو۔ وطن کے لیے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دو۔“

قاسم رضوی چلا رہے تھے۔

غنڈے بدمعاش۔۔۔ ان سب کو گرفتار کر وادو۔“ اعلیٰ حضرت غصے اور غم کے مارے حکم دیتے رہے۔ انہیں سخت ” ! تعجب تھا کہ آج ان کے عتاب سے درود یوارلرز کیوں نہیں جاتے

ہر گھر کا ایک نہ ایک نوجوان جنگل کی کسی جھاڑی میں الجھا ابدی نیند سو رہا تھا۔۔۔ عالم جنون میں انہوں نے بڑھتے ہوئے ٹینکوں کو روکنے کے لیے اپنے ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ کیوں کہ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی حفاظت کی کوئی تیاری نہیں کی تھی۔۔۔ وہ تو ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے باشندے تھے جو ریاست سے باہر کے ہر فرد کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ ان کی بخشش اور سخاوت کے دور دور تک چرچے تھے۔ جسے یہاں پناہ ملی اس کی سات پشتوں کا ٹھکانا ہو گیا۔۔۔ جو یہاں سے دھتکارا گیا اسے کہیں اسرا نہیں ملا۔۔۔ ہماری تہذیب۔۔۔ ہمارا ملک۔۔۔ ہمارا وطن۔۔۔ ہمارے حضور۔۔۔ اور حضور پر جان نثار کرنے والی ان کی وفادار رعایا۔۔۔ جو تو پوں کے دہانے کے آگے سینہ سپر تھی۔۔۔ کیوں کہ وہ حضور پر نور کے وجود کے بنا جینے کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ یہ بڑی عجیب سی شہنشاہی تھی۔ انوکھی آمریت۔۔۔ جہاں بادشاہ سے پیار اور تعظیم کا جذبہ ہر جذبے سے افضل تھا۔۔۔ اور اس کا ثبوت انڈین یونین کی فوجوں کو پانچ دن میں ہر قدم پر ملا۔

اب سڑکیں سنسنان پڑی تھیں۔۔۔ ان ماؤں کے دلوں کی طرح جنہوں نے اپنی آنکھوں کی جوت کھو دی تھی۔

بغاوت کا جوش دبانے والے کچھ لوگ تو راتوں رات پاکستان بھاگ گئے تھے باقی جو رہ گئے تھے وہ بھی کہیں نہ کہیں روپوش تھے۔

ایوان غزل“ کے باغ میں انگریزی بولنے والی چڑیا حیران تھی کہ واحد حسین کئی دن سے باغ میں کیوں نہیں آ رہے ” ہیں۔

وہ ان کی کرسی۔۔۔ کے آس پاس شوں۔۔۔ شوں۔۔۔ شوں۔۔۔ دو۔۔۔ کرتی پھرتی۔

باغ کی روش پر لگے ہوئے پھول سراٹھائے ان کی آمد کے منتظر تھے۔ مگر ان کے سرقطع کرنے کا حکم دینے والا ہارٹ اٹیک سے مڈ ہال اپنے کمرے میں گم سم پڑا تھا اور اس کی تمام بیاضیں الماری میں چپ چاپ پڑی تھیں۔

ایوان غزل“ کے باسی اتنے باشعور تھے کہ نہ صرف انہوں نے آنے والے خطرے کو بھانپ لیا تھا بلکہ اپنے لئے پناہ ” گاہیں بھی تیار کر لی تھیں۔ راشد کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

کیوں کہ وہ ایک آدھ مہینہ پہلے اتحاد مسلمین کا سرگرم کارکن بن گیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور تاجروں سے چندے اکٹھے کئے اور قاسم رضوی کے سامنے لاکر ڈالنا رہا۔ کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ بات صرف سمجھوتے سے ختم نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں اسے کئی لاکھ کا گھانا ہوتا۔

اور جب معلوم ہوا کہ یونین کی فوجیں آ رہی ہیں تو وہ سیاست دیاست چھوڑ کر صرف بزنس مین بن گیا۔

اپنی سیاست کے چکروں میں نہیں پڑیں گے۔۔۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔۔۔ ”ہم تو بزنس مین ہیں۔۔۔ ہمیں کیا لینا دینا۔۔۔“

وہ شولا پور اور احمد آباد کے راستے چیزیں اسمگل کرتا رہا۔

لیکن بیٹے کی ان سرگرمیوں سے واحد حسین کے دل میں کوئی امنگ نہ جاگی۔ اور ان کا دل بجھتا ہی گیا۔ وہ جو گزشتہ شان و شوکت کے واپس آنے کی ایک موبوم امید تھی وہ پوری طرح ڈوب رہی تھی۔ اس لئے ہر جاگیردار گھرانے میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

یہ دو لوگ تھے جو بالکل نہیں جانتے تھے کہ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لئے موقع پرست ذہن، ہر بات برداشت کرنے والے دل اور ہر ایک کی تعریف کرنے والی زبان کی بھی ضرورت ہوگی۔۔۔ وہ تو یہ جانتے تھے کہ جاگیردار کا بیٹا بھی جاگیردار ہوگا۔ امیر آدمیوں کی قسمت اللہ میاں ایک بار سونے کے قلم سے لکھ ڈالیں تو پھر اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

واحد حسین کے دادا پانیگاہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان صاحب اقتدار لوگوں میں سے تھے جن کی اپنی فوج اور پولیس تک تھی۔۔۔

یہی وہ لوگ تھے جو سلطنت آصفیہ کے اصل نگہبان کہلاتے اس وقت تک نہ تو ریڈیڈنٹ کا ڈنڈا سر پر آیا تھا اور نہ خود حضور اعلیٰ کو اتنا اختیار تھا کہ پانیگاہ والوں سے کوئی باز پرس ہوتی ایسے میں موج اڑانا صرف واحد حسین کے باپ دادا کی میراث تھی اس لئے انہوں نے ”ایوان غزل“ بنایا اور اس میں ہر زمانے کے مطابق ایک نیا معشوق جلوہ گر رہا۔۔۔ ان حسیناؤں کا محض تصور ہی بڑے بڑے جاگیرداروں کو بے چین کیے رکھتا تھا۔ خود حضور کی نظریں بھی ہمیشہ ”ایوان غزل“ کی سرمستیوں پر لگی رہیں۔ کیوں کہ ”عنبری باغ“ میں اگر چہ سارے ہندوستان کے بیرے جو ابرات اکٹھے کیے جاتے تھے، مگر ”ایوان غزل“ میں چمکنے والے چاند کے آگے ان کی کوئی حقیقت نہ ہوتی۔ اس کی کشش دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتی تھی۔۔۔ نصیر بھی ”ایوان غزل“ میں کسی ایسے ہی محبوب کا تصور کر کے آیا تھا۔۔۔ اور جاتے وقت وہ حسن کے سحر سے پتھر کی مورت بن گیا تھا۔ اسی سرمستی میں آکر واحد حسین کے باپ دادا نے کھیت کے کھیت چھا ڈالے۔۔۔ ڈیوڑھیاں نگل لیں۔ بیویوں کے زیور پھانک گئے۔۔۔ اور کولہے سے ہاتھ پونچھ کر قبر میں جاسوئے۔۔۔ رہ گئی اولاد تو سزا بھگت رہی تھی۔۔۔

دن میں دو دو بار ڈاکٹر آتا تھا۔۔۔ مگر واحد حسین کو دوا پلانے کے بجائے دو چار خوش خبریوں کے انجکشن دے کر چلا جاتا۔ شام کو راشد اخبار سامنے رکھ کر بیٹھ جاتا تھا اور ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ اس کے اوپر رکھتا۔ جس میں سے واحد حسین کو اچھی اچھی خبریں پڑھ کر سنائی جاتیں۔ اب رہ گئے لنگڑی پھوپو اور شیخو میاں تو بقول راشد کے یہ دونوں بڑے جھوٹے گپ باز تھے۔ ریڈیو کی خبریں بھی وہ خوب بڑھا چڑھا کر اور نمک مرچ لگا کر سناتا تھا تا کہ لوگوں میں خوف و دہشت پھیلے۔

لیکن لنگڑی پھوپو اس زمانے میں اخباروں پر قطعی اعتبار نہ کرتی تھیں بلکہ ان کے نامہ نگار خصوصی دھوبی، ماما، بھوئی اور سب سے بڑھ کر شیخو میاں تھے۔ شیخو میاں رضا کاروں میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن ڈر کے مارے گھر سے باہر قدم نہ رکھتے تھے۔ البتہ بھوئی اور کریم کی سنائی ہوئی خبروں کی بنیاد پر رضا کاروں کی فتوحات کی جو کہانی وہ گڑھتے تھے اس کے ہیر و وہ خود ہوتے اور یہ کہانی ان کی بہادری کے کارناموں سے بھری ہوتی۔

اس لئے راشد نے واحد حسین کے کمرے پر سخت پہرہ لگا دیا تھا کہ سوائے بی بی اور ڈاکٹر کے کوئی نہ جائے۔ مگر واحد حسین کی بیماری نے بی بی کو ایسی چپ لگائی تھی کہ وہ واحد حسین سے باتیں کرتیں نہ کسی اور سے۔ دن رات چپ چاپ بیٹھی درودیوار کو گھورے جاتیں۔ یہ وقت ہی ایسا تھا۔

سب بی لرزہ برانداز تھے کوئی کسی سے بات نہ کرتا دن رات سجدوں میں گرے تو بہ تلا کیا کرتے۔۔۔

واحد حسین اپنے کمرے میں پڑے کڑوی کسلی دوا میں پہلے جاتے مگر ان کا دل و دماغ اور نگ آباد میں تھا، جہاں ان کا بھائی جانے کتنی پریشانیوں میں گھرا ہوگا۔۔۔ ویسے تو راشد نے انہیں اطمینان دلا دیا تھا کہ اس نے اپنے دوست سے سب کی خیریت منگوالی ہے اور وہ لوگ بالکل محفوظ ہیں۔ لیکن دراصل اور نگ آباد کے بارے میں بڑی پریشان کن خبریں آتی تھیں۔ خصوصاً احمد حسین کی جاگیر کے بارے میں تو اطلاع ملی تھی کہ بمباری سے تہس ہو چکی ہے۔۔۔ جانے اجالا بیگم، احمد حسین اور نصیر کہاں ہوں گے! ہوں گے بھی یا نہیں! بعض وقت بی بی کو اجالا بیگم کی باتیں اور محبتیں یاد آتی تھیں تو وہ چپکے چپکے رونے لگتیں۔۔۔ وہ دنیا کی پہلی جٹھانی تھیں جو اپنی دیورانی کی تباہی پر روئی تھیں۔ ان کے آنسو دیکھ کر رضیہ کو بہت غصہ آیا۔ یہ کیسی عورت ہے کہ اپنے بیٹے کی تقدیر جاگنے پر خوش ہونے کی بجائے رو رہی ہے۔ ارے بلا سے غنڈے ڈیوڑھی ہی کو لوٹ کر لے جائیں۔ مگر ڈھائی لاکھ کی جائیداد کو تو اٹھا کر نہیں لے گئے ہوں گے۔ آج نہیں تو کل۔ آخر وہ چیز میں اپنی ہی ہوں گی۔

اور ایک غزل تھی کہ روتے روتے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ جب سے نصیر گیا تھا اس نے لوٹ کر کوئی خبر نہ لی تھی۔ حالانکہ غزل نے ایک دن میں چار چار خط لکھے تھے۔ فوز یہ کہتی تھی کہ نصیر کی اماں جان بڑی جلاذ ہیں۔ وہ یقیناً غزل کے سارے خط حاصل کر کے پھینک دیتی ہوں گی۔ اب دیکھنا وہ ایک دن اچانک بارات ہی لے کر آنے والا ہے اور غزل بیجاری ہر وقت دروازے پر کان لگائے بیٹھی رہتی تھی۔ آج کل ڈراموں کا بھی کسی کو ہوش نہیں تھا۔ جگہ جگہ امن کمیٹیاں بن رہی تھیں۔ مسجدوں میں جا کر لوگ دعائیں مانگتے اور درگاہوں میں عورتیں منتیں لے کر جاتیں۔ کہ ان کے شوہر اور بھائی خیریت کے ساتھ واپس آ جائیں تو پھولوں کی چادریں چڑھائیں گی۔ مگر ان درگاہ والوں کو شاید ہزاروں انسانوں کے بدن سے کپڑے اترتے دیکھ کر اب پھولوں کی چادروں سے کوئی دل چھی نہیں رہی تھی۔

ایک دن سڑک پر شور سن کر غزل کھڑکی میں بھاگی۔ اس کے پیچھے پیچھے بی بی، رضیہ اور لنگڑی پھوپو بھی آگئے۔

سڑک پر سے رضا کاروں کے دستے لڑائی پر جارہے تھے۔ پیدل مارچ پاسٹ کرتے ہوئے پچیس تیس برس سے لے کر سولہ سترہ برس کے نو عمر لڑکے بھی تھے، جن کے آگے آگے موت چل رہی تھی۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی راہ کون سی ہے۔ مگر اس کے باوجود عزت اور وطن دوستی کے نام پر کٹ مرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ سارے محلے کے لوگ ان پر پھول پھینک رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ جگہ جگہ انہیں روک کر پھول پہنائے جاتے۔

غزل نے غور سے دیکھا۔ اس دستے کے کمانڈر شیخو میاں تھے۔ ان کی پتلی کمر پر پتلون کسی طرح نہیں ٹک رہا تھا۔ وہ صرف آدھے میل چل کر بری طرح بانپ رہے تھے۔۔۔

اوئی۔۔۔ شیخو بھائی اتنے جوان چھو کر وں کو کہاں لیے جارہے ہیں۔۔۔ لنگڑی پھوپو نے گھبرا کے پوچھا۔

پھوپو۔۔۔ پھوپو پوانہیں روکیے۔“ غزل روتے ہوئے انگڑی پھوپ کو جھنجھوڑ کر کہا۔

پھر راشد بھی پھاٹک سے باہر آیا اور ان لوگوں کو روک کر سب سے ہاتھ ملائے۔ مبارک باد دی اور انہیں پیتانے کے لیے پھول منگوائے۔ اچانک فوزیہ چلائی۔

”ایاز بھائی۔۔۔ غزل دیکھا یاز بھائی بھی جارہے ہیں۔“

غزل نے گھبرا کے دیکھا۔ سچ مچ ایاز تھا۔ خاکی وردی پہنے۔ کاندھے پر بندوق رکھے، سب کے ساتھ چل رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ”ایوان غزل“ کے سامنے سے جلدی نکل جائے۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

ایاز بھائی۔۔۔ میرا بھائی۔۔۔؟“ غزل چلائی تو وہ صف توڑ کے چلا آیا اور بی بی کے سامنے قدم بوسی کے لیے جھکا۔ ”سب زور زور سے رور رہے تھے۔

گجو۔ میں بھی محاذ پر جارہا ہوں۔ تو گھبرا نامت۔ میں جلد ہی آجاؤں گا۔“ ایاز سب کو روتے دیکھ کر خود بھی خوف زدہ سا ہو گیا تھا

”نہیں نہیں۔۔۔ ہر گز نہیں۔۔۔ میں نہیں جانے دوں گی۔“

غزل سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے رونے لگی۔

بی بی اور لنگڑی پھوپو نے بھی منع کیا۔

دیکھ گجو۔۔۔ مجھے میٹرک پاس کرنے سے کہیں نوکری نہیں مل رہی ہے میں وہاں سے واپس آؤں گا تو فوج میں ”مجھے بہت بڑی پوسٹ مل جائے گی۔ قاسم رضوی نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ پھر ہمارے گھر کی سب مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ تیرا رونا ختم ہو جائے گا۔ مجھے جانے دیجئے بی بی۔“ ایاز نے رو رو کر سب سے کہا اور سب کے سامنے ایاز کا درخشاں مستقبل آگیا۔۔۔ سچ مچ ان بچوں کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

”مگر ایاز بھائی تم لڑنا کیا جانو۔ ایک بندوق سے کیسے لڑو گے؟“

فوزیہ نے پوچھا۔

پھر راشد اندر آیا اور سب کو ڈانٹتے لگا۔

یہ کیا ہائے واویلا مچائی ہے۔ خوامخواہ ایاز کو بھی پریشان کر رہی ہو۔ آخر ہمارے خاندان سے ایک آدمی بھی لڑنے ”نہیں جائے گا تو بد نامی نہیں ہوگی۔۔۔ جاؤ بابا، اللہ کوسونپا ہے تمہیں۔ خیریت سے گھر واپس آنا۔

ادھر لنگڑی پھوپو شیخو بھائی کو کسی طرح نہیں جانے دے رہی تھیں اور روتے روتے ان کا برا حال تھا۔ آخر راشدنے سب کو زبردستی اندر کیا اور پھر سب واحد حسین کے ڈر سے خاموش ہو گئے کہ ایاز کے جانے کی خبر سے ان کی طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔

اس دن کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ سارے گھر پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سوائے اس چڑیا کے جو دالان کی الگتی پر بیٹھی بار بار گھر والوں سے پوچھتی تھی۔

”شوں شوں... شو شو... دو... دو...“

سڑکوں پر جیپ کاریں اور ٹینک چلاتے پھرتے۔ رات کو بلیک آؤٹ میں سارا قبرستان لگتا تھا۔ لنگڑی پھوپو اور غزل ساری رات جانماز پر بیٹھے محاذ پر جانے والوں کی خیریت کی دُعاؤں مانگتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی لنگڑی پھوپو آج کل اتنے غرور سے بات کرتی تھیں جیسے وہ شہید بھگت سنگھ کی بہن ہوں۔

بہن میں نے توشیخو بھائی سے کہہ دیا ہے کہ دشمنوں کو پیٹھ نہ دکھانا آخر پٹھان کا خون ہے۔ میرا بھائی تو رن میں ”بجلی کی طرح چھکے گا۔“

لیکن دوسرے دن دیکھئے تو شیخو میاں لان کی سیڑھیوں پر بیٹھے سیندھی کے نشے میں مست، بیڑی پی رہے تھے۔ پوچھنے پر بڑی شان سے بولے کہ فی الحال تو ان چھوکروں کو بھجوا دیا ہے۔ میں چند دن بعد جاؤں گا۔

اسی دن دو پہر کو، جب سب نوکر چلے گئے تو رضیہ اور بی بی نے مل کر آنگن میں ایک گڑھا کھودا اور اس میں سب زیور روپیہ پیسا رکھ دیا۔ کیوں کہ راشد کہتا تھا کہ اگر لوٹ مار مچی تو ہمارے گھر پر سب کی نظر جائے گی لنگڑی پھوپو نے گڑھے کی مٹی برابر کر کے ایک کروٹن کا گملا لا کر اس گڑھے پر رکھ دیا پھر انھوں نے کھڑے ہونے کے لئے لاٹھی اٹھائی تو لرز کر رہ گئیں۔۔۔

سامنے ایک اجنبی عورت کھڑی تھی۔ لمبی دہلی۔ خوبصورت سی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی۔ سفید ساری پر سیاہ برقع اوڑھے۔ اس کے ساتھ دو تین برس کی ایک سانولی سی بچی تھی۔۔۔

کون ہوتم۔۔۔ ”رضیہ نے گھبرا کے پوچھا۔۔۔ کیوں کہ سب نوکر جاچکے تھے۔ راشد بھی گھر میں نہیں تھا۔ اور آج کل ”سنا تھا کہ سی۔ آئی۔ ڈی والے سب پر نظر رکھے ہوئے تھے۔“

”میں قیصر ہوں۔۔۔ قدم بوسی ممانی جان۔۔۔ آداب عرض۔۔۔ گوہر پھولو۔۔۔“

قیصر۔۔۔؟ ”سب چونک پڑے۔ بی بی بھی کمرے سے باہر نکل آئیں۔ غزل غور سے اسے دیکھنے لگی۔“

یہ قیصر تھی۔۔۔ وہی لمبے بالوں۔ والی لڑکی جس کی لمبی چوٹی کاٹ کے بشیر بیگم نے آنگن میں پھینک دی تھی۔ رضیہ تو اسے دیکھ کر کانپ اٹھی۔۔۔ الہی خیر۔۔۔ سنا ہے یہ تو کمیونسٹوں کی سرغنہ ہے۔ کیا پتہ یہاں کیا لوٹ مار کرنے آئی ہے۔ جانے اس کے ساتھ کتنے غنڈے باہر کھڑے ہوں گے! لنگڑی پھوپو نے بھی شاید یہی بات سوچی۔ اس لیے جھٹ بڑھ کر اسے گلے لگایا۔

ارے قیصر ہے۔۔۔! اتنی بڑی ہوگئی تو۔۔۔ رنگ کیوں اتنا جل گیا۔۔۔ اری تو بڑی بے مروت ہے۔۔۔ ہم سب تجھے اتنا یاد ”کرتے ہیں۔۔۔“

اچھی تو ہے قیصر۔۔۔؟ ”بی بی نے بھی دھڑکتے دل سے کہا۔“

”فاطمہ بیگم کہاں ہیں۔۔۔؟“

جی۔۔۔ میں ذرا چاند سے ملنے آئی ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔“ اس نے سب کو نظر انداز کر کے کہا۔“

چاند سے۔۔۔؟“ اب تو سب اور بھی گھبرائے۔ چاند کی تو اس سے ہمیشہ کی دشمنی رہی ہے۔ جانے آج کیوں ملنا چاہتی ”
ہے۔

ہم نے تو سنا ہے کہ تم نے کسی بندو سے شادی کر لی ہے۔ جنگلوں میں بندوق لیے گھومتی ہو۔ کمیونسٹوں میں مل گئی ”
ہو۔۔۔“ رضیہ نے اب ذرا جرأت کے ساتھ کہا۔

جی ہاں آپ نے صحیح سنا ہے۔“ وہ آکر دالان میں بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئی۔ بچی کو اپنے پاس بٹھالیا۔“

آپ چاہیں تو مجھے ابھی گرفتار کر سکتی ہیں۔“ اس نے مسکرا کے کہا۔“

”آپ کے چا چائے تو میرے سر کی قیمت ایک ہزار مقرر کی ہے۔“

یہ سن کر سب تھر تھر کانپنے لگے کہ وہ چڑیل ان کے گھر پر کوئی مصیبت نہ چھوڑ جائے۔

”تو پھر کیوں آئی ہے یہاں۔ ہم سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔۔۔؟“

ہاں میں جارہی ہوں۔ اپنی بچی چاند کے پاس چھوڑنے آئی ہوں۔ کیوں کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ کرائنتی کے باپ ”
نے مجھ سے کہا ہے کہ اسے میں چاند کو دے آؤں۔

کون ہے اس کا باپ۔۔۔؟“ لنگڑی پھوپو نے غصے میں پوچھا۔“

”سنجیو۔۔۔“

سنجیو۔۔۔؟“ جیسے سب آگ میں جا پڑے۔“

لنگڑی ممانی کو یوں لگا جیسے بشیر بیگم نے ابھی ابھی قیصر کی چوٹی کاٹ کر آنگن میں پھینکی ہے اور قیصر نے
بھپ کر چاند کا کلیجہ چھاڑا ہے۔

ہونہواب واحد حسین نے اپنی حرافہ نواسیوں کو پناہ دے کر اس گھر کو بدنام کر دیا ہے۔ لیکن اب میں حرامی بچے ”
”یہاں پال کر ”ایوان غزل“ کو قحبہ خانہ نہیں بناؤں گی۔

لنگڑی پھوپو کی آواز میں اس وقت بڑا دبدبہ تھا۔ وہ بڑی اونچائی سے بول رہی تھیں۔

”کہاں ہے سنجیو؟ کی لڑکی۔۔۔ یہاں لاؤ۔۔۔ ادھر آؤ قیصر۔“

اپنے کمرے کے دروازے میں چاند پر چھائیں کی طرح کھڑی لرز رہی تھی۔

قیصر آندر گئی تو چاند نے دونوں ہاتھوں میں اسے سمیٹ کو خوب پیار کیا جیسے اب وہ پرانی دشمنی بھلا کر
قیصر سے نئے رشتے استوار کر رہی ہو۔ اور جب اس نے کانپتے ہاتھوں سے بچی کو اٹھا کر سینے سے لگایا تو کسی طرح اپنے
آنسو نہیں روک سکی۔ چاند کی حالت دیکھ کر قیصر بھی رور ہی تھی۔ اور اس کے سفید ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں چپ چاپ
تھامے بیٹھی تھی۔

جب چاند نے بچی کو اٹھا کر سینے سے لگایا تو قیصر کھڑی ہو گئی۔

تو میں جاؤں چاند! ہم دونوں کو کرائنتی کی بڑی فکر تھی۔ لیکن سنجیو نے کہا کہ اسے صرف تم بچاسکو گی۔“ قیصر ”
اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

ہاں میں صرف اسی کو بچا سکوں گی۔“ چاند نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ ”

”کیوں کہ یہی تو وہ خواب ہے جو میں نے دیکھا تھا۔“

قیصر جانے لگی۔ چاند آنکھیں بند کیے کیے اس کے پاؤں کی آہٹ سن کر کہا۔

”پھر کب آؤ گی۔“

کبھی نہیں۔۔۔“ قیصر نے دھیمی آواز میں کہا۔۔۔“

میں انٹر گراؤنڈ ہوں۔ گرفتار ہونے پر مجھے پھانسی دی جائے گی۔۔۔ کرانتی کو بار بار سردی ہوجاتی ہے۔ اسے ذرا ”سی چائے۔۔۔“

اور پھر قیصر جلدی سے باہر آئی تو اس نے بی بی بنگڑی پھوپو اور رضیہ کے منتظر چہروں کو بالکل نہ دیکھا۔۔۔

البتہ پھانک کے پاس غزل نے اسے روک لیا۔۔۔

”آپ کی لڑکی اس گھر میں کیسے رہے گی؟“

ہاں میں جانتی ہوں۔ چاند بچاری تو بس اب مرنے ہی والی ہے۔ لیکن کرانتی کو میں تمہارے والے کر رہی ہوں۔ تم ”غزل ہونا۔۔۔؟“

! غزل گھبرا گئی۔ کرانتی کو وہ کیسے سنبھالے گی

تم بھی اسی خاندان کی روایتوں میں رنگ چکی ہو۔۔۔!“ قیصر نے غزل کو غور سے دیکھا۔

میرا بھائی محاذ پر چلا گیا ہے۔“ غزل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

”آپ کسی طرح اسے بچا کر لے آئے۔“

نہیں۔۔۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے غزل بی بی۔۔۔“ اس نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

بوس پرستوں نے اپنے مفاد کے لیے تمہارے بھائی کو موت کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ اب تم اس کے لیے صبر ”کرتا۔“

نہیں نہیں۔۔۔“ غزل اور زور سے رونے لگی۔

رونا چھوڑ وغزل۔ بلکہ اپنی سی روش بھی بدلو۔۔۔“ قیصر نے اسے گلے لگا کر کہا۔

”!چاند کی طرح مردوں سے کھیلنا چھوڑ دو۔ جسم کے علاوہ دماغ بھی تو ہے تمہارے پاس۔ وہ کیوں نہیں بیچتیں۔“

قیصر سے اتنی صاف صاف باتیں سن کر غزل کو بہت غصہ آیا مگر وہ رونے کے سوا کوئی جواب نہ دے سکی۔

اچھا تو غزل میں جاتی ہوں۔ میری بچی کو ”ایوان غزل“ کی روایتوں سے بچائے رکھنا۔ اور اسے یہ ضرور بتادینا کہ ”اس کی ماں کون تھی! باپ کون تھا۔۔۔“ قیصر نے جلدی سے چہرے پر نقاب ڈالی۔ اور باہر چلی گئی۔

تم اس سے کیا باتیں کر رہی تھیں؟“ رضیہ نے غزل کے پاس آکر پوچھا۔

”ایاز بھائی کو واپس لانے کے لیے کہا۔ مگر وہ کچھ نہیں کرسٹیں۔“

غزل ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی۔

چاند آپا کے کمرے میں گئی تو کرانتی ان کے کاندھے سے لگی لگی سو چکی تھی

قیصر تم سے کیا کہ رہی تھی۔۔۔؟“ چاند نے بڑے اشتیاق سے پوچھا شاید انہیں امید تھی کہ قیصر نے سنجیو آ کی باتیں ” کی ہوں گی۔

سنجیو آماما آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے کرانتی کو بھیجا ہے۔ وہ بھی جلد آئیں گے۔“ اپنے جھوٹ پر غزل کو ” خود تعجب ہو رہا تھا۔

نہیں اب وہ نہیں آئے گا۔۔۔“ چاند نے بستر پر لیٹ کر گرانتی کو اپنے قریب کر لیا۔

”اور اب میں اس کا انتظار نہیں کروں گی۔۔۔“

پھر انہوں نے بڑے غور سے سوتی ہوئی بچی کو دیکھا۔۔

اس کے سانولے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ اس کے گھنے گھنگریالے بالوں کو سمیٹ کر چوما اور آنکھیں بند کر لیں۔

چاند آپا۔۔۔“ غزل چلانے لگی۔

یوں زندوں میں تو چاند کا شمار دو برس سے نہ تھا۔ مگر اس کی موت پر بی بی یوں روئیں جیسے آج پھر ان کی ایک جوان بیٹی مرگئی ہو۔ انہیں بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور وہ پتھر کی مورت بن گئی تھیں۔

کہاں ہے چاند۔۔۔ کہاں ہے چاند۔۔۔؟“ واحد حسین اپنے کمرے سے لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور انہیں کہیں چاند کی سفید ” چادر میں ڈھکی ہوئی لاش نظر نہ آئی۔

کہاں گئی وہ۔۔۔ میرا چاند۔۔۔ میرا بٹا۔۔۔“ وہ سر پیٹ پیٹ کر رور رہے تھے۔۔۔ سارا گھر گم سم تھا۔

رضیہ چھبیس برس کی چاند کو دیکھا تو رونے کی بجائے سر پر پلو سنبھال کر تو بہ کرنے لگی۔ لنگڑی پھوپھو آنے والی عورتوں کے بیچ بیٹھی بین کر رہی تھیں کہ ان کی نواسی کیسی ستی ساوتری کنواری اٹھ گئی۔۔۔ لوگوں نے اسے بد نام کر کے کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔

فوزیہ پچھاڑ میں کھانے والی غزل کو سنبھال رہی تھی۔ غزل کو یوں لگا جیسے آج اس کی ماں پھر مرگئی۔ چاند آپا کو اس نے سب سے زیادہ چاہا تھا۔ وہ اس کا سورج تھیں۔ اس کی زندگی اس وقت چاند کے چہرے پر اس کی وہ مشہور روایتی خوبصورتی پھر لوٹ آئی تھی، جس نے اسے سارے حیدر آباد میں مشہور کر دیا تھا۔ اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر پندرہ سولہ برس والی لڑکیوں کی معصومیت اور شادابی تھی۔ اس کے گلابی ہونٹ کنول کی کچی کلیوں کی طرح پاک لگ رہے تھے اور اس کے نازک سے بدن پر کنوارپنے کا نکھار تھا۔ سفید کفن میں اس کے سیاہ بالوں کی لہریں دارلٹیں کانپ کانپ کر اس کی زندگی کا یقین دلا رہی تھیں اور غزل سوچ رہی تھی ، اس موہنی صورت کو لوگ کیسے مٹی میں ملا دیتے ہیں؟

آخری دیدار کے لیے چاند کی میت جب ”ایوان غزل“ کے بڑے ہال میں رکھی گئی تو وہاں دیواروں پر فریم میں لگے ہوئے تمام شاعر سخت بے چین نظر آنے لگے۔ جیسے عشق کا یہ انجام ان کی شاعری میں کبھی نہ آیا ہو۔

دو گھنٹے کے اندر اندر راشد چاند کو یوں دفنا کر آ گیا جیسے سارا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ اور رضیہ نے فنانل چھڑک کر چاند کا کمرہ خوب دھلوا دیا۔ اس کے تمام کپڑے، میک اپ کا سامان، وائلن اور فوٹوز کا الیم نکال کر کباڑیے کو دے دیا گیا۔ اس سامان سے سارے گھر یوں ناک پر کپڑا رکھ کر بچتا پھر ا جیسے چاند طاعون کی چو بیا تھی۔

کراتی کو غزل نے اپنے کمرے میں لا کر چھپا دیا۔

چاند کے سیوم کے دن جب گھر مہمان بیبیوں سے بھرا ہوا تھا، راشد نے احمد حسین کا خط لا کر سنایا۔ قیصر نے گاؤں کے کئی جاگیرداروں کا قتل کر دیا تھا اس نے احمد حسین کی دولت اور ڈیوڑھی کی بھی نشان وپی کی تھی۔ اس لیے وہ سب جان بچا کر اورنگ آباد آ گئے ہیں۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی نصیر کی منگنی کی رسم ہوگی۔ جس میں حیدر آباد سے سب کو آنا پڑے گا۔

حرام زادی۔۔۔ چڑیل۔۔۔ رضیہ نے دانت کٹکٹا کر کہا۔

ہائے کیسی باتھوں سے نکل گئی۔“ لنگڑی پھوپو نے ہاتھ مل کر کہا۔

”ارے وہ تو خود کہہ رہی تھی کہ میں گرفتار ہونے والی ہوں۔“

”اچھا تو کیا چچی جان راضی ہوگئی۔ غزل سے رسم کرنے پر۔“

فونز میہ نے پوچھا۔

”ہاں مگر رسم ان کی بھانجی سے ہونے والی ہے۔“

راشد نے خط تہہ کرتے ہوئے کہا

ابھی خط رکھ کر راشد باہر گیا تھا کہ خبر آئی اور نگ آباد میں انڈین یونین کی فوجیں داخل ہوگئی ہیں اور بڑی ہولناک تباہی اگنی ہے۔

اب کسی سے ضبط نہ ہو سکا۔ لنگڑی پھوپی تو چھاتی پیٹ کر چلانے لگیں۔۔۔ ”ہائے میرا بھائی۔۔۔ ارے کیسا شاندار کل تھا۔ ہائے میں لٹ گئی لوگو۔۔۔“

اور ان کی آواز میں آواز ملا کر بی بی، رضیہ، غزل اور فوزیہ بھی رورہی تھیں۔ غزل تو غم کے مارے دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ واحد حسین تکیے پر جھکے سر باتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔

شام تک ان کا بلڈ پریشر دو سو سے اوپر تھا اور ان کی ہچکیاں کسی طرح نہ تھمتی تھیں۔ ڈاکٹر پریشان تھے۔ راشد بے !چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سارا گھر انہیں تسلی دے رہا تھا اور سب کہہ رہے تھے کہ یہ خبر انہیں کیوں سنائی

پھر ارشدان کے پاس آبیٹھا اور ادھر ادھر کی باتوں سے دل بہلانے لگا۔

ذرا آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو میں اور نگ آباد ہوں آؤں۔ آپ مجھے سب تفصیل بتائیے کہ چچا جان کی جائیداد ” کہاں کہاں تھی اور کتنی ہے۔۔۔ ڈیوڑھی میں کتنی مالیت کا سامان تھا۔ جو بھی سامان سامان بیچا ہو وہ ذرا امن ہو جائے، تو حیدر ”آباد لے آؤں گا۔“

واحد حسین کی ہچکیاں تھم گئیں اور انہوں نے گردن اٹھا کر راشد کو دیکھا۔

چچا جان کی جائیداد تو بہت ہے۔ لیکن سنا ہے قیصر نے کسانوں کو بڑا سرکش بنادیا ہے۔ مجھ سے تو یہ جھگڑے ”نہیں سنبھالیں گے۔ آپ ہی انہیں ٹھیک کر سکیں گے۔“

واحد حسین نے سرہانے سے رومال ٹٹول کر آنکھیں پونچھ لیں اور راشد کا ہاتھ تھام کر بولے۔

احمد میاں کی جائیداد کا کام اب تمہیں کرتا ہے۔“ اور پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔“

اس کی تو لاکھوں کی جائیداد ہے۔ اجالا بیگم کے پاس ہزاروں روپے کے جواہرات تھے۔ امین گڑھ کی زمین اور دولت ”آباد کے باغات۔۔۔

پھر وہ خود اٹھ کر الماری میں سے پرانے کاغذات نکال لائے اور راشد بہت آہستہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

شام تک واحد حسین کا پریشر نارمل ہو چکا تھا۔

ارے کم بختو۔۔۔ کسی نے میرے بھائی کی روح و دو پیسے کی مٹھائی کا ثواب نہ پہنچایا۔ وہ گھر والوں پر بگڑنے لگے اور خود قرآن شریف لے کر بیٹھ گئی۔

اللہ رکھے کیا ان کے وارث نہیں ہیں۔ خوب دھوم سے فاتحہ کراؤں گی۔“ رضیہ نے بڑی شان سے کہا۔ ان کاموں سے ”نبٹ کر راشد کو کرانتی یاد آئی۔

وہ کہتا۔۔۔ حرامی اولاد۔۔۔ اسے ابھی گھر سے نکالو۔۔۔ ورنہ کہیں حکومت کو خبر ہوگئی تو سب کو پھانسی پر چڑھا دیا ”جائے گا۔“

سب نے اسے ڈھونڈا۔۔۔ دیکھا تو بی بی کرانتی کو سینے سے لگائے بیٹھی رو رہی تھیں جیسے وہی چاند کی یادگار ہو۔ لیکن رضیہ نے جلدی سے کرانتی کو بی بی کی گود سے لے کر کریم کو دیا کہ اس چھوکری کو کہیں پھینک آؤ۔

غزل رو پڑی۔ جیسے آج پھر چاند کا جنازہ اٹھ رہا ہو۔ اس نے مڑ کے دیکھا۔ بی بی ہونٹ بند کئے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ غزل کو غصہ آنے لگا۔ آخر بی بی کب تک چپ رہیں گی! وہ راشد اور رضیہ کو کیوں نہیں ڈانتیں۔ وہ کب تک اس گھر میں اجنبی بنی رہیں گی۔

پھر وہ گیٹ کی طرف بھاگی۔۔۔ کرانتی سڑک پر کھڑی رو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے کرانتی کو گود میں اٹھالیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ رنگما کی جھونپڑی میں گئی۔

”یہ میری بچی ہے۔ اسے تم اپنے پاس رکھ لو۔ میں تھوڑے دنوں بعد آ کر لے جاؤں گی۔“

تمہاری بچی ہے۔۔۔؟“ رنگما نے تعجب سے پوچھا۔۔۔ رنگا ان کے ہاں کی کماٹن تھی۔ اس لیے وہ غزل کے بارے میں ”سب کچھ جانتی تھی۔

”مگر میں اسے کیا کھلاؤں گی بی بی۔۔۔ یہ تو دودھ پیتی ہوگی۔“

اس کا انتظام میں کردوں گی۔ تم فکر مت کرو۔“ وہ جلدی سے بچی کو وہاں بیٹھا کر گھر کی طرف آئی۔“

باہر ملیشیم راشد کی خوشامد کر رہا تھا۔۔۔ ”رات بھر کے لیے میری بیوی اور بہن کو اپنے ہاں رکھ لو۔ ہماری جانوں کو ”خطرہ ہے۔“

میں ابا جان سے پوچھوں گا۔“ راشد نے سرد مہری سے کہا۔“

”ہمارے گھر پر ہی کہیں غنڈ سے چڑھائی نہ کر دیں۔“

پھر اچانک ریڈیو ایک سسکی لے کر خاموش ہو گیا۔

جنگ کی شعلہ پوش خبروں کے بیچ میں یہ دھما کہ گونجنے لگا کہ انڈین یونین کی فوجیں آ رہی ہیں۔

اور سارا حیدر آباد خوف سے لرزنے لگا۔

میرا بھائی۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔ میرا شوہر۔۔۔

ہر گھر سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ عورتیں اپنی چھتوں پر کھڑی ان ننھے سپاہیوں کو پکار رہی تھیں، جو بندوقیں تھا منا نہیں جانتے تھے مگر چند مفاد پرستوں نے ان کے ہاتھ میں جذبات کی لاٹھی تھمادی تھی۔ ہزاروں نوجوانوں کی لاشیں پیڑوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ چٹانوں پر بکھری پڑی تھیں۔ ندیوں میں تیر رہی تھیں۔ ان کی کھلی ہوئی ساکت آنکھیں پو چھو رہی تھیں۔ ”ہم کس کے لیے لڑے۔۔۔؟“

ہوٹل اور بازار سنسان پڑے تھے۔ دکن ریڈیو رک کر پوچھ رہا تھا۔۔۔ یہ کیسا انیائے داتا۔۔۔

رضیہ نے چھت کے اوپر چڑھ کر دیکھا۔۔۔ سارے شہر میں موت کا سناتا چھایا ہوا تھا۔ پھر سامنے خادم علی بیگ کے بنگلے پر ایک ٹرک آکر رکا اور اس میں گھر کا قیمتی سامان رکھا جانے لگا۔

لوگ کہہ رہے تھے کہ خادم علی نے بمبئی سے ایک ڈیکوٹا طیارہ حاصل کر لیا تھا جو انہیں حفاظت کے ساتھ پاکستان لے جائے گا۔

یہ وہی خادم علی بیگ تھے جنہوں نے مجلس اتحاد المسلمین کے جلسوں میں قوم کو اپنا آخری قطرہ خون بہانے کی تعلیم دی تھی۔ ماؤں اور بیویوں کے آگے گڑ گڑائے تھے کہ مادر وطن ان سے قربانی چاہتی ہے۔

آج آپ سب لوگ ہمارے ہاں آ جائیے۔“ اپنی چھت پر سے ملیشمن نے رضیہ سے کہا۔

ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔ ہم تو آپ کے پڑوس میں ہیں۔۔۔“ رضیہ آنسو پونچھتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

شکر ہے آج کل شاہین لندن میں تھا۔ مگر جوان فوزیہ کی وجہ سے رضیہ کے ہوش و حواس غائب تھے۔

سنا ہے گھروں کی خانہ تلاشی بھی ہوگی۔“ راشد سارے گھر میں گھبرایا ہوا پھر رہا تھا۔

ہائے ہائے سو برس کی خود مختاری آج ختم ہو گئی۔“ لنگڑی پھولو یوں ماتم کر رہی تھیں جیسے آج ان کے سر سے تاج اتر گیا۔

کوئی ان سے پوچھے کہ اس خود مختاری میں انہوں نے کتنے عیش کیے غزل نے سوچا۔۔۔ وہ بار بار یاد کرتی کہ ایاز اس وقت کہاں ہوگا۔۔۔ اسے پکا یقین تھا کہ اتنی کم عمری میں ایاز نہیں مر سکتا۔ وہ یقیناً کسی پہاڑی میں چھپ گیا ہوگا یا پھر کسی کمپ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوگا۔ ممکن ہے کسی ہسپتال میں ہو۔۔۔ یا پھر۔۔۔ اور۔۔۔ یا۔۔۔

اور پھر وہ خود ہی رونے لگتی۔ آج کل آنسوؤں کی اتنی فراوانی تھی کہ کوئی کسی کو تسلی دینے نہیں بیٹھتا تھا۔ لنگڑی پھوپھو شیخو بھائی کے لیے رو رہی تھیں۔ رضیہ اپنے بھائیوں کے لیے۔ سنا ہے فوزیہ کا ہونے والا دولہا بھی کسی محاذ پر گیا تھا۔

اب رہا راشد۔ اس کا پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ جیسے آج اس کے سر سے تاج اتر رہا تھا۔

اب جانے کیا ہوگا۔ اور پھر ہریش چندر بھان۔۔۔ ملیشم۔۔۔ اور بروا۔۔۔ پتہ نہیں کون کون اس کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ یہ سب وہ حقیر کیڑے تھے جنہیں وہ پیروں تلے روند دیا کرتا تھا۔ مگر آج خوفناک اڑ دھوں کی طرح اس کے سامنے اکھڑے ہوئے تھے۔ ایسے میں اسے کیا کرنا چاہیے۔۔۔؟ ندرت جنگ کے پوتے اور واحد حسین کے لڑکے کے لیے کیا مناسب ہے۔۔۔ خودکشی۔۔۔ پاکتے کی موت۔۔۔؟

وہ پاگلوں کی طرح سر تھامے سوچ رہا تھا۔

کیا شیخو میاں نے کوئی اطلاع بھیجی۔۔۔ وہ میرے بیٹے کو بھی لے گئے تھے۔“ باہر کوئی عورت کو چھو رہی تھی۔“

اماں کہہ رہی ہیں ابا کو کس پتے پر خط لکھا جائے ؟“ ایک چھوٹی سی لڑکی دروازے میں کھڑی راشد سے پو ” چھو رہی تھی۔

کس پتے پر۔۔۔؟ وہ کیا جواب دے! یہ عورتیں کس قدر رجائی ہوتی ہیں! جانتی ہیں کہ ان کے شوہر بادل کی طرح فضاؤں میں بکھر چکے ہیں۔ لیکن خط بھیجنے کی آس نہیں تو رتیں اور پھر بہت سوچ سمجھ کر راشد پھولوں کا ہار لیے سکندر آباد دوڑا۔۔۔ یونین کی فوجوں کا استقبال کرنے۔۔۔ اور وہاں جانے سے پہلے اس نے عالی جناب جی۔ این چودھری دام ظلکم کے نام ایک درخواست لکھی جس میں نظام کے عہد میں بزنس کرنے والوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ان سے جبراً اتحاد المسلمین میں شرکت کروانے کا حوالہ دے کر موجودہ دور میں انصاف کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

شام کو وہ تھکا ہارا پسینے میں شرابور گھر لوٹا تو اعلیٰ حضرت ریڈیو سے تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے حیدر آباد کے الحاق کی اطلاع دی اور عوام کو صبر و شکر کے ساتھ نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا۔

اعلیٰ حضرت کی آواز پہلی بار ”ایوان غزل“ میں گونج رہی تھی۔ حیدر آباد کے گلی کوچوں میں سنائی دے رہی تھی۔ لوگ چلتے چلتے رک گئے تھے۔ واحد حسین سر جھکائے مودب بنے کھڑے تھے اور سارے گھر کے ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

مگر آج جب دکن ریڈیو خاموش ہوا تو ایم۔ رؤف نے تا ابد اس ریاست کو قائم رکھنے کی دُعا مانگی اور نہ عثمان علی خان کی بصد اجلال سلامتی کے لیے اللہ میاں سے کچھ کہا۔

صبح ہوئی تو گھر میں احمد حسین ، اجالا بیگم اور نصیر کے دسویں کی فاتحہ کرائی گئی۔۔۔ یہ تو ٹھیک سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ سب کب اور کہاں مرے۔ مگر واحد حسین کسی بات میں کمی کرنے کو تیار نہ تھے۔

آج غزل صبح سے رورو کر دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ نصیر اس سے شادی نہیں کرے گا اپ۔ مگر اس کے باوجود نصیر کی موت اسے کسی بھی طرح منظور نہ تھی

میرا بھائی، دل کا بادشاہ تھا، اس کے ہاں ہر کام شاندار ہوتا تھا۔“ لنگڑی پھوپو آنسو پونچھ کر باور چپوں سے نیٹ ” رہی تھیں۔ پانچ سولوگوں کا کھانا تھا آج۔ آخر احمد حسین اتنی جائیداد چھوڑ گئے ، تو ان کی موت مٹی دھوم دھام سے ہونا چاہئیے۔

غزل نے سوچ لیا آج کی رات وہ بھی زہر کھا کے ختم ہو جائے گی۔

ہائے میری اجالا بھابی میں تجھے اپنے ہاتھ سے کفن بھی نہ پہنا سکی۔“ لنگڑی پھوپونے نوحے کا پہلا بول اٹھایا اور ” رشتے دار عورتوں میں ہنس پڑ گئی۔

ارے ظالم نا مراداں ! ہم پر کیسا ظلم توڑ گئے ،ہائے ہائے لاکھ کا گھر خاک ہوا۔“

لنگڑی پھوپو سینہ کوٹ رہی تھیں اور ان کے ساتھ فوزیہ، بی بی اور رضیہ دھاڑیں مار کے رورہی تھیں۔

اندر غزل چپ چاپ لیٹی تھی ، نصیر سے اب اس کی شادی نہیں ہوگی مگر پھر بھی وہ ساری زندگی نصیر کی یاد میں گزارنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن کے معلوم تھا کہ اتنی جلدی آج ہی وہ نصیر کا دسوانکرے گی۔

وہ باہر کی کھڑکی کھول کر دور رنگما کی جھونپڑی کے پاس کھیلنے والی کرانتی کو دیکھنے لگی۔ آج کل سڑکیں سنسان تھیں، ہر گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں، غزل کو بعض وقت ایسا لگتا۔ جیسے وہ ایک طویل بھیانک خواب دیکھ رہی ہو، ابھی آنکھ کھلے گی تو یوں ہی چاند آبا سیاہ جار جٹ کی ساری میں قیامت ڈھاتی ، وائلن پر اپنی سفید انگلیاں رکھے گنگنا رہی ہوں گی۔

شمع جلتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے

شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

امان ناک نہ صاف کرنے پر اس کی پیٹھ پر ایک گھونسہ ماریں گی اور وہ اپنی ننھی پجمیا اوپر کھسکا فوزیہ سے پوچھے گی۔

”تم اتنا کیوں ہنستی ہو۔“

پھر کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کیا۔

اری غزل غضب ہو گیا ، باہر تو آ۔۔۔!“ فوزیہ بدحواسی میں اندر آ کر غزل پر گر پڑی۔“

پھر دونوں باہر دالان میں آئیں۔

راشد ماموں بے ہوش پڑے تھے، بی بی ان پر پانی چھڑک رہی تھیں، رضیہ دیوار سے لگی ساکت ہو چکی تھی اور لنگڑی پھوپھو فیرنی کے کٹوروں پر چاندنی کے ورق لگاتی ہوئی ایک خط کو دیوانہ وار چومے جارہی تھیں ، یا ہر کوئی چلا رہا تھا۔

ذرا واحد نواب کے لیے ٹھنڈا پانی بھجودا یجئے اور ڈاکٹر صاحب سے فون پر کہیے کہ واحد نواب کی تکلیف بڑھ ” گئی ہے۔“

اور مہمان بیبیاں یوں ٹکڑٹکڑ دیکھ رہی تھیں جیسے کسی سحر نے انہیں پتھر کر دیا ہو۔

کیا ہوا۔۔۔ بی بی۔۔۔“ غزل ڈر کے مارے بی بی سے لپٹ گئی ، بی بی نے غور سے غزل کو دیکھا اور وہ بھی اسے ” چمٹ گئیں۔“

پھر انہوں نے لنگڑی پھوپھو سے وہ خط چھین کر غزل کو تھمادیا۔

!برادرم محترم دام بالا احترام۔۔۔

بعد قدم بوسی کے عرض ہے کہ ہم سب خدا کے فضل سے بخیر رہ کر آپ کی خیریت نیک مطلوب، دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کی دُعاؤں سے ہم سب اور ننگ آباد میں بالکل محفوظ ہیں ، غنڈوں کی چڑھائی کی سن گن پا کر میں گھر کا قیمتی اثاثہ یہاں لے آیا تھا۔ اور اب آج ہی شام معہ والدہ نصیر اور نصیر نواب سلمہ، بذریعہ طیارہ پاکستان جارہے ہیں ، جائیداد کا تصفیہ حالات کے پرسکون ہونے پر کر دیا جائے گا۔ آپ سے دور ہو جانے کا از حد قلق ہے لیکن اللہ کا شکر ہے ہم دل سے دور نہیں ہوئے۔ جنابہ بہاوج صاحبہ کی خدمت میں قدم بوسی اور تمام خورد و کلاں دُعا مطالعہ فرمادیں۔ جملہ تمام کی خیریت معلوم کرو۔

فقط

احقر

نواب احمد حسین خان عفی عنہ

خط پڑھ کر غزل نے نظریں اٹھا ئیں تو چاندی کے ورق پھولوں کی طرح چاروں طرف اڑ رہے تھے۔ وہ جلدی سے کمرے میں گئی اور جانماز بچھا کر سجدے میں گر پڑی، اس نے دونوں باہیں پھیلا کے یوں زمین کو تھام لیا جیسے نصیر کی بابوں میں سمٹ آئی ہو، آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے اس نے دیکھا کہ نصیر ہوائی جہاز کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ہر لمحہ اس سے دور ہٹ رہا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں غزل کے دل میں سکون کا ایک چراغ جلنے لگا، کیوں کہ نصیر کی وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں تھی جن میں اس کی جان ہے، اس سے پہلے بھی اس کی زندگی میں کئی مرد آئے تھے مگر نصیر کی طرح دل کی دھڑکن کوئی نہیں بنا۔ وہ تو چار دن کے بعد ہر صورت بھول جاتی تھی، اپنی ہنسی میں خود اپنے وعدے بھلا بیٹھتی مگر نصیر کی یاد کنول کی طرح کبھی نہ ڈوبتی تھی ، حالانکہ اس سے ملنے کی ہر آس ٹوٹتی جارہی تھی۔

پھر واحد حسین کو دیکھنے والا ڈاکٹر راشد کی نبض دیکھنے لگا، لیکن اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ دو انہیں پئیے گا ، جیسے وہ اب جینے سے مایوس ہو چکا ہے، اسے ایک ہی رٹ لگی تھی کہ شاہین کو امریکہ سے جلد بلانا چاہیئے ، پھر اس نے رضیہ سے کہا۔

ہمیں بھی اپنا رویہ پاکستان منتقل کر دینا چاہیئے، کیا پتہ حالات کیسے ہو جا ئیں شاہین واپس آجائے تو ہر بات کا ” فیصلہ کرنا ہوگا۔

راشد ابھی بستر پر ہی لیٹا تھا کہ واحد حسین کو رات میں پھر بارٹ اٹیک ہوا۔۔۔ یہ دوسرا اٹیک تھا۔ راشد نے ڈاکٹر کا پورا بورڈ بٹھایا خوش خبریوں اور امیدوں کے سیکڑوں انجکشن لگائے مگر شام ہوتے ہوتے ان گیارہ بیاضوں کے اشعار دھندلے پڑنے لگے ، جن میں واحد حسین کی دندناتی عشق و ہوس میں ڈوبی جھومتی گاتی شاعری بند تھی۔ وہ اتنی خاموشی سے مر گئے کہ راشد کو یقین نہ آیا۔۔۔ ڈاکٹر آکسیجن کی نلی نکال کر سامان سمیٹتے لگا مگر راشد ابھی تک ان پر جھک دل کی دھڑکن گن رہا تھا ، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ آدمی مر جائے جس نے زندگی کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا، اس کا تو زندگی سے جی کبھی نہیں بھرتا تھا، اس نے پھولوں کو ہنسنا سکھایا تھا، پودوں کو جھومنا۔۔۔ وہ زندگی بھر اپنی ذات میں کھویا رہا، اپنے آس پاس محبت کے پودے اگا تا رہا۔۔۔ وہ جو ایک فرد نہ تھا ” ایوان غزل“ کا نگہبان تھا۔ ایک تہذیب۔۔۔ ایک ایسے دور کو اپنے ساتھ سمیٹ لے گیا جس کی کہانیاں ”ایوان غزل“ میں سنائی جائیں گی ، وہ دور جو آج ختم ہو رہا تھا، اپنا فرض ادا کر چکا تھا۔ سارے گھر میں ،کہرام مچا ہوا تھا، نوکر اور مامائیں اپنی وفاداری جتانے کے لیے سب سے زیادہ چلا رہے تھے

بی بی عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں جو انہوں نے واحد حسین کے کمرے سے راشد اور فوزیہ کی چنیں سنیں۔ غزل لپک کر ان کے پاس پہنچی کہ انہیں سہارا دے مگر بی بی نے بڑے اطمینان کے ساتھ جانماز تہہ کر کے رکھی اور آہستہ آہستہ روتے ہوئے لوگوں کو بٹا کر واحد حسین کے سرہانے آئیں۔

سب دم بخود تھے، چالیس برس کا ساتھ تھا، جانے بی بی آج کتنا روئیں گی۔

مگر انہوں نے مڑ کے اطمینان سے راشد کو تھاما۔

”کیوں روتا ہے تو۔۔۔ وہ نہیں مریں گے۔۔۔ وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتے۔“

اور چپ چاپ دیوار سے لگ کر بیٹھ گئیں۔

صبح تک انہیں رلانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر جب انہوں نے اپنے ہاتھ دیکھے تو اچانک رونے لگیں۔

”میرے ہاتھ خالی ہو گئے۔ میں اب یہاں سے بھاگ جاؤں گی، میری رسی ٹوٹ گئی۔“

اس کے بعد وہ بستر سے نہیں اٹھیں نہ کوئی بات کی۔

کسی نے کہا۔

”پاگل ہیں۔“

کسی ڈاکٹر نے بتایا۔

”برین ہیمریج ہے۔“

دن گزرتے رہے۔۔۔ ایک ہفتہ۔۔۔ دو ہفتے۔۔۔ دو مہینے۔۔۔ بی بی مرثی نہ تھیں۔ زندہ بھی نہ تھیں۔۔۔ زندگی اور موت کے درمیان ایک سانس کا ڈورا باقی تھا۔۔۔ کوئی کہاں تک ڈاکٹروں کو بلائے۔ کتنی آکسیجن دے۔۔۔ کب تک نلیوں سے غذا پہنچائے۔۔۔

گھر میں ان پے در پے حادثوں کی خبر سن کر شاہین واپس آ گیا۔ بڑی بھاری بھاری ڈاکٹری کی ڈگریاں لیے۔ ایک دم وہ چھ فٹ کا ایسا نو جوان بن چکا تھا کہ رضیہ اسے دیکھ کر گھبرائی جارہی تھی۔

شاہین نے بی بی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔۔۔ وہ چار سال تک امریکہ میں انسانی دل پر تجربے کرتا رہا تھا۔ اس نے سیکڑوں انسانوں کے دل چیر کے دیکھے تھے۔۔۔ مگر اپنی دادی کا کیس اسے عجیب سا لگا، اسے پریشان دیکھ کر لنگڑی پھو، ہولناکی ٹیکتی پاس آکھڑی ہوئیں

”بیٹا، یہ کوئی نیا مرض تھوڑی ہے، یہ عورت تو ہمیشہ ہی آنکھیں بند کیے جیے گئی۔“

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب شاہین نے راشد کو یقین دلا دیا کہ اب بی بی زندہ نہیں ہیں۔ غالباً رات سوتے ہی میں کسی وقت انتقال ہو گیا تھا۔۔۔

اب تو ”ایوان غزل“ والے جیسے قبر تک مردے کو پہنچانے کے ماہر ہو چکے تھے۔ ظہر کی نماز تک بی بی کا وجود ”ایوان غزل“ سے مٹ چکا تھا۔۔۔ اور ”ایوان“ غزل کے مرکزی ہال میں لگی ہوئی واحد حسین کی بڑی کی تصویر آنکھیں کھولے یہ بات کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھی۔

بی بی کا جنازہ لے گئے تو غزل کو احساس ہوا کہ وہ کتنی بیکار ہے، ہمایوں نے جب سے سایا کو مسلمان کر کے اس سے نکاح کیا تھا اپنے گھر سے غزل کا قطع تعلق ہو چکا تھا، پھر بھی بی بی کی تدفین میں ہمایوں آیا تو زبردستی اسے گھر لے گیا،

آج تیسرا دن تھا اسٹیج پر ”رام بن باس“ کا

تین دن سے غزل روزانہ سب کے سامنے ایک گڑھے میں دفن ہوتی پھر اسٹیج کا پردہ کھینچ کر لوگ اسے باہر نکال لاتے اسے کچھ خبر نہ ہوتی۔ اسٹیج پر کیا بک رہی ہے، وہ تو بس اس بات کی منتظر رہتی تھی کہ وہ زمین میں سمانے والی سستی سلوتری سے آئے اور اس کوئی باہر نہ نکالے، یہ کیسی دھرتی ما تاتھی جو اسے اپنی چھاتی میں بھی پناہ دینے کو تیار نہ تھی۔

لوگ اس کی اداکاری پر دیوانے ہوئے جارہے تھے، تالیاں پیٹتے پیٹتے راشد کے ہاتھ دکھے جارہے تھے۔

جیسے ہی حالات بدلے راشد نے بھی اپنا چولا بدل لیا تھا، اب شرنارتھیوں کی امداد کے لیے ہر سیاسی پارٹی نے لمبے چوڑے پروگرام بنائے، کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے بھی کئی امدادی اسکیمیں شروع ہوئیں، اس سلسلے میں کچھ کلچرل پروگرام بھی رکھے گئے۔ مگر سرور کو کیا معلوم تھا کہ وہ سرورپے لگا کر جو ”رام بن باس“ اسٹیج کر رہے ہیں وہ ہزاروں روپے کھینچ لائے گا۔ سارا کمال تو غزل کا تھا جو سیتا کے کردار میں گم ہو گئی تھی۔ جب بڑی بے بسی سے وہ دھرتی کی گود میں سمانے کی دُعا مانگتی تو سرور جیسا سخت مزاج انسان بھی کانپ اٹھتا تھا، حالاں کہ اسے مذہبی کہانیوں، خصوصاً عورت کی مظلومی کی کہانیوں سے بڑی نفرت تھی، اس لیے جب ڈرامے کے سلسلے میں کوئی پہلی بار غزل کو لایا تھا تو اس کا جاگتا ہوا اپنے آپ سے باخبر حسن، بے باک لہجہ اور ہر ایک سے بے تکلفی کا انداز سرور کو ذرا اچھانہ لگا تھا، اگرچہ خورشید آپا نے حسب عادت اسے بھی ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی ثابت کیا تھا۔ لیکن جب ایک بڑی بڑی مچھوں والے، دبلے پتلے شخص نے غزل کا باپ بن کر اس کی ایکٹنگ کا بھاؤ تاؤ کیا تو سرور کو یقین ہو گیا کہ وہ لڑکیاں سپلائی کرنے والا کوئی دلال ہے، کہیں شریف باپ، بیٹیوں کے دام لگاتے پھرتے ہیں! تیسرے دن جب آخری بار غزل زمین میں سمانی تو ڈرامے کا سارا کلائمکس غارت ہو گیا اور المناک سین پر رونے والے۔۔۔ لوگ ہنسنے لگے جب غزل نے زمین سے منہ نکال کر چلا نا شروع کیا،

”میرے اوپر اب پتھر بر ساؤ۔ اللہ کے لیے مجھے اب کوئی مت نکالنا۔ میرے اوپر مٹی پھینکو، مجھے سنگسار کر دو۔“

بڑی افراتفری میں پردہ گرایا گیا۔ ہمیش سنہا جو اس ڈرامے کے ڈائریکٹر تھے دوڑے ہوئے آئے۔ سرور بھی اپنے دوستوں کے درمیان سے اٹھ کر اوپر ڈانس پر بھاگا۔

مجھے مار ڈالو۔ میرے اوپر پتھر رکھ دو، تم میں سے کوئی انسان ہے۔“ گڑھے کے اندر سے غزل چلا رہی تھی۔

کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔“ سرور نے پسینے میں شرابور غزل کو ایک کرسی پر بٹھا کے پوچھا۔

دو بجے رات کو جب سرور غزل کو اس کے گھر پہنچانے آیا تو ہمایوں کہیں گیا ہوا تھا، سایا بڑی بیزاری کے ساتھ دروازہ کھولا اور بڑ بڑاتی ہوئی لیٹ گئی۔

لو، اب یہ مرد راتوں کو بھی گھر آنے لگے۔“

غزل ہوش میں آچکی تھی مگر ابھی تک اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جسم بالکل ٹھنڈا تھا اور وہ سسکیوں کے مارے دھل رہی تھی، سرور کو رونے والی عورتوں سے بڑی چڑ تھی مگر اس وقت وہ غزل کی سسکیوں سے سخت پریشان تھا، گڑھے سے اسے نکالتے وقت اچانک اس نے محسوس کیا تھا کہ اس لڑکی میں کوئی خاص بات تھی۔ ایک بے نام سی کشش۔ جو سات بجے سے رات کے دو بجے تک اسے غزل کے ساتھ لیے لیے پھر رہی تھی۔

اب مجھے بتائیے۔ اصل قصہ کیا ہے۔۔۔؟“ غزل کے ہاں آکر کمرے میں بیٹھ گئے تو سرور نے سگریٹ سلگا کے ”پوچھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ لڑکی کہیں سے اغوا کر کے لائی گئی ہے اور وہ خوفناک مچھوں والا آدمی زبر دستی اس سے پیشہ کروا رہا ہے۔

”قصہ کچھ نہیں ہے۔ مجھے یہ بتائیے کہ زمین میں سمانے کا حق صرف سیتا ہی کو تھا۔ میں کیوں نہیں مر سکتی۔۔۔؟“

آپ کیوں مرنا چاہتی ہیں۔۔۔؟“ سرور نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

آپ ابھی بہت کم سن ہیں۔ ابھی آپ کی شادی ہوگی، بچے ہوں گے۔ عورت تو غزل کا مطلع ہے۔ اس پر پچاسوں اشعار ”لکھے جاتے ہیں، ہزار خوبصورت خیالوں کا اضافہ ہوتا ہے۔

شاعری کے نام پر غزل کو نصیر یاد آ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میری شادی اب کبھی نہیں ہوگی۔ جب تک زندہ رہوں گی مجھے اسی طرح ہر روز قبر میں سونا پڑے گا۔“

آپ کی فیس کے لیے اس دن جو صاحب جھگڑا کر رہے تھے وہ واقعی آپ کے ابا میں؟“ سرور نے سرگوشی میں ”پوچھا۔

: اور غزل بھی سوچنے لگی کہ کیا واقعی وہ اس کے ابا ہیں

آپ اتنی مایوس کیوں ہیں۔۔۔؟“ سرور نے غزل کی نشیلی آنکھوں کے سحر سے بچتے ہوئے کہا۔

اس نے اٹھ کر غزل کے آنسو اپنے رومال سے پونچھے۔

بعض وقت انسان حالات کے ہاتھوں وہ کر بیٹھتا ہے جو کرنا نہیں چاہتا مگر اب ایسا نہیں ہوگا، میں آپ کے لیے کچھ ”سوچوں گا، جب کبھی آپ کا دل چاہے مجھ سے آفس پر مل لیجئے گا۔

وہ غزل کے سارے آنسو، سب سسکیاں اپنے رومال میں سمیٹ کر چلا گیا۔

برس کا ہوگا، مگر اس کا انداز کیا ہے، جیسے وہ ۳۲، تئیس ۲۲ پلنگ پر سونے لیٹی تو غزل نے سوچا۔۔۔ وہ بائیس بڑائی کے قطب مینار پر کھڑا ہو اور غزل ننھی سی بچیوں کی طرح اس کے سامنے بیوقوف سی لگتی تھی، اتنی رات گئے اس نے ایک بار بھی تو غزل کے بے سدھ جسم کو نہ ٹٹولا۔ ایک بار بھی اس کے دمکتے ہوئے سرخ گالوں کو نہ چھوا، یہ کیسا انوکھا مرد تھا، غزل نے آج پہلی بار ایک اجنبی مرد ایسا دیکھا تھا جو اس کی جوانی کو بالکل راشد ماموں کی طرح نظر انداز کر رہا تھا، حالانکہ اسے تو دیکھتے ہی مرد اپنی عقل اور صبر دونوں کھو بیٹھتے تھے۔

اب جانے وہ کیا سوچنے والا ہے۔۔۔؟ کیا کرنے والا ہے۔۔۔؟

صبح وہ اٹھی تو حسب توقع ابانے پہلے تو ڈراما غارت کرنے پر خوب ڈانٹیں سنائیں اور پھر آفس جاتے جاتے حکم دیا

”کل میں نے خورشید آپا سے کہا ہے، وہ تیرے فلم اسٹار بننے کے لیے کچھ کریں گی، آج ان کے پاس ہو آنا۔“

چنانچہ اپنی اداسی کو میک اپ میں چھپا کے وہ خورشید آپا کے گھر گئی۔ خورشید آپا بھارت کلامنڈل کی روح رواں تھیں، عمر پچاس سے اوپر ہوگی، مگر ان کی شان لا پرواہی اور موٹا پا دیکھ کر عمر کی بھی ہمت نہ پڑی کہ ان پر وا کرتی، وہ اپنے ڈائی کئے ہوئے بالوں کی نہیں گالوں پر بکھرائے رکھتیں، سگریٹ پینے کی وجہ سے سیاہ ہونٹوں کو لب اسٹک سے چمکائے رکھتیں، نیز نوکیلی پیلی بھوؤں کی کمانیں کھینچی ہوئی اور مصنوعی پلکوں کے تیر چاروں طرف شکار ڈھونڈتے ہوئے، ان کے بھاری بھر کم بدن پر بلاؤز صرف اتنی جگہ ڈھانپتا تھا کہ پولیس انہیں برہنگی کا الزام لگا کر پکڑ نہ لے، ورنہ سب کچھ ہر ایک کے دیکھنے کے لیے کھلا پڑا رہتا۔ جوانی جانے کون سے دشت کی سیاہی میں لٹا چکی تھی، جب دوڑتے ہوئے بانپنے لگیں تو اپنے سے ایک دس برس کم عمر کے احمق کلرک سے بیاہ رچا لیا۔ لوگ اس واقعے کے بڑے لچسپ لطیفے بنا کر سناتے تھے کہ کس طرح ایک دن اچانک خورشید آپا نے رکشا روک کر لطیف صاحب کو پکارا جو سانیکل پر آفس جارہے تھے اور انہیں حکم دیا کہ فوراً مجھ سے نکاح کرلو۔

بھرے بازار کا معاملہ تھا اور پھر خورشید آیا کی دھونس۔ بیچارے سیدھے بھاگے قاضی کی تلاش میں۔ اب ان لطیف صاحب کا صرف ایک کام تھا کہ خورشید آیا کے ہاں شام کو جمع ہونے والے دوستوں کے لیے سگریٹ، شراب اور پان کا انتظام کر دیں اور جب خورشید آیا کو کہیں جانا ہوتا تو رکشالا دیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی کام کرتے لطیف صاحب کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کبھی کسی ڈرامے میں ماں کا کردار ادا کرتے وقت انہیں رات ہو جاتی تو وہ اٹھتے وقت کہتیں۔

”ارے اجڑے صورتو تم کو ذرا تو شرم ہو، میرا مرد میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“

تب یاد آتا کہ ہاں خورشید آیا تو ”مرد والی“ ہیں۔

اسٹیج کے علاوہ ریڈیو ڈراموں میں بھی لڑاکا ساس اور ماں کا کردار اس خوبی سے کرتیں کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے، لیکن ریڈیو ڈراموں میں بڑے ٹھسے کے ساتھ کام کرتیں۔ کیا مجال کہ ریہرسل کے وقت کوئی ڈانرکٹر کا بچہ چوں بول جائے! گالیوں سے اس کا سرمونڈھ کر رکھ دیتیں، ایسی فحش گالیوں کی بوچھاڑ کرتیں کہ ڈھیٹ سے ڈھیٹ مرد بھی شرما جائیں، یوں بھی خورشید آیا کو ادا کاری کوئی کیا کھا کر سکھائے گا! بڑے بڑے بوجھ بھگڑان کے سامنے جھک مارتے تھے۔ اچھے اچھوں کو چٹکیوں میں اڑا تیں۔ ایک دن دیکھیے تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جارہی ہیں، لوگ سوچتے آج جانے کون سا زعفران کا کھیت دیکھ آئی ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ابھی بہن کے انتقال کا ٹیلی گرام ملا ہے، اس غم کو چھپا رہی ہیں۔ یہ سن کر خورشید آیا کا احترام اور بڑھ جاتا۔

ان کا بہت بڑا اور بے حد خوبصورت سجا بنا گھر دراصل ایک چھوٹا سا کلب تھا، ہر شام اونچے طبقے کے آرٹسٹ نما لوگ اور ان سے دلچسپی رکھنے والے بے فکرے یہاں جمع ہوتے تھے، جس کا جی چاہے شراب پیئے، رنڈیاں نچالے، قتل کر دے یا قتل ہو جائے وہ کسی کو نہ روکتیں البتہ روتی صورتیں انہیں ذرا نہ بھاتیں۔۔۔ سچ مچ کان پکڑ کے نکال دیتی تھیں، محبت کرنے والوں کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کا تو انہوں نے ٹھیکہ لے رکھا تھا، کوئی کتنا ہی اجنبی ہو مگر محبت کے نام پر وہ اس کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہو جاتیں، وہ کہتی تھیں کہ عورت کا پڑھایا ہوا نکاح قانون نہیں مانتا اور نہ بہت سے لوگ ان کے سامنے رونی صورتیں لیے نہ پھرتے۔

ویسے راوی کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک قاضی کو مستقل ملازم رکھا تھا جو حیدر آباد کی ہر بھگائی ہوئی لڑکی کا نکاح ان کے ہاں پڑھاتا تھا۔ ویسے خورشید آیا نکاح وکاح کی قائل نہیں تھیں اور انہیں عمر بھر کے لیے گلے پڑنے والی عورتوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی، محبت کرنے والوں کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرتے دیکھ کر بلگرامی کہتا تھا کہ خورشید آیا تو اچھی خاصی ”حکیم اجمل خاں“ ہیں۔ جہاں دو ہزار کے کشتے سے کام نہ بنے وہاں دو پیسے کا چٹکلا بھی آزمائیں علاج کے بارے میں انہوں نے کبھی تعصب سے کام نہیں لیا، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی شامت کے مارے پولیس والے نے ان کے مکان پر بدکاری کا الزام لگاتے ہوئے انہیں گھیرنا چاہا تو خورشید آیا نے فوراً سے کہیں نہ کہیں پھنسوا دیا، اس طرح چند دن بعد وہ! خود بھی ان زندہ دلوں میں بیٹھا خورشید آیا کی خوشامد کرتا نظر آتا، کوئی مذاق تھا خورشید آیا کو چھیڑنا۔۔۔

یہ سارے اونچی ناک والے آفیسرس اور کاروں میں گھومنے والے اکڑتے ہوئے بزنس مین انہیں دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے مگر وہ گالی کے بغیر کسی سے بات نہ کرتیں، جدھر سے گزرتیں ہنسی کے پھول بکھر جاتے۔

غزل ان کے پاس بڑا اچھا موڈ طاری کر کے گئی تھی، مگر جاتے ہی خورشید آیا نے وہ نقاب نوچ پھینکا، انہیں کس لڑکی کے کس اسکیٹل کی خبر نہ تھی کہ بھان اور بلگرامی والی بات چھپی رہتی۔

اب خیریت اسی میں ہے کہ تم بمبئی جا کر کسی فلم کے لیے کام ڈھونڈو، ورنہ یہ مردوے تمہیں دو کوڑی کا کر کے ”چھوڑیں گے۔“

مگر میں کیسے جاؤں گی وہاں۔۔۔؟“ غزل چونک پڑی۔

میں بھجوا دوں گی۔“ انہوں نے بڑے اطمینان سے پان کی ایک گلوری منہ میں رکھ کر کہا۔

غزل چپ ہو گئی۔ خورشید آپا سے زیادہ باتیں کرنے کی ہمت نہ تھی، وہ بھان تک کو بچہ کہہ دیتیں اور بچہ ثابت کر کے رہتی تھیں، پھر آگے کی بات بھی انہوں نے خود ہی سنائی

وہ اپنا بچہ راجہ شیوراج ہے نا! وہ تم پر بری طرح مرتا ہے، کئی بار میرے پاس آیا مگر تم بلگرامی کے چکر میں ”پھنسی ہوئی تھیں۔

غزل جھینپ گئی، خورشید آپا بات کرتیں تو بات کے سارے کپڑے نوچ پھینکتی تھیں، انہیں شاعری کرنے سے بڑی چڑ تھی۔

تو شیوراج کا بمبئی میں بڑا اثر ورسوخ ہے، اس نے کئی لاکھ روپے فلمی بزنس میں لگا رکھا ہے، تم چند دن اس کے ”ساتھ رہ لو تو شاید کوئی چانس مل ہی جائے گا۔

چند دن رہ لوں۔۔۔؟“ غزل نے تعجب سے پوچھا۔

خورشید آپ کے لیے کسی مرد کے ساتھ چند دن رہنا کوئی اہم بات نہیں تھی اور وہ بھی غزل جیسی لڑکی کے لیے جس کے بارے میں وہ سب کچھ جانتیں تھیں۔

اور کیا جی، گوکھاؤ تو ہاتھی کا کہ پیٹ تو بھر لے، ادھر ادھر دھکے کھانے سے اچھا ہے فلمی ہیروئن بن جاؤ تمہارا ”چہر وقت بہت اچھا ہے۔

مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟“ غزل کا جی چاہا کہ خورشید آپا کو خوب کھری کھری سنا دے، کیا انہوں نے اسے ”بالکل ہی طوائف سمجھ رکھا ہے کہ جہاں جی چاہے چلی جائے۔

غزل نے شیوراج کی صورت یاد کی، اکثر ڈرامے ختم ہونے کے بعد وہ بھی پھولوں کا ہار لے کر اسٹیج پر آتا تھا۔

وہ کسی بہت بڑے آفس کا ڈائرکٹر تھا اور بہت بڑی جائداد کا مالک۔ وہ آتا تو لوگ راجہ صاحب راجہ صاحب کہہ کر کھڑے ہو جاتے تھے، شہر میں جیتنے کلچرل فنکشن ہوتے سب اس کی صدارت میں، جب روپے کی کمی پڑتی، سب اسی کی طرف دوڑتے علم و ادب کی سر پرستی اس کے خاندان کی روایت بن چکی تھی، ٹھنگنے سے قد کا گول مٹول۔۔۔ ہر وقت بچوں کی طرح مسکرانے والا بیوقوف سا آدمی چوڑی دار پاجامہ، ٹوئیڈ کی سیاہ شیروانی، مخمل کی ٹوپی اور کام دار سلیم شاہی جوتے پہنے، خوشبوؤں میں بسا ہوا، گھنے بالوں میں جانے کون سی خوشبو دار کریم لگا تا تھا کہ غزل کی نظر میں سب سے پہلے اس کے چمکیلے بالوں پر جاتی تھیں۔ خواتین سے تعلقات بڑھانے اور ان کا احترام کرنے میں مشہور تھا۔ بڑے دھیمے سروں میں بے حد تہذیب کے ساتھ باتیں کرتا اور ہر ایک کی بات پر گردن بلا کر ”جی ہو“، ”بجا ارشاد فرمائے“ کہے جاتا تھا، اب عورتیں اس کے گرد نہ منڈلا ہیں تو کیا کرتیں، سنا ہے چاند پر اس نے ہزاروں خرچ ڈالے تھے اور کئی برسوں ساتھ رہا۔۔۔

خورشید آپا کے گھر کے ہمایوں نے ہزاروں پھیرے کر ڈالے

آخر اس کی کوششیں کام آئیں اور غزل کے لاکھ انکار کرنے پر اور لفٹ نہ دینے کے باوجود شیوراج نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا، وہ روز غزل کے ہاں آدھمکتا، اس کے لیے تحفے لاتا، اسے پارٹیوں میں سینما کے لیے لے جانا چاہتا تھا، جب غزل کسی بات پر تیار نہ ہوئی تو ایک دن اس نے ہمایوں سے کہا کہ وہ غزل کو بمبئی لے جائے گا فلمی ہیروئن بنانے، اس نے تاریخ کے لیے پلین میں سیٹیں بھی ریزرو کروالیں، روتی پیٹتی اور ہمایوں کی لاتیں کے کھاتی ہوئی غزل ایروڈ روم پہنچی تو بری طرح کانپ رہی تھی بات ہمایوں نے ”ایوان غزل“ والوں سے پوری طرح چھپائی تھی کہ اچانک ایک دن غزل کا نام پردہ سیمیں پر میوزک کی جھنکار کے ساتھ دیکھ کر سب حیران رہ جائیں۔ جاتے وقت ہمایوں نے اسے ایک بار

پھر راستے میں خوش رہنے کی تلقین کی۔ پھر جب راجہ صاحب کے سگریٹری نے غزل کے سامان میں ہمایوں کا سامان چھانٹ چھانٹ کے الگ رکھ دیا تو ہمایوں ایر وڈا روم کے کنٹین میں جا گھسا۔

”راجہ صاحب کیا میرے لیے سیٹ ریز رو نہیں کروائی ہے؟“

جی نہیں۔۔۔“ انہوں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کے بڑے اطمینان سے کہا۔

”پھر غزل کیسے جائے گی۔۔۔؟“

”میں جوہوں۔“

ہمایوں کو ذرا سی بھی عقل ہوتی تو یہ جواب سن کر چپ ہو جاتا آخر را جاؤں کے منہ لگنا ہنسی کھیل تھوڑی ہے۔ مگر غزل اور اس کی ماں کو گالیاں دیتے دیتے ہمایوں کی زبان پر دھار رکھ گئی تھی۔ ایک دم غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔

”میں غزل کو اکیلا نہیں بھیج سکتا۔ میں بھی چلوں گا۔“

یہ سن کر شیوراج نے بڑے اطمینان سے سگریٹری کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی اس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ اور اخبار پڑھنے لگے۔ پھر ہوائی جہاز آنے کا اعلان ہوا تو وہ کینٹن سے نکل کر باہر جانے لگے اور غزل ان کے پیچھے پیچھے لپکی۔

راجہ صاحب۔۔۔ راجہ صاحب۔۔۔“ مگر وہ انا فانا پلین کی طرف بڑھ گئے۔ بعد میں نوکر نے بتایا کہ انہوں نے غزل کی ”سیٹ کینسل کر دادی تھی۔ بدین کر غزل و ہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک ہمایوں چپ چاپ کھڑا بابالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا رہا۔ پھر اس نے غزل پر لاتوں اور گھونسوں کی بو چھار کر دی بعد میں وہ روتی ہوئی غزل کو چھوڑ کے باہر آیا اور اپنا سامان ٹیکسی میں رکھوا کے گھر چلا گیا۔

تھوڑی دیر تک تو غزل کو درد کی شدت میں کچھ یاد نہ آیا۔ اس کے دانتوں سے خون بہہ رہا تھا اور گال سوجھ گئے تھے۔ اب وہ کینٹن کے کبین میں اکیلی بیٹھی تھی۔ شیوراج کے ادھ جے سگریٹ سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا اور ان کا پرس میز پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس جانے والے مسافروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ بیرے ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور ایروڈ روم کی جگمگاتی روشنیوں کی پروا کیے بغیر رات تیزی سے نیچے آرہی تھی۔

غزل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائے۔۔۔ اس نے شیوراج کا پرس کھولا۔ اس میں سوسو کے کئی نوٹ تھے۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ تھے۔ ٹیلی فون کے نمبر والی ایک چھوٹی سی ڈائری تھی اور ایک چیک۔۔۔ جلدی سے وہ بٹوا اس نے اپنے پرس میں رکھا اور لاؤنج کی طرف دوڑی۔

”کیا بمبئی کا ہوائی جہاز چلا گیا۔۔۔؟“

”جی ہاں۔“

وہ پھر دھیرے دھیرے بڑے ہال کی ایک کرسی پر آ بیٹھی۔

ٹیکسی میں سامان رکھوانے کے بعد وہ بڑی دیر تک سڑکوں پر گھومتی رہی پھر اس نے سرور کے آفس کے پاس ٹیکسی رکوائی۔ مگر وہ آفس میں نہیں تھا البتہ اس کے کسی دوست نے سرور کا گھر بتایا جو سامنے ہی تھا۔

یہ سرور کا گھر تھا۔ ٹوٹا پھوٹا۔ پرانا دروازہ جس پر پھٹا ہوا ٹاٹ کا پردو لٹک رہا تھا۔ سامنے آنگن کی مدھم سی روشنی میں تین چار بچیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔

آنکھ مچولی کڑوا نیل

!راجہ رانی کا گھوڑا چھوڑتا۔۔۔

اب اس گھر کے اندر جاؤں گی تو وہاں جانے کتنے بکھیڑے پھیلے ہوں گے۔ باہر سے چپ چاپ نظر آنے والے ہر گھر کے اندر کتنے آنسو چھپے ہوتے ہیں۔ کتنی سسکیاں۔ اب پھر ایک کہانی شروع ہو جائے گی۔ سرور کی مفلسی اور عشق کا تٹنا۔ اور ان قصوں سے اسے اب وحشت ہوتی تھی۔ اسی لئے نہ تو وہ شاعری سنتی۔ نہ ناول پڑھتی اسے تو وہ فلم بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ جس میں ہیرو ہیروئن کو عشق کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ہر قدم پر اسے کوئی نہ کوئی مردمل جاتا۔ اپنا دل ہتھیلی پر لیے۔ اس کے ساتھ غزل کو بھی مجبور اُرونا پڑتا۔

”سرور صاحب ہیں۔“

جی ہاں۔۔۔ ایک بچی نے بھاگتے ہوئے کہا۔ آنکھ مچولی۔“

ذرا انہیں بلائیے۔“ غزل نے کھیلتی ہوئی لڑکیوں سے کہا۔“

”انوں سور ہیں۔ آپ اندر جاؤ نا۔ بھڑ و چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔۔۔“

اس نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ دو بھاگتی ہوئی لڑکیاں اس سے الجھ گئیں۔ چور۔۔ چور۔۔

آنگن میں پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ پرانے زمانے کا کھپر یل والا مکان تھا۔ بیچ میں آنگن اور دونوں طرف دالان کو ٹھریاں۔ دالان میں طوطے کا پنجرہ۔۔۔ لٹک رہا تھا۔ آنگن میں مرغیوں کا جھانپہ تھا۔ ایک ٹوٹے ہوئے جھلنگے پلنگ پر چھوٹا سا بچہ سو رہا تھا اور تمام گھر کو ایک پرانے بڑے ام کے پیڑنے اپنے سائے میں چھپا رکھا تھا جو کچی کیریوں سے لدا ہوا تھا۔

اللہ۔۔۔ یہاں تو ایک دنیا آباد تھی۔ وہ سمجھی تھی سرور کنوارا ہے کسی کمرے میں اکیلا رہتا ہوگا۔

”!کون ہے۔۔۔؟ ارے غزل۔۔۔ کیسے آگئیں“

ایک ادھیڑ عمر کے لمبے دبلے پتلے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ تہمند باندھے، میلا بنیان پہنے وہ دری پر بیٹھے بچوں کو پڑھا رہے تھے۔

اب غزل اور گھبرائی۔ یوں آوارہ لڑکیاں کنوارے لڑکوں سے ملنے ایسے گھروں میں چلی آئیں تو قیامت آجاتی ہے۔ پھر دھو یں بھرے سیاہ کمرے سے ایک لمبی دہلی سی عورت بھی باہر آئی میلی ساری سے ہاتھ پونچھتی ہوئی۔ ننگے پاؤں

کون ہو تم۔۔۔؟ کس سے ملنے آئی ہو۔۔۔؟“ غزل کو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سوال ہر طرف گونج رہا ہے۔ زمین سے ”آسمان سے۔ سارے گھر پر سایہ کرنے والے ام کے پیڑ سے۔ مرغیوں کے ڈربے سے۔ طوطے کے پنجرے سے۔

ارے یہ غزل میں بھئی۔۔۔ رضیہ آپا کی نند کی لڑکی۔۔۔ مسکین علی شاہ کی ہوتی۔۔۔ ہمیں نہیں پہچانتی۔۔۔ میں حامد ہوں۔۔۔“ رضیہ کا بھائی۔

حامد بھائی۔۔۔“ غزل کی جان میں جان آئی۔ یہ وہی حامد بھائی تھے جن کی منگنی کی رسم میں وہ رضیہ ممانی کے ساتھ گئی تھی اور وہاں دلہن کے بھائی سے خوب مار کٹائی ہوئی تھی۔

”سرور صاحب یہاں رہتے ہیں؟“

جی ہاں۔۔۔ وہ میرا بھائی ہے۔“ حامد کی بیوی نے اب کی بار بہت خوش ہو کر کہا۔“

آپ سرور کو بھول گئے! جب میری رسم کرنے کے لئے رضیہ آپا کے ساتھ آئے تھے تو سرور کو آپ خوب مارے ” تھے۔

پھر وہ سب ہنس پڑے۔

”اجی دالان میں کیا کھڑے ہیں۔ اندر آؤنا۔“

سارے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ یوں جیسے آج غزل پھر اس گھر کے نصیب جگانے آئی ہے۔ ایک بچی نے جلدی جلدی فرش پر بکھرے ہوئے میلے کپڑے کتا ہیں اور چیلیں بٹائیں۔ حامد بھائی کی بیوی نے ایک سفید چادر میلی دری پر بچھادی۔ اور حامد بھائی کہیں سے ایک ٹوٹا ہوا پنکھا ڈھونڈ لائے۔ مگر غزل ٹھٹک گئی۔ یوں جیسے وہ کسی درگاہ میں داخل ہو رہی ہو۔ اتنی مقدس جگہ۔ اتنی پاک جگہ اپنے گناہ گار پاؤں رکھتے ہوئے وہ کانپ گئی۔

آپ کپڑے پہنیے۔۔۔“ غزل کو زبردستی چادر پر بٹھا کر حامد بھائی کی بیوی نے ان سے کہا۔ ”

”آفس سے آنے کے بعد گرمی کی وجہ سے قمیص بھی نہیں پہنتے۔“

”! اونہ۔ اب استری کی قمیص کیوں خراب کروں“

”غزل بیگم کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ اپنے گھر کی بچی ہے۔“

”بھڑو آنا۔۔۔ بھڑو آ جاؤں۔۔۔؟“

باہر ابھی تک بچیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔

حامد بھائی اپنے بچوں سے کہہ رہے تھے۔

یہ تمہاری بہن ہیں۔۔۔ بھوت بڑی آرٹسٹ ہیں۔ کبھی تم سب کو لے جائیں گے ان کا ڈراما۔۔۔ ہاں تو اب کون سا ڈرامہ ” ہونے والا ہے۔۔۔؟ حامد بھائی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”اللہ جانے۔۔۔؟ اس نے گھبرا کے سامنے دیکھا۔“

سر در نیند سے بوجھل بدن لیے۔ منہ پر بال بکھرائے۔ بنیان اور پینٹ پہنے کمرے سے باہر نکلا اور اس کی جانب دیکھ کر کھل اٹھالو۔۔۔ شروع ہو گیا۔ پہلا سین۔۔۔ اس نے کانپ کر سوچا۔ آخر سرور کے گھر آنے کی کیا تک تھی اجاڑ صورت۔۔۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔

او ہو۔۔۔ آج ہم پر اتنی عنایت۔۔۔؟ آپا اس خوشی میں دو پیالی چائے تو بنا دو۔۔۔“ وہ بھی آکر حامد بھائی کے قریب بیٹھ گیا۔

ہاں ہاں۔ مگر پہلے غزل سے پوچھ لو اتنی گرمی میں چائے پئیں گی یا نہیں۔۔۔“

خوہ مخوہ دودھ شکر ضائع ہو۔“ حامد بھائی نے جلدی سے کہا۔

”نہیں میں چائے نہیں ہوں گی۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

میں ابھی آیا۔“ حامد بھائی اٹھے اور چولہے کے پاس جا کر بیوی سے کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپ کو مکان کیسے مل گیا ہمارا۔۔۔؟“ سرور نے پوچھا۔

اور پھر وہ کچھ جھینپ کر گھبرا کر بولا۔

اچھا ہوا آپ نے میرا گھر بھی دیکھ لیا۔ ہم لوگ بہت ہی معمولی سی زندگی گزارتے ہیں۔ حامد بھائی کو ایک ہزار ”تنخواہ ملتی ہے۔ مگر وہ اپنا مستقبل سنوارنا چاہتے ہیں۔ اسلیے بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ مجھے پارٹی میں کام کرنے کی وجہ سے سرکاری نوکری نہیں ملتی۔ اس لیے ایک اخبار میں کام کرتا ہوں۔ اماں اور بڑی آپا کا انتقال ہو گیا۔ بھائی جان پاکستان چلے گئے۔ اس لیے چھوٹی آپا کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔

اونہ۔۔ غزل بابر کھیلتی ہوئی بچوں کا کھیل دیکھنے لگی۔ سرور کی کہانی میں کوئی بات نئی نہیں تھی۔ یہ تو وہی کہانی تھی جو سرور کی ماں نے حامد بھائی کی رسم کے دن سنائی تھی۔ بیچارے حامد بھائی کتنی مصیبت اٹھا رہے ہیں۔ کتنی خواہشوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ ایک اچھے مستقبل کے لئے جو نہ جانے کب آئے گا

غزل تمہاری بھابی کہہ رہی ہیں آج ہمارے ساتھ کھانا کھالو۔ “ حامد بھائی نے بڑی دیر کے بعد اپنا فیصلہ سنایا۔

نہیں حامد بھائی اب مجھے اجازت دیجئے۔“ وہ گھبراہٹ کے مارے اپنی ساری کے پلو سے پنکھا جھلنے لگی۔

صرف تھوڑی دیر بھی ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتیں!“ سرور نے بڑے دکھ سے کہا۔ اور غزل کا جواب سننے بغیر کہا۔

“میں ابھی کچھ پھل اور مٹھائی لے آتا ہوں۔“

پھر بھابی نے چٹائی سے بنا ہوا ایک گول دستر خوان لا کر بچھایا۔ تمام چینی کی ٹوٹی پھوٹی رکابیاں آئیں۔

کھٹی دال اور خشک۔ یگھارے بینگن۔۔ کھانا دیکھتے ہی سارے بچے بھی اپنی اپنی رکابیاں لے کر آبیٹھے۔ مگر بھابی نے سب کو باہر کر دیا۔

“پہلے مہمان کو کھا لینے دو۔ نہیں بعد میں ملے گا۔“

غزل کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب بھی گھر میں کوئی مہمان آتا تو اس کا یہی حشر ہوتا تھا

“سرور نے خربوزے کی ایک پھانک کاٹ کر اس کی طرف بڑھائی۔“ لو

بس یہ کافی ہے۔۔۔“ اس نے سوچا۔ یہ چھوٹا سا قبر جیسا گھر۔۔۔ دھویں سے بھرا سیاہ باورچی خانہ جہاں دال چاول کے ”علاوہ کچھ نہیں پک سکتا۔ سارا دن وہیں بیٹھے بجھتی چنگاریوں کو بھڑکاتے رہو۔ چاہے باہر کیسے ہی خوبصورت بادل جھوم کر آئیں۔ عثمان ساگر کے پانی میں کتنے ہی سنہرے رو پیلے رنگ گھل جائیں۔“ ایوان غزل“ میں میز کے اوپر سالم مرغ رکھے ہوں۔۔۔ پتھر گٹی کی دوکانوں پر کتان کی ، کنجی ورم کی ساریاں جھلملا رہی ہوں۔۔۔ بھان صاحب کی میز پر جانے میک اپ کا کتنا سامان پڑا ہوگا۔ نشاط نا کیز کے میک اپ روم میں سینا، نور جہاں اور کلو پیٹرا بننے کا سارا سامان رکھا ہے۔ پیلس ٹاکیز کے ہال میں لوگ پردہ اٹھنے کے منتظر ہیں۔ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک جائیں۔ مگر وہ سوئے گی نہیں۔۔۔ ساری رات سرور کا انتظار کیے جائے گی جو شراب کے نشے میں دھت کسی مشاعرے میں غزل پڑھ رہا ہو گا۔ آدھی رات کو کسی اخبار کے دفتر میں بیٹھا خبروں کا ترجمہ کر رہا ہوگا۔

اور کیا چاہیے۔۔۔؟“ سرور نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

“یس۔۔۔ اور کچھ نہیں۔“

با ہر نکل کر اسے جھٹکے میں بٹھانے کے بعد سرور نے کہا۔

“آج مجھے معلوم ہوا کہ تم کون ہو۔“

یہ اور بھی برا ہوا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

! خیر۔۔ میں کل اؤں گا۔۔ تم ”ایوان غزل“ جارہی ہونا“

ہاں۔۔۔“ غزل نے بغیر کسی ارادے کے کہا اور ”ایوان غزل“ پہنچ گئی۔“

دوسرے دن اس نے اپنے تمام نا کردہ گناہوں کی معافی مانگ کر ابا سے گھر آنے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اس پرچے کے دوسری طرف لکھ کر بھیج دیا کہ وہ غزل کو ایروڈ روم پر گاڑھ آئے ہیں۔ ادھر ”ایوان غزل“ میں کوئی اسے نہ پوچھتا تھا۔ صرف بی بی ایک خاموش طرفدار تھیں۔ یا نا ناحضت کے ڈر سے سب اسے برداشت کرتے تھے۔ مگر اب گھر میں رضیہ کی شہنشاہی تھی جہاں وہ اپنے کسی سسرال کے عزیز کو برداشت نہیں کرتی تھیں۔ لیکن راشد ماموں نے جانے کسی مصلحت کے تحت روتی ہوئی غزل کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی مرحوم بہنوں کو یاد کر کے بولے۔

”بس آج سے تم ہمایوں بھائی کے ہاں نہیں جاؤ گی۔ رونا دھونا چھوڑو اور آرام سے رہو۔“

اونگھتے کو ٹھیلنے کا سہارا۔ وہ جاتی بھی کہاں۔۔۔! ادھر کرانتی کی فکر الگ کھانے جارہی تھی۔ کیوں کے رنگماب اسے مفت کھلانے پر تیار نہ تھی۔ خیر اس نے شیوراج کے پرس والے دونوٹ رنگما کو تھما کر اس کا منہ بند کر دیا۔ اور سرور کا انتظار کرتی رہی کہ وہ کسی اخبار میں اسے بھی نوکری دلائے گا۔ مگر سرور نہیں آیا۔۔۔ غزل جانتی تھی کہ اس دن اس کے آنے کے بعد حامد بھائی کے ہاں بڑا ہنگامہ ہوا ہوگا۔ ایسی آوارہ چھوڑیوں سے دوستی بڑھانے پر بھابی نے اسے خوب ڈانٹا ہوگا۔ ممکن ہے سرور خود بھی پچھتایا ہو کہ اس نے غزل کو کیوں منہ لگایا۔ چلو اچھا ہوا۔۔۔ یہ ڈراما اتنی جلدی ختم ہو گیا۔ پھر ایک دن راشد یہ خبر لیے ہوئے آیا کہ حامد بھائی کا انتقال ہو گیا۔ سڑک پار کرتے وقت کسی بس کی زد میں آگئے تھے۔۔۔ نہیں غزل چلا پڑی۔۔۔ حامد بھائی سے زندگی مت چھینو۔۔۔ انہوں نے اپنے مستقبل کے بڑے خوب صورت خواب سجائے ہیں۔ زندگی کا ہر دکھ، ہر کڑواہٹ نگل لی ہے۔ مستقبل میں عیش کرنے کے لیے۔

پھر ایک دن سرور بھی آ گیا۔۔۔ اور اس نے بڑی دیر تک حامد بھائی کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد جیسے اس تکلیف دہ موضوع کو بدلتے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔“

”میرے لیے۔۔ کیا۔۔؟“

ابھی اس دن لنگڑی پھوپھو کہہ رہی تھیں کہ امن کمیٹیوں والے سرکار کے ساتھ مل کر آوارہ لڑکیوں کو پکڑ رہے ہیں۔ انہیں جیل میں ڈال دیتے ہیں۔

ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں تو ہنس بھی نہیں سکتیں مگر حالات نے تمہیں آنسوؤں میں نہلا “

”آپ کو میرے بارے میں کیا کیا معلوم ہے۔“

چھوڑ واس ذکر کو۔۔۔“ اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور ”ایوان غزل“ کے اس شاندار ہال کو دیکھنے لگا۔“

ایوان غزل“ میں عورت کا صرف ایک مصرف رہا ہے۔ مرد کی جنسی تسکین کا ذریعہ۔ میں نے اس ڈیوڑھی کے “ بارے میں بہت سی کہانیاں سنی ہیں۔ “وہ ہال میں لگے ہوئے فو ٹو دیکھ رہا تھا۔

مگر ”ایوان غزل“ نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا۔ یہ تو میرا آخری پناہ گہ ہے۔“ غزل اطمینان سے کرسی پر سر رکھ “ کر بیٹھ گئی۔

ہر مجبور عورت کی آخری پناہ گاہ یہی ہوتی ہے۔“ اس نے سگریٹ کا دھواں با ہر اگلا۔

”خیر۔۔۔ یہ میں نہیں کہوں گا کہ تم اتنے لطیف احساسات کی مالک ہوتے ہوئے کیوں اس گندگی میں پھنس گئیں۔“

سننا چاہتے ہیں کیا آپ۔۔۔؟“ غزل اٹھ کر بیٹھ گئی۔

نہیں۔۔۔“ سرور نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

میں نے ابھی طے کیا ہے کہ آج ہم جو باتیں کریں گے وہ بالکل صاف اور بچی ہوں گی۔ کیوں کہ تمہارے آگے میں ”جھوٹ نہیں بول سکتا۔

غزل کو جیسے کسی نے پیچھے کی طرف دھکا دے دیا۔ صاف اور سچی باتیں؟ مجھ سے۔۔۔؟ تو کیا کہہ دوں میں نصیر کے لیے جی رہی ہوں۔ جب تک یہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے سچ بولنے پر مجبور ہوں۔

میں نے بہت سی خوب صورت عورتوں کو مخاطب کر کے شاعری کی ہے۔ مگر اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے ”میری وہ شاعری جھوٹی ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا سچ۔۔۔ نا قابل فراموش حقیقت صرف تمہارے وجود میں ہے۔

پھر کسی ذہنی بے چینی سے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کو مسل کے پھینک دیا اور میز پر جمی ہوئی گرد کو اپنی انگلی سے صاف کرنے لگا۔

جانے کیوں غزل تم سے بات کرتے وقت میری زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔۔۔ یوں لگتا ہے میرا دم گھٹ جائے گا۔“ وہ سچ ”مج اپنی اکھڑی اکھڑی سانسوں کو ٹھیک کرنے کے لیے رکا۔ پھر غزل کے قریب آیا جو کرسی کے تکیے پر سر رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا تم اجازت دو گی۔ میں کہہ دوں کہ۔۔۔“

نہیں نہیں۔۔۔؟“ غزل کانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ایہ سچ نہیں ہو گا۔ تم نے تو کہا تھا کہ آج صرف سچ بولو گے۔۔۔“

وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے کو ہٹ گئی۔ اسے سارے گھر پر سایہ کیے ہوئے آم کا پیڑ یاد آیا۔ دھویں سے بھری سیاہ کوٹھی۔ پتلی پانی جیسی دال اور ننگے پاؤں دوڑنے والی بھابی اور ننھے ننھے بچے جو خالی رکابیاں تھا مے دروازے میں کھڑے تھے۔ غزل کسی سحر سے پگھلنے لگی۔ آنگن میں سوئے ہوئے بچے کو اٹھانے لپکی۔ مگر سرور کی آواز پر چونک پڑی۔

میں تمہیں اس پرانے گھر میں نہیں لے جاؤں گا۔ تم ”الف لیلہ“ کی شہزادی ہو۔۔۔ میں تمہیں اپنے تخیل کے سنگھاسن پر ”بٹھائے رکھوں گا۔ کوئی دکھ۔۔۔ کوئی تکلیف تم تک نہیں پہنچے گی۔۔۔ تم۔۔۔ تم میری شاعری کی جان ہو گی۔ میرے خوب صورت خیالات کا پرتو۔۔۔

غزل اچانک یوں کرسی پر بیٹھی جیسے کسی نے اسے شوٹ کر دیا ہو۔ ”جان غزل۔۔۔؟ محبوبہ۔۔۔؟ شاعری کی تکمیل کرنے والی۔۔۔؟

غزل کو یوں مایوسی کے ساتھ بیٹھتے دیکھ کر وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

میں جانتا ہوں کہ تمہیں مردوں نے اتنے دھوکے دیے ہیں کہ اب تمہیں کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ لیکن میری شاعری ”میں تم ہمیشہ زندہ۔۔۔

”ہاں، مجھے تم پر بھی اعتبار نہیں ہے۔۔۔“

بعد میں غزل سخت حیران ہوئی کہ یہ بات اس نے اتنی جلدی سرور سے کہہ دی! اس کی تو یہی سب سے بڑی کمزوری رہی تھی۔ کہ وہ کسی مرد کو مایوس نہیں کر سکی۔ اس نے دوسروں کو ذہنی صدمے سے بچانے کے لیے ہمیشہ اپنی جھولی خالی کی۔ مگر وہ محبوبہ بننے کے کھیل سے اکتا چکی تھی۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ سرور اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں پناہ دینے کے خواب دکھائے گا۔ اس پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کا لالچ دے گا جو اس کے گھر پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر وہ تو آج سچ بولنے پر تلا ہوا ہے۔

غزل۔۔۔ ”غزل نے مڑ کے دیکھا سرور سر جھکائے رو رہا تھا۔ بالکل اس احمق لڑکے کی طرح جسے بچپن میں اس نے خوب ٹھو کا تھا۔ غزل کو یوں لگا جیسے سرور ابھی تک وہی چھوٹا سالٹر کا ہے میلی شیروانی پہنے بغیر پھندنے والی ترکی ٹوپی اوڑھے۔“

ہاں۔۔۔ آج تم نے کہا تھا کہ ہم دونوں صرف سچ بولیں گے۔ اور اس سچ کی بدولت تم بال بال بچ گئے۔۔۔ جاؤ اب جا کر ”اس حادثے پر ایک نظم لکھ ڈالو۔۔۔ اور اس چوٹ کو ہمیشہ اپنے دل میں محسوس کرتے رہو۔ میری طرح۔“

غم اور غصہ کے مارے سرور سے کچھ نہ کہا گیا۔۔۔ وہ سر جھکائے بالکل لڑکیوں کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا۔

”پھر کبھی ”ایوان غزل“ او تو ایک بار پھر مجھے سنانا۔۔۔ جان غزل تخیل کی ملکہ۔۔۔ فن کی زندگی۔۔۔“

اور اب کی بار غزل رو پڑی۔۔۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

راشد نے دو ایک بار سرور کو گھر آتے دیکھا تو اس کی بڑی خاطر تواضع کی۔ ویسے بھی مشہور اور بڑے آدمیوں سے دوستی بڑھانے میں وہ ہمیشہ پہل کرتا۔ سرور کی شاعری کی بھی آج کل دھوم مچی ہوئی تھی۔ ہر رسالے میں اس کا نام نظر آتا۔ ہر مشاعرے میں وہ موجود۔ سنا ہے کمیونسٹ ادیبوں نے جواد بی انجمن قائم کی تھی سرور ہی اس کا سکریٹری تھا۔ آج کل تو کمیونسٹوں کا زور تھا۔ اس لیے ایک آدھ شاعر سے بنائے رکھنے ہی میں فائدہ تھا۔ اس لیے غزل سے سرور کی بڑھتی ہوئی دوستی پر راشد نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ رضیہ اور لنگڑی پھوپو بھی یہی سمجھتی رہیں کہ سرور صرف راشد سے ہی ملنے آتا ہے۔

مگر آج سرور کے آنے سے دو ہفتے پہلے حامد بھائی راشد کے ہاں باقاعدہ سرور کا پیغام بھجوا چکے تھے۔ سرخ کاغذ پر لکھی ہوئی اسم نویسی اور اس کے ساتھ سرور کا ایک فوٹو جس میں وہ بی۔ اے کی سند لیے گون پہنے کھڑا تھا۔ سرور کو اس بات کی بالکل خبر نہ تھی۔ بلکہ غزل کو بھی آج فوزیہ نے بتایا کہ گھر میں سب اس رشتے کو پسند کر رہے ہیں اور اب بہت جلد غزل بھی دلہن بنے والی ہے۔

غزل نے سنا تو تھک کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ فوزیہ سے کیا کہے۔ پھر اسے اتنا پریشان دیکھ کر فوزیہ اس کے پاس سرک آئی۔ فوزیہ منجے بیٹھ چکی تھی اور اس کے پیلے کپڑے، چکسے اور ہلدی کی خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

”تمہیں کیا سرور پسند نہیں ہے۔ سنا ہے بہت بڑا شاعر ہے۔“

نہیں۔۔۔ سرور کو میں پسند نہیں ہوں۔ فوزیہ تم راشد ماموں سے کہہ دو کہ آج سرور اس رشتے سے انکار کرنے آیا ”تھا۔ حامد بھائی نے اپنی مرضی سے یہ پیغام بھجوا دیا تھا۔“

کیا۔۔۔ سرور کو تم پسند نہیں ہو۔۔۔؟“ فوزیہ چونک پڑی۔

”کہیں تمہارے بارے میں اسے کچھ معلوم ہو گیا ہو گا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ممانی سے کہہ دو، اس رشتے پر غور نہ کریں۔“

وہاں فرصت بھی کسے تھی غزل کے بارے میں سوچنے کی۔

فوزیہ درزی سے الجھ رہی تھی۔ رضیہ جہیز سنوارنے میں لگی ہوئی تھی راشد شادی کے رقعوں پر نام لکھ رہا تھا۔ سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ فوزیہ کی سہیلیاں دن رات اسے گھیرے بیٹھے تھیں۔

پھاٹک پر نوبت بج رہی تھی اور دالان میں لنگڑی پھوپھو کیوں کے ساتھ ڈھول سنبھالے بیٹی تھیں۔

دلہن میری ساج رہی ماں سنہرے جوڑے سے

دلہن تیرا چاؤ کریں گے تیرے بادوا

روپے پیسے سے۔ ہیرے موتی سے

جانے کیوں گانے گاتے لنگڑی پھوپھو کی آواز کانپ جاتی اور وہ اپنے آنسو پونچھنے لگتی تھیں۔

پھر فوزیہ کا دولہا برات لے کر ”ایوان غزل“ کے پھاٹک پر آیا۔ اندر ہر بونگ مچی ہوئی تھی۔ چمکتی دمکتی عورتیں۔ ہنسی قہقہے۔ بریانی اور مرغ کی خوشبوئیں اور دل پر لکیر ڈالنے والی تیز آواز ہیں۔

بابل مورا شہر چھوٹو جائے۔

سہیلیوں کے بیچ میں دلہن بنی فوزیہ کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ غزل سامنے سہاگ پوڑا کھولے اس کے مہندی لگے ہاتھوں پر افشاں سجاری تھی۔ زیور پہنار ہی تھی۔ میک اپ کر رہی تھی۔

سنا ہے سگریٹ بہت پیتے ہیں۔ میرا تو تمباکو کی بو سے دم الٹنا ہے۔۔۔ زینہ کہہ رہی تھی انہیں سرخ کلر بہت پسند ہے۔

اور پھر اس نے غزل کا ہاتھ تھام کر کہا۔

یہ ڈاکٹر لوگ بڑے بے شرم ہوتے ہیں۔ میں تو تین دن تک آنکھیں نہیں کھولوں گی۔ ”وہ شرم کے مارے غزل پر جھک گئی۔

غزل نے سوچا۔۔۔ میں تو اب کسی مرد کو دیکھ کر کبھی نہیں شرمائوں گی مجھے تو کسی بات پر گھبراہٹ نہیں ہوگی۔

اور پھر جب شاہین اور راشد ماموں فوزیہ سے نکاح کا اقرار کروانے آئے تو فوزیہ کا روتے روتے برا حال تھا۔ زندگی میں پہلی بار فوزیہ نے ایک مرد کی بو جانے کا اقرار کر لیا تھا۔ اب وہ اسی کے لئے جئے گی۔ اس کے لئے مرے گی۔ اس نے اپنی باقی زندگی ایک اجنبی کو سونپ دی تھی۔ پھر بھی فوزیہ رو رہی تھی۔ پاگل۔۔۔ میں ہوتی تو اس خوشی کے مارے مرجاتی۔ کسی ایک کی ہوکر مر جانے کا سکھ کیسا ہوتا ہوگا! مجھے فوزیہ کی زندگی کا ایک ہی لمحہ مل جائے تو۔۔۔

بس کرو کتنا روؤ گی۔۔۔؟“ غزل کی کسی رشتے کی خالہ نے اس کے آنسو پونچھے۔

”بچپن کا ساتھ تھا دونوں کا رضیہ بیگم اب غزل کی شادی کرو۔ بے چاری اکیلی گھبرا رہی ہے۔“

کاش میں اکیلی ہوتی۔۔۔ فوزیہ کی طرح۔۔۔ فوزیہ آج اپنے دولہا کے گھر جائے گی۔ بالکل اکیلی۔۔۔ خالی دل۔۔۔ خالی ذہن لیے۔۔۔ میں کہاں جاؤں گی۔۔۔ کیا کیا لے کر۔۔۔؟

پھر سب کی نگاہ میں غزل پر تھم گئیں۔

ایک دن وہ نابید باجی کے ساتھ پکچر دیکھنے گئی تو ممانی بیگم نے خوب ڈانٹا۔

اب سیر سپاٹے بند کرو۔ آج سے سخت پردہ کرنا ہوگا۔ گھر میں نیا داماد آ گیا ہے۔ میں اپنے گھر کو بد نام نہیں کروں ”
گی۔ جی چاہے تو یہاں رہو ورنہ چلی جاؤ اپنے باپ کے ہاں۔“ بیٹی کی شادی کرتے ہی ممانی بیگم کتنی بدلی ہوئی نظر آ رہی
تھیں۔ پنکھ کاٹنے کے بعد پنچھی سے کہو کہ وہ اڑ جائے تو کون کی ڈال پہ بیٹھے گا ! غزل نے خاموشی سے کپڑے بدلے اور
جھاڑ واٹھا کر آنگن صاف کرنے لگی۔ یوں بھی باہر کون اس کے انتظار میں تارے گن رہا تھا! اس نے جان بوجھ کر چاروں
طرف کے دروازے بند کر لیے تھے۔ اس کے باوجود فوزیہ اپنے دولہا کے ساتھ آتی تو ممانی بیگم غزل کو اندر ڈھکیل کر باہر
سے کنڈی لگا دیتی تھیں۔

خیر ، غزل کو یوں بھی فوزیہ کے دولہا سے بڑی نفرت تھی۔ بے حد مغرور تھا، نک چڑھا۔ آتے ہی سارے گھر کو
بیمار بنا ڈالا تا کہ اپنی ڈاکٹری کا رعب ڈالے۔ اسے فوزیہ کی کوئی ادا نہ بھاتی۔ ہر کپڑے اور زیور میں مین میخ نکالتا۔ ہر وقت
اس کا موڈ ٹھیک کرنے میں لگی رہتی تھی۔ گھر آتے ہی وہ امی کو جنادیتی

امی میٹھے میں کیوڑا مت ڈالنا۔ ڈالڈا گھی مت منگوا نا۔ مرغ روٹ کرواؤ۔۔۔ لنگڑی پھوپو سے کیسے آہستہ بات کریں۔ ”
”انہیں شور و غل پسند نہیں ہے۔

وہ پھر بھی فوزیہ سے شکایت کرتا تھا کہ سسرال میں اس کی کوئی قدر ہی نہیں کرتا۔

اس لئے دو چار مہینے کے بعد کبھی دن بھر کے لیے وہ دونوں آتے تھے تو ساتھ ہی فوزیہ کی ساس کا رقعہ بھی آتا
کہ گذشتہ خراب گھی کھانے سے ان کا بیٹا بیمار ہو گیا تھا۔ اس لیے اسے کھانا نہ کھلایا جائے۔

چنانچہ غزل انتظار ہی میں رہ جاتی کہ فوزیہ سے اس کے دولہا کے ناز نخرے سنے ، مگر فوزیہ کو فرصت ہی نہ
ملتی۔

ایک دن فوزیہ کو رخصت کر کے رضیہ اداس بیٹھی تھی کہ شیخو بھائی ان کے پاس آبیٹھے۔

شیخو بھائی اب اتحاد المسلمین سے نکل کر کانگریس کی امن کمیٹی کے سکریٹری بن گئے تھے اور جگہ جگہ ہندو
مسلم اتحاد کے جلسے کرواتے تھے اور پھر انہوں نے فوجی حکومت کے آگے غدار اور ظالم مسلمانوں کی فہرست پیش کی۔
بتایا کہ کس گھر میں کتنے ہتھیار چھپے ہوئے تھے اور کس ڈیوڑھی میں کتنا سونا گڑا ہوا ہے۔ کون کون اپنی دولت پاکستان
منتقل کر رہا ہے۔ اس لیے شیخو بھائی کے آج کل مزے تھے۔ خوب ٹھاٹھ کی نئی شیر وانی اور ثابت چیلین پہنے گھومتے روز
شام کو نشے میں چور ہاتھ میں چاٹ کا دو نا تھا مے، دالان کی سیڑھیوں پر آبیٹھتے تھے۔ لنگڑی پھوپو نے ان کے یہ ٹھاٹھ باٹ
دیکھے تو ایک بار پھر شیخو بھائی کا گھر بسانے کی فکر پڑ گئی۔

مگر آج شیخو بھائی والان کی سیڑھیاں چڑھ کر او پر تخت تک آگئے تو غزل کو بڑا تعجب ہوا۔ کیوں کہ ان کے حدود
نوکروں کے کوارٹرس سے لے کر دالان کی سیڑھیوں تک مقرر تھے۔ شاید وہ واحد حسین اور بی بی کے بعد اب رضیہ کی
شخصیت کو نظر انداز کر رہے تھے۔

”ہم تو یہ جانتے ہیں دلہن بیگم کہ بیٹی کی شادی ہمیشہ واں کرنا جاں اس کی خدر کرنے والے لوگاہوں۔“

انہوں نے رضیہ کا اداس چہرہ دیکھ کر کہا اور تخت کے کونے پر ٹک گئے۔

”یہ تو قسمت کی بات ہے شیخو بھائی۔ نصیبوں کا لکھا کیسے دیکھیں گے اپن تو بھوت ڈھونڈے اچھا بر۔“

مگر پھر بھی ہمیشہ عورت بیٹی کو واں دینا جاں اس کی خدر کرنے والے ہوں۔ اب جیسے میں ہوں۔ اب آپ میری ”شادی کسی جوان چھوکری سے کر دو۔ دیکھو اس کا مرید بن جاتا ہوں۔

شیخو بھائی کی بات پر رضیہ کوہنسی آگئی اور لنگڑی پھو پر منہ بنا کے بڑبڑانے لگیں۔

”چھچھوری با تاں ہی نہیں جاتے اجاڑ صورت کے۔“

مگر غزل نے دیکھا کہ ممانی بیگم آج بڑی دلچسپی سے شیخو بھائی کی باتیں سن رہی تھیں۔

دو پیر کو ممانی بیگم پھر لنگڑی پھوپھو کے ساتھ بیٹھی سر جوڑے کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر وہی سنجیدگی تھی جو عموماً کسی اہم فیصلے کے وقت خواتین پر چھا جاتی ہے۔

شاہین نے ہاسپٹل جاتے وقت ان دونوں کو یوں چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا تو زور سے ہنس کر بولا۔

”میں نے سن لیا ہے۔ آج ہی شیخو بھائی سے کہتا ہوں کہ تمہاری برائیاں ہو رہی تھیں۔“

”تمہارا کیا بیج ہے جی ہماری باتوں میں۔“

”میرا ہر بات میں بیج ہے۔ مجھے بتائیے آپ کیا باتیں کر رہی تھیں۔“

وہ اپنا بریف کیس رکھ کر ان دونوں کے بیچ میں بیٹھ گیا۔

”جاؤ بابا ہسپتال میں مریض انتظار کر رہے ہوں گے۔“

لنگڑی پھوپھو نے اسے ٹالنا چاہا۔

”ایسی کی تیسری مریضوں کی ، میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ چاہے شام ہو جائے۔“

رضیہ شاہین کی ضد سے واقف تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی بات منوا کے چھوڑتا۔

”اچھا تو سن لو غزل کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں ہم لوگ۔“

یہ ہوئی کوئی بات۔ شاہین نے بریف کیس اٹھایا اور جاتے ہوئے کہا۔

”مگر غزل کے لیے ایسا ضدی اڑیل ٹٹومت ڈھونڈیے جیسا وہ نیم حکیم طاہر کا فوزیہ کے لیے انتخاب کیا ہے۔“

شاہین کو اپنا بہنوئی ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ نہ تو اس کی عادت اطوار اچھے لگتے اور نہ اس کی شیخی اور ڈاکٹری کو وہ کوئی اہمیت دیتا تھا۔ شاہین کہتا طاہر نے یورپ میں صرف عیش کیے ہیں۔

اس کی قابلیت صفر ہے۔ اور طاہر کہتا تھا کہ بی امریکہ میں سات برس رہا ہوں۔ اس لیے شاہین قابلیت میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

غزل نے ان لوگوں کی باتیں سنی تو چونک پڑی۔ فرنیچر صاف کرتے میں اس نے سوچا کہیں بھابی کے ذریعہ پھر سرور نے تو بات شروع نہیں کی ہے۔ میں اس پیغام کو اس کے منہ پر دے مار دوں گی۔ کیا میں اس کھیل کے لیے رہ گئی ہوں۔ سرور میرے بارے میں شاید کچھ نہیں جانتا۔ پھر اس نے سوچ سوچ کر سرور کو ایک خط لکھا۔ اپنے ماضی کے تمام قصے سنائے اور پوچھا کہ اب بھی کیا تم مجھے اپنے گھر میں پھیلے ہوئے پیڑ کی چھاؤں دو گے! کیا میں ایسے پاک گھر میں رہ سکتی ہوں جہاں زندگی صرف صبر و شکر کا نام ہو۔

شام کو وہ خط بند کر کے پوسٹ کرنے والی تھی کہ ممانی بیگم نے لنگڑی پھوپھو سے کہا۔

”مجھے تو غزل اور شیخو بھائی کا جوڑ بہت ہی ٹھیک لگتا ہے۔ دونوں ٹھیک ہو جائیں گے۔“

غزل کے ہاتھ سے لفافہ چھوٹ گرا۔ اور وہ اسی طرح پتھر کی مورت بنی کھڑی رہی۔ اسے یوں گم سم دیکھ کر راشد ماموں گھبرا گئے۔

میں کہتا ہوں رضیہ۔ ذرا اچھی طرح غور کرو۔ غزل اور شیخو بھائی کا بھی کوئی جوڑ ہے! دونوں کی عمر میں ”چالیس سال کا تو فرق ہوگا۔“

بس بس اب آپ چپ بیٹھیے۔“ رضیہ کو غصہ آ گیا۔

تو کوئی جوڑ والا ڈھونڈا ہوتا نا آپ نے۔ ایسے کرتوتوں پر کون قبولے گا۔ ایک تو قبر میں جاسوئی۔ اور چھوٹ دوں ”گی تو اب آپ کی یہ بہابھی ہمیں قبر میں سلا دے گی۔“

خیر خیر۔۔۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ لیکن میں کہتا تھا کہ کوئی اور لڑکا۔۔۔“ راشد کھسیا گیا۔

”ہاں لڑکے تو سڑکوں پر رولتے پھرتے ہیں۔ آپ اپنی بیٹی کے لیے تو ڈھونڈ لاتے ہوتے کوئی اچھا لڑکا۔“

اچھا اچھا۔۔۔ آہستہ بولو۔۔۔ راشد ہار گیا۔

بات یہ ہے راشد میاں۔۔۔“ لنگڑی پھوپھو نے فوراً آ کر مورچہ سنبھال لیا۔

کہ کوئی مردز را سخت مزاج ہو تو اس کی نکیل تھامے۔ ورنہ یہ تو زندگی بھر ایسے ہی جھگڑوں، ٹنٹونمیں پڑی ”رہے گی۔“

راشد نے اب کچھ نہ کیا۔ صرف چاول صاف کرتی ہوئی غزل کو دیکھتا رہا اور غزل کی خاموشی دیکھ کر کچھ مطمئن سا ہو گیا۔

ممکن ہے غزل نے خود ہی شیخو بھائی میں کوئی خوبصورت بات ڈھونڈ لی ہو۔ ورنہ یہ لڑکیاں اپنی مرضی کے بغیر تو کوئی بات نہیں کر سکتیں۔

”اب اپنے لیے بھی دلہن تلاش کرو راشد میاں۔“

لنگڑی پھوپھو نے فوراً راشد کا موڈ بدلنے کے لیے دوسرا موضوع شروع کیا۔

میرا شاہین بابا ماشاء اللہ پڑھ لکھ کر نو کر بھی ہو گیا۔ فوزیہ کے بغیر مجھے تو اب گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ لہٰذا آ ”جائے تو کچھ رونق ہوگی۔“

اجی انہیں کہاں فرصت ہے پھوپھو ان کاموں کی۔“ رضیہ بدستور غصہ میں تھی۔ ”بس یہ تو ایک ہی بات جانتے ہیں کہ ”روپیہ کما ئیں۔ اولاد کی خوشیوں سے انہیں کیا کام۔“

اجی غصہ نکو کرو بیگم صاحب۔ وہ کام بھی کر رہا ہوں۔ ذی شان جاہ کی ہوتی کے لیے رحیمو میاں سے کہا ہے۔ سنا ”ہے لڑکی بی۔ اے پاس ہے۔ ایک لاکھ تو صرف نقد دیں گے۔“

سچی۔۔۔؟“ رضیہ چونک پڑی

ارے اس اجاڑ صورت جل ککڑے رحیمو میاں کا واسطہ چھوڑو۔ میں خود کرامت آپا کے پاس جاؤں گی۔ آخر میرے ”بیٹے میں کیا کمی ہے۔ صورت شکل اور پھر یورپ کی اتنی ڈگریاں۔ سنا ہے ہاسپٹل میں بھی سب اسے پسند کرتے ہیں۔

”مگر شاہین سے بھی تو پہلے پوچھ لو۔“

یہ سن کر سب چپ ہو گئے۔

شاہین بے حد سادہ مزاج تھا۔ خود نمائی اور تکبر نام کو نہیں تھا۔ مگر یورپ سے ضد تھوڑی اور سمیٹ لایا تھا۔ بس وہی کام کرتا جو اسے پسند آتا۔ آتے ہی اس کی راشد سے کئی بار جھڑپ ہوئی۔ وہ بدتمیز منہ پھٹ تو نہ تھا۔ لیکن راشد انتظار کر رہا تھا کہ شاہین آجائے گا تو پاکستان چلے جائیں گے۔ یہاں کا پیسہ وہاں منتقل کر دیں گے۔ شاہین پھر یورپ ہی جا کر دولت کمانے گا۔ یہاں کی نوکریوں میں کیا رکھا ہے۔ مگر شاہین کو پاکستان جانا بالکل پسند نہیں تھا۔

اسے یورپ کی تہذیب سے نفرت تھی۔ وہ تو صرف حیدرآبادی میں رہنا چاہتا تھا۔ اسے دولت کمانے اور جمع کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس وہ ڈاکٹری ہی میں مزید ریسرچ کرنے میں وقت صرف کرنا چاہتا تھا۔ اکلوتا بیٹا اور ایسا اِضدی۔۔۔

راشد نے روپیٹ کر صبر کر لیا۔ جوان قابل اور خود سر بیٹے کے آگے وہ کیا کر سکتے تھے

غزل کو اکیلا کمرے میں بیٹھا دیکھ کر رنگما چپکے سے اندر آ گئی۔

”بی بی۔ وہ بچی کو باہر باغ میں بٹھا کر جارہی ہوں۔ میرا مرداب اسے نہیں رکھنے دے رہا ہے۔“

غزل دوڑی ہوئی گئی۔ کرائنتی بڑے اطمینان سے بیٹھی سوکھے ہوئے پھولوں کی پتیاں چن رہی تھی۔ اتنے دنوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ بال رنگما نے غالباً جوؤں کی وجہ سے منڈا دیے تھے۔ اس لیے اس کی صورت بالکل نہیں پہچانی جارہی تھی۔

غزل نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا تو وہ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے اب کہاں لے جاؤں۔۔۔؟ غزل گھبرانے لگی۔۔۔ اور پھر گیٹ کے اندر کار کو آتے دیکھ کر اس نے کرائنتی کو مرغیوں کے ڈربے میں بٹھا کر کہا۔

”یہاں چپ چاپ بیٹھی رہتا تو میں روٹی لا کر دوں گی۔“

اور پھر آٹھ دن تک اس نے کرائنتی کو مرغی کے خالی کمرے میں چھپا کر رکھا۔ کیوں کہ مرغیوں کا یہ بڑا سا کمرہ نمائزہ ڈیوڑھی کے اس حصے میں تھا جہاں لوگوں کا بہت کم آنا جانا ہوتا تھا۔ مگر بار بار روٹی اور رکابی میں چاول لے جاتے دیکھ کر لنگڑی پھوپو چوکنی ہو گئیں کہ کہیں غزل مرغیوں کے اٹھے تو نہیں چرا رہی ہو۔ ہر بار جب غزل کرائنتی کو روٹی دینے جاتی تھی تو اسے یا تو سڑک کی طرف ہانک دیتی کہ بچوں سے کھیلتی رہو یا پھر شام ہوتی تو مرغیوں کے ڈربے میں بند کر کے کہتی کہ باہر مت نکلنا ورنہ لوگ تجھے مار ڈالیں گے۔

چار برس کی کرائنتی ایسے ہی خطروں میں پیدا ہوئی تھی۔ بندوق کی آواز میں۔۔۔ بھاگ دوڑ۔

کسی غار میں پناہ۔۔۔ روٹی اور پانی کے بغیر صبر کرنا۔۔۔ اسے سب کچھ آتا تھا۔ اب مرغیوں کے ساتھ اندھیرے ڈربے میں روتے روتے سو جانا بھی اس نے سیکھ لیا۔

لیکن لنگڑی پھوپو کو جو تشویش ہوئی تو ایک دن انھوں نے لاٹھی کے سہارے وہاں پہنچ کر مرغیوں کا جھانپا کھولا کہ کتنے انڈے ہیں۔ لیکن وہاں انڈوں میں سے ایک یہ بڑا بچہ بھی نکل آیا تھا۔ ڈر کے مارے ان کی ٹھگھی بندھ گئی اور پھر ان کی چیخیں سن کر سارا گھر اکھٹا ہو گیا۔

رضیہ اور راشد سخت پریشان تھے کہ یہ بلا کہاں سے نازل ہو گئی۔ جانے کس کی بچی ہے اور کس مقصد سے ان کے گھر میں چھپائی گئی ہے۔ فضا خراب تھی کہیں ایسا نہ ہو بچی کے بہانے پولیس گھر پر چھاپہ مارے اور تہ خانے کے اندر چھپے ہوئے تمام راز باہر آ جائیں۔

سب کی چیخ و پکار سن کر وہ بچی بھی ڈر کے مارے رونے لگی اور غزل سے چمٹ گئی۔ اس میں سے مرغیوں کی گندگی کی بد بو آ رہی تھی اور تیز بخار میں کانپ رہی تھی۔

بچی کو غزل کے پاس جاتے دیکھ کر رضیہ کو شبہ ہوا کہ یہ وہی قیصر کی بچی نہ ہو۔ مگر غزل نے بڑی شدومد سے مخالفت کی اور اس بچی کے الگ ہونے کے ہزاروں ثبوت دے ڈالے۔ یہ تک کہا کہ قیصر کی بچی تو ایک برس کی تھی بے حد گوری خوبصورت۔۔۔ اب ان غلاظت میں پڑی ہوئی بچیوں کی صورت شکل کس نے یاد رکھی تھی! اس لیے سب چپ ہو گئے۔

شور سن کر شاہین بھی وہاں آیا۔ اس نے بچی کو چھوا۔ اور اپنے کپڑے بجا کر اسے ہاتھوں میں اٹھا کر اندر لے آیا۔ رضیہ کے قالین پر بچھے ہوئے تخت پر اس گندی بچی کو لٹا کر اس نے دیکھا اور کچھ دوا کھلا کے ایک انجکشن لگا دیا غزل نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جلدی سے ایک پیالی گرم دودھ لے آئی۔

پھر اس نے جملہ حاضرین کو مخاطب کر کے ایک بہترین مکالمہ معہ ایکٹنگ کے شروع کیا۔۔۔

ممائی بیگم۔۔۔ ایک بات سنئیے۔۔۔ رات جب میں نماز پڑھ کر سوئی نا! تو میں نے سچی اس بچی کو خواب میں دیکھا۔ کیا ” دیکھتی ہوں کہ میں ہوں اور اکیلی بیٹھی رو رہی ہوں۔ اتنے میں نانا حضت آئے اور ان کی گود میں یہ بچی ہے۔ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ غزل ہماری امانت ”ایوان غزل“ میں رکھنا۔ پھر تیرے ماموں کی سب فکریں پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ تو پھو پو۔۔۔“ میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ اس خواب کی تعبیر آپ سے پوچھوں۔

شاہین ہاسپٹل جا چکا تھا۔ اس لئے خواب کا بیان سنتے ہی سب کے سر عقیدت سے جھک گئے اور غزل اپنی کامیابی کی خوشی میں اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ یوں بھی اب غزل لنگڑی پھوپو کی بھال بھال بنے والی تھی۔ اس لیے پھوپو سے لے کر رضیہ تک آج کل اس پر بڑے مہربان تھے لہذا لنگڑی پھوپو فوراً اندر گئیں اور اپنی ایک شال لاکرا سے اڑھادی۔

”اجی دلہن بیگم پھر تو پڑا رہے دواس چھو کری کو۔۔۔ شاہین بابا کے بچوں کا دل بہلانے گی۔“

رضیہ نے بھی خواب سن کر پلو سنبھال لیا۔

جانے کس مجبور ماں کی بچی ہے کوئی ہماری سخاوت اور شہرت کا حال سن کر ”ایوان غزل“ میں ڈال گیا ہے۔ اب ” اس کی حفاظت تو اللہ رسول سے ہم پر فرض ہے۔“

شاہین کو اس بات سے قطعی دلچسپی نہیں تھی کہ یہ کس کی بچی ہے اور کہاں سے آئی۔ لیکن جب وہ گھر میں تھی تو دونوں وقت اسے دوا پلانا، بسم اللہ ہی یا غزل سے کہہ کر اس کی صفائی کروانا اس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے۔۔۔؟“

کاتی۔۔۔ اس نے تتلا کر کہا۔

کنیز۔۔۔ کنیز کہہ رہی ہے۔“ غزل نے جلدی سے کہا۔

”ارے ہائے کسی مسلمان کی ہے۔ باپ بچارا سرحد پر مارا گیا ہوگا۔ ماں نے بے سہارا ہو کہ یہاں چھوڑ دیا ہے۔“

رضیہ نے ترس کھا کے کہا۔

”بہر حال۔ پولیس میں اطلاع دیدینا چاہیے تا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“

راشد نے کہا۔ کیوں کہ لاوارث چھو کر یوں کو ڈیوڑھیوں میں پالنا کوئی نئی بات نہ تھی۔

بلکہ میرا تو خیال ہے کہ کل اخباروں میں ایک نیوز دے دوں کہ نواب راشد علی خاں نے بے سہارا بچوں کو پالنے کا ایک کیمپ قائم کیا ہے جہاں ہر مذہب کے بچوں کو پناہ دی جائے گی۔ سنا ہے کانگریسی حکومت ایسے کاموں سے بہت خوش ہوتی ہے۔

میں بھی آپ کے کیمپ میں کام کروں گی۔ راشد ماموں۔“ غزل نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

ہاں بھائی تم ہی ان کی دیکھ بھال کرو۔ رات کو اس نگوڑی ماری کو میرے پلنگ کے نیچے سلا یا کرو۔ لنگڑی پھو ” پونے کہا۔

”کہتے ہیں یتیم بچوں پر رحم کھاؤ تو اللہ ستر گناہ بخش دیتا ہے۔“

”گوہر پھوپھو۔۔۔ آپ نے بھی کوئی گناہ کیا ہے کیا۔۔۔؟“

شاہین کی اس بات پر سب ہنسنے لگے اور لنگڑی پھوپھو کو جانے کیوں رونا آ گیا۔

”ارے یہ کوئی رونے کی بات ہے! یہ تو ہنسنے کی بات ہے۔“

شاہین نے اب غزل سے کہا۔

”اچھا بھئی غزل بیگم۔ اب آپ بتائیے کہ اس بچی کی خدمت کے صلے میں آپ کونسا منافع کمائیں گی؟“

یہ سن کر غزل بھی اپنے آنسو چھپانے اندر بھاگی۔ مگر شاہین ایک ضدی ٹھہرا۔ تھوڑی دیر میں اندر آیا تو غزل کونے میں میٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اپنے تنگ پینٹ کو سمیٹ کر دوہاں اکڑوں بیٹھ گیا۔

”غزل۔ ایک سچی بات بتاؤ۔ کیا کنیز تمہاری کسی حماقت کا نتیجہ ہے۔؟“

شاہین بھائی۔۔۔؟“ وہ شاہین کا ہاتھ پکڑ کے رو پڑی۔ اور پھر روتے سسکتے کرانتی کی پوری کہانی شاہین کو سنا دی۔

دوسرے دن سب ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے کہ ایک بند لفافہ کسی نے کھڑکی میں سے اندر پھینک دیا۔ راشد سخت گھبرایا۔ آجکل شہر میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ آیا ہوا تھا جو ”بنگالی بابو“ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ پہلے ایک خط بھیجتے تھے کہ اتنی رقم فلاں جگہ رکھ دوور نہ جان کی خیر نہیں۔ اور پھر سچ مچ مار ڈالتے تھے۔

اس لئے سب ہی کھانا چھوڑ چھاڑ کھڑے ہو گئے۔ رضیہ نے سب کو منع کیا کہ لفافہ مت کھولو۔ کیا پتہ اندر ہم چھپا ہو۔ مگر کرانتی دوڑتی ہوئی گئی اور لفافہ اٹھا کر اسے پیار کرنے لگی۔

پیو۔۔۔ پیو لو جی۔۔۔؟“ وہ غزال کو لفافہ تھمانے لگی۔

غزل ڈر رہی تھی کہ اس کے کسی پرانے عاشق کو پھر ترنگ نہ آئی ہو۔ اس لئے اس نے کرانتی سے لفافہ لے لیا۔ مگر راشد نے لفافہ کھول ڈالا۔ اور سب کو زور زور سے سنانے لگا۔ خط سنجیو آ کا تھا۔ چاند کے نام۔

صرف چاند

آج سات برس بعد میرا خط دیکھ کر اس پر تھوک مت دینا۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہاری محبت سے بھی اونچا میرا مقصد ہے جو مجھے، اپنی طرف بلا رہا ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میں پوری چاند کو، کبھی حاصل نہیں کر سکوں گا۔

اس وقت بھی نہیں جب تم خود میری بانہوں میں گر جاتی تھیں۔ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیتیں۔ تب بھی میں سوچتا تھا کہ تم ”ایوان غزل“ کی ایک مرصع نظم ہو اور زندگی کی تلخ و سنگین حقیقتوں کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس لئے تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ اس وقت تک۔ جب تک میں اس قابل نہ ہو جاؤں کہ تمہارے نرم و نازک بدن کو زمانے کی بے رحمی سے بچا سکوں۔ مجھے اس راستے میں بڑی مشکلیں ملیں۔ ہر طرف بند دقین تھیں اور ہر موڑ پر خطرے۔ مگر ان خطروں میں گھرنے کے باوجود ہم تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈی چھاؤنڈھونڈ لیتے تھے۔

قیصر مجھے ایک ایسے ہی اندھیرے غار میں ملی تھی جہاں پھانسی کے پھندے ہمارے منتظر تھے۔ ایسے میں ہم ایک دوسرے کے ہو گئے۔ اس میں صرف قیصر کا ایثار تھا کہ وہ ایک ایسے مرد کو قبول کر بیٹھی جو اسے کوئی خوشی تو در کنار، اپنی زندگی کا یقین بھی نہیں دے سکتا تھا ایسے میں کرائنتی ہمارے درمیان آگئی۔ شاید وہ ہمارے عزم کو چیلنج کرنے آئی تھی۔

تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ قیصر جو ہماری اور تمہاری کہانی سے پوری طرح واقف تھی کرائنتی کو اپنے ہاتھوں تمہیں سونپ آئی۔

وہ کہتی تھی کہ کرائنتی بڑی ہوگی تو چاندہی اسے بتا سکے گی کہ اس کے ماں باپ کون تھے۔

اور آج میں بھی تمہیں یہی بات سنائے کے لئے خط لکھ رہا ہوں کیوں کہ کل قیصر کو سکندر آباد جیل میں پھانسی دیدی گئی۔ میں بھی شاید اب زیادہ دنوں روپوش نہ رہ سکوں۔

جب کرائنتی بڑی ہو جائے تو اسے ”ایوان غزل“ کی تاریخ ضرور سنانا۔ کیونکہ وہ قیصر کی کہانی ہے۔ حیدرآباد کی ڈیوڑھیوں میں پلنے والی ہر لونڈی کی کہانی ہے۔ میں کون تھا! یہ بھی کرائنتی کو تم ہی بتا سکتی ہو۔ اچھا تو تمہارے ان سب خوبصورت بچوں کو پیار جو میرے خیالوں کی طرح حسین ہوں گے اور تمہارے اس احمق شوہر کو سلام جو اس غلط فہمی میں ہوگا کہ چاند اس کے پاس ہے۔

آخر میں تمہارے اس بے پناہ حسن کو سلام کرتا ہوں جس نے مجھے ساری دنیا سے محبت کرنا سکھا دیا۔

تمہارا

سنجیوا

اچھا تو یہ وہی حرامی چھوڑی ہے۔ زہر کی پڑیا۔ لنگری پھوپھو اسے مارنے لپکیں۔

”اس لڑکی کو تو فوراً گھر سے نکال دینا پڑے گا ورنہ جانے کیا آفت آ جائے گی۔۔۔“

راشد نے گھبرا کر کہا۔

لیکن یہ مری ہوئی چو بیا تو نہیں ہے کہ اٹھا کر کوڑے میں پھینک دیں۔؟ ”شاہین نے اطمینان سے انڈا کھاتے میں کہا۔“

اور نہیں تو کیا۔؟ ”رضیہ نے جل کر کہا۔“

”یہ تو طاعون کا چوبہا ہے۔ اللہ بچائے اس بدذات سے۔“

رضیہ کا بس چلتا تو ابھی اٹھا کر اس کالی چھوڑی کو سڑک پر پھینک دیتی۔

میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں کہ ایک لاوارث بچی یہاں آگئی ہے اسے لے جائیں۔“ راشد کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا

شابین نے غزل کی طرف دیکھا جو کرانتی کو دونوں ہاتھوں میں تھامے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جیسے کرانتی کے ساتھ اسے بھی سڑک پر پھینک دیے جانے کا حکم ملا ہو۔

لیکن کرانتی کہیں نہیں جائے گی۔ وہ یہیں رہے گی۔“ شابین بڑے اطمینان سے کھانا کھائے گیا۔“

کیا۔۔۔؟“ راشد نے سخت غصے میں کہا۔“

“اس معاملے میں تمہارا کیا بیج ہے۔“

بس ہے۔“ شابین نے نہایت لا پرواہی سے کہا۔“

اور اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہمارے ہاں ایک لڑکی چھپائی گئی ہے تو سارے خاندان کی ناک کٹ جائیگی۔ تمہاری“ ڈاکٹری واکٹری سب دھری رہ جائے گی۔

رہ جائے۔ مزدوری کریں گے۔“ شابین لا پرواہی سے چائے بنانے لگا۔“

“مگر کرانتی کہیں نہیں جائے گی۔ وہ چاند آپا کی یاد گار ہے۔“

انکل بابا۔۔۔“ کرانتی زمین پر بیٹھ کر چیونٹیوں کو مارنے لگی۔“

“وہ چاند کی یادگار ہے تو چاند کے باپ سے کہو اپنی بیٹی کی نشانی یہاں سے لے جائیں۔۔۔“

رضیہ نے اب کی بار ذرا راسخاں سے کہا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شابین سے بحث میں جیتنا مشکل ہے۔

“واہ ہم کیوں انہیں دیں گے۔ کرانتی کو ہم خود پالیں گے۔“

راشد نے رضیہ کی طرف دیکھا اور پھر لنگڑی پھوپھ کی طرف۔ اتنا بڑا چھوٹ کا ڈاکٹر بیٹا سامنے بیٹھا ہو تو آدمی کیسا بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کی پڑھائی پر راشد نے پورے پچاس ہزار خرچ کئے تھے۔ مگر وہ کیسا نکما نکلا۔

عقل اور چالاکی تو اسے چھو کر نہیں گئی تھی۔ بھلا کوئی امریکہ پلیٹ ڈاکٹر گاؤں میں جانے پر اصرار کرے گا! مگر وہ کر رہا تھا۔ اسے ہندوؤں سے ڈر نہیں لگتا تھا اور ہندوستان سے باہر جانے کو تیار نہیں تھا۔ حالانکہ راشد چاہتا تھا کہ وہ یا تو امریکہ لوٹ جائے ورنہ پاکستان چلا جائے۔ مگر وہ حیدر آباد چھوڑنے کو تیار نہیں ہوا۔ رضیہ چاہتی تھی کہ شابین یورپ سے ایک میم بیاہ لائے تا کہ وہ فرنگی پوتے پوتیوں کی دادی کہلائیں۔ مگر وہ ہر بار یہی جواب دیتا کہ امی یورپ کی عورت ہم ہندوستانیوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح راشد نے روپیہ کمانے کی جتنی تجویزیں رکھیں وہ سب کو رد کرتا گیا۔ حیدر آباد میں ہارٹ اسپیشلسٹ اس وقت ایک دو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس لیے راشد نے سوچا تھا کہ شابین ملازمت کے ساتھ ”ایوان غزل“ کے باہر والے حصے میں اپنا پرائیوٹ کلینک بھی کھول لے۔ مگر شابین اس پر بھی تیار نہ ہوا کہ میں بیک وقت اتنے مریضوں پر توجہ نہیں دے سکوں گا۔

اور آج وہ پھر ضد کر رہا تھا کہ کرانتی اسی گھر میں رہے گی ادھر غزل جانے کیوں کرانتی کی اتنی دیوانی تھی۔ جیسے کرانتی اسی کی بیٹی ہو۔ آج بھی غزل نے جلدی سے کہا۔

“ممائی بیگم میں کرانتی کو اپنے کمرے میں چھپائے رکھوں گی۔ آپ اطمینان رکھیے۔“

اور وہ سچ مچ کی ہر وقت اپنے کمرے میں کرانتی کو بند رکھنے لگی۔۔۔ لیکن اب کرانتی بڑی شریر ہو چکی تھی شاہین کے پلائے ہوئے ٹانگوں نے اسے کافی صحت مند بنادیا تھا۔ اس لئے وہ بند دروازے کے کواڑ پیٹ کر چلاتی تھی۔

”گجو آنتی مجھے پیشاب آ رہا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ جلدی درواز کھولے۔“

”چپ حرام زادی۔ اب چپتی ہے یا تیرا گلا گھونٹ دوں۔“

لنگڑی پھوپو کی ڈانٹیں سن کر وہ اور شور مچاتی۔

”چپ حرام زادی بڈھی۔ ابھی آکر تجھے لکڑی سے ماروں گا۔“

ایک دن فوزیہ ”ایوان غزل“ آئی تو اس کے ساتھ اس کی ایک نند ریحانہ بھی آئی۔ ریحانہ پاکستان میں بیابی تھی۔ اجالا بیگم کے خاندان میں۔ اس نے رضیہ لنگڑی پھولو اور غزل کو وہاں کے حالات سنائے اجالا بیگم جتنی جائیداد یہاں چھوڑ گئی تھیں اتنی ہی پاکستان گورنمنٹ سے حاصل کر لی تھی۔ اور پہلے سے زیادہ ٹھاٹ باٹ میں تھیں بی جانی ٹی۔ بی سے مرچکی تھی۔ نصیر پاکستان کا بہت مشہور شاعر بن گیا تھا۔ اور بڑے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ احمد حسین نے پاکستان جاتے ہی دنیا کی تمام رنگینیوں سے توبہ کر لی تھی اور اب داڑھی رکھ کر جماعت اسلامی کے ممبر بن گئے تھے۔ مگر تبلیغی جماعت کا کام کرتے تھے۔ پھر ریحانہ نے کہا۔

ایک بار نصیر بھائی نے شرط لگائی تھی کہ غزل کی شادی کبھی نہیں ہوگی۔۔۔ ؟

کیوں۔۔۔؟“ غزل نے چونک کر پوچھا۔“

میں کیا جانوں!“ ریحانہ لا پرواہی سے کہا۔“

”یہ شاعر لوگ ایسے ہی سر پھرے ہوتے ہیں نا۔۔۔ بس کوئی بات دل میں سوچ لی اور اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

ہاں یہ شاعر سر پھرے ہوتے ہیں۔۔۔ وہ بھی بڑا سر پھرا تھا۔۔۔ جانے کس مجبوری کے تحت اس نے شادی کی ہوگی ”لوگ کہتے ہیں اجالا بیگم بڑی جلاہ ہیں۔۔۔ وہ پہروں روتا ہوگا۔۔۔ راتوں کو مجھے خوابوں میں ڈھونڈتا ہوگا۔۔۔ میری کھوج نے اسے اتنا بڑا شاعر بنادیا۔۔۔ وہ سوچتا ہوگا میں اس کی راہ دیکھ رہی ہوں۔۔۔ دیکھے۔ جاؤں گی۔۔۔ کیونکہ وہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔ جو جالا بیگم کی بہو کے لیے تھی۔۔۔ چاہے وہ دس بچوں کا باپ بن جائے۔۔۔ مگر اسے یقین ہے وہ صرف میرا ہی ہے۔ میں جو اس کے لیے بن باس لیے بیٹھی ہوں۔ زندگی کا زہر گھونٹ گھونٹ پی رہی ہوں۔“

ساری رات غزل نصیر کے خواب دیکھتی رہی۔

مگر صبح شیخو بھائی نے اسے دیکھ کر ایک نہایت فحش قسم کا شعر پڑھا تو اس کا جی چاہا کہ ابھی اس کا نکاح شیخو بھائی سے ہو جائے۔۔۔ تا کہ نصیر ایک دن آئے تو وہ بھی اس زہر کا مزہ چکھے۔۔۔

دوسرے دن شاہین کرانتی کے ساتھ گیند کھیل رہا تھا تو پھاٹک پر بہت سے آدمیوں کا شور ہونے لگا۔ چالیس پچاس آدمی مل کر چلا رہے تھے۔ سب ہی گھبرا کے بھاگے۔ معلوم ہوا محلے کے کچھ ہندو پولیس کو ساتھ لے کر آئے ہیں کہ یہاں ایک ہندو لڑکی کی مسلمانوں نے چھپالی ہے۔ ان لوگوں کی قیادت ملیشمن کر رہا تھا۔

اللہ خیر۔۔۔ غضب ہو گیا۔ اب کیا ہوگا ؟“ رضیہ تھرتھر کانپ رہی تھی۔“

راشد اور شاہین نے ان لوگوں کو بہت سمجھایا کہ کرانتی چاند کی لڑکی ہے اور سنجیو آ سے اس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ مگر پولیس والے نہ مانے اور اس معاملے کی مکمل تحقیق ہونے تک کرانتی کو اپنی تحویل میں رکھنے کے لیے لے گئے۔

خس کم جہاں پاک۔۔۔ رضیہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

چھ سال کی کرانتی بری طرح چلا رہی تھی۔ کیوں کہ وہ پولیس والوں سے بہت ڈرتی تھی۔ اسے روتے دیکھ کر غزل بھی رو رہی تھی۔

کم بخت تھوڑی دیر میں چپ جائے گی۔ اس سلسلے میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ لنگڑی پھوپو نے سب کو ” جتادیا۔

”تو کیا ہم کرانتی کو پولیس کے حوالے کر دیں گے۔؟“

شابین سخت خفا تھا۔

رات بھر غزل روتی رہی۔ اس نے کھانا نہیں کھایا۔

صبح شابین ہاسپٹل جانے سے پہلے کار میں پولیس اسٹیشن گیا۔ معلوم ہوا کہ انتی بندو دھرم سالے میں بٹھا دی گئی ہے۔ لنگڑی پھوپو نے سناتو بڑا اطمینان ہوا۔

اچھا ہوا بندو باپ کی بیٹی بندو دھرم سالے میں پلے۔ اب تم نکورو۔ ننیں تو لوگاں سمجھیں گے تم نے ہی کرانتی کو جنا تھا۔

انہوں نے غزل کو خوب ڈانٹا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ شابین اس قصے کو بھول چکا تھا کہ ایک بار جب سب سو چکے تھے۔ غزل اس کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔

”شابین بھائی۔۔۔ میرا ایک کام کریں گے آپ؟“

کیا کام ہے۔؟“ شابین نے غور کیا کہ غزل شاید کئی دن سے رو رہی تھی۔

”ایک بار مجھے کسی طرح کرانتی کو دکھا دیجئے۔“

دوسرے دن شابین کئی گھنٹوں تک غزل کو کار میں بٹھائے مارا مارا پھرا دو چار پولیس اسٹیشن چھانے۔ پھر کسی منسٹر سے بات ہوئی۔ آخر اس دھرم سالے کا پتہ مل گیا۔

کرانتی بچوں کی قطار میں رکا بی ہاتھ میں لیے کھڑی چلا رہی تھی۔

جلدی کھانا دو نہیں تو اس رکابی سے تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔“ شابین نے دہرم سالے کے منیجر سے الگ لے جا کر ” بات کی۔ ایک ہزار روپے اس کی مٹھی میں دبائے اور کرانتی کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا دیا۔

مگر اب کرانتی کو گھر لے جانا ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے شابین اسے اپنے کلینک لے گیا اور رات کی ڈیوٹی والی نرس کو بلوایا

”یہ ایک لاوارث بچی ہے سسٹر۔۔۔ یہیں رہے گی۔۔۔ تم اس کی حفاظت کرو گی۔“

”ہم کیا کریں گے ڈاکٹر ، یسوع مسیح کریں گا۔“

سسٹر سمجھ گئی یہ لڑکی اس خوبصورت نو عمر ڈاکٹر کی کوئی حماقت ہے

نہیں شاہین انکل۔۔۔ میری رکشا بھگوان کریں گے۔ بری اوم۔ بری اوم تت ست۔“ ننھی سی کرانتی نے شاہین سے کہا۔“

شاہین کو سخت تعجب ہوا۔ صرف ایک مہینے میں دھرم سالے والوں نے کرانتی کو کیسا پکا ہندو بنادیا تھا! راستے بھر وہ شاہین اور غزل کو پاپ اور پن کا فلسفہ سبھاتی رہی۔ اس نے بھجن سنائے اور شاہین کو سمجھایا کہ اس سنسار کی نیو شیو بھگوان نے رکھی تھی۔

بس بس خاموش۔“ غزل نے غصے میں کہا۔“

اور پھر غزل نے نرس سے کہا۔

“اس بچی کو دہرم سالے والوں نے بالکل بند و بنادیا ہے۔ میری تم ذرا اس بات کا خیال رکھنا۔“

“غزل آنتی۔ آپ مجھے بھگوان کرشن کی ایک مورتی لا دیجیے میں اسے اپنے کمرے میں سجاؤں گی۔“

کل سے میں یہاں آکر تمہیں نماز اور قرآن شریف پڑھایا کروں گی۔“ غزل نے اس کی بات آن سنی کر کے کہا۔“

دو تین دن کے بعد غزل نماز سکھانے کی کتاب اور ”یسرن القرآن“ لے کر کلینک گئی تو میری کرانتی کے سینے پر کر اس بنا کر اسے دعا پڑھنا سکھا رہی تھی۔

غزل اسے پڑھانے بیٹھی تو کرانتی سارے کمرے میں پاؤں پٹکتی پھرنے لگی۔

میں اب کچھ بھی نہیں پڑھوں گا۔ کبھی بھگوان مجھے ناش کر دیں گے کبھی یسوع مسیح مجھے معاف نہیں کریں گے۔“

“غزل آنتی یہ اللہ بھگوان اور یسوع مسیح، سب لوگ بچوں کے پیچھے کیوں پڑجاتے ہیں۔۔۔؟

چپ چپ۔۔۔ اللہ کے نام سے بے ادبی نہیں کرتے ایسی باتاں کیے تو اللہ میاں تمہیں دوزخ میں ڈال دیں گے۔“ غزل کو ”

یاد آیا کہ اسے بچپن میں اماں بھی دوزخ کے عذاب سے ڈرایا کرتی تھیں۔

“تو پھر میں اللہ میاں کی تعریف کیوں کروں آنتی۔۔۔؟“

د ہریوں کی اولاد۔۔۔“ غزل نے دل میں سوچا۔“

یہ لڑکی کیسی ضدی ہے۔ کتنی سرکش ہے۔ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے مگر صورت دیکھو تو سنجیو آ یاد آتا ہے۔۔۔ وہی سانولی رنگت۔ سفید دانت۔ بڑی بڑی آنکھیں اور سر پر گھنگریالے بالوں کا جھنڈ۔۔۔ جانے اس آدمی میں کیسا سحر تھا جو چاند جیسی ماہ پارہ کو اس کا دیوانہ بنا گیا تھا۔ وہ سنجیو کا پھینکا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اپنے گالوں سے لگاتیں۔ اس راستے کو سارا دن تکے جاتی تھیں جدھر سے شام کو سنجیو آنے والا تھا۔

اتنے انتظار کے بعد بھی وہ آتا تو چاند کے نشے میں چور بدن اور سولہ سنگار کو نگاہ بھر کے دیکھنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ اسے کسی نہ کسی ضروری کام پر جانا ہوتا۔ اس کی ایک نظر گھڑی پر ہوتی اور ایک چاند پر۔ وہ یوں جلدی جلدی ہنس کر چاند سے باتیں کرتا جیسے کوئی فرض پورا کر رہا ہو۔ پھر جب وہ چاند کو اس کے عاشقونکے جمگھٹے میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا تو چاند ساری دنیا سے منہ موڑ کے اپنی بانہوں میں منہ چھپالیتی تھی۔

وہ تیزی۔۔۔ طراری۔۔۔ دوٹوک بات کرنے کی عادت کرانتی میں بھی آئی تھی۔ وہ کسی بھی بات کے اوپری جمالیاتی پہلو کو بہت کم دیکھتی تھی۔ ہر بات کی اصلیت کی کھوج میں رہتی۔ شاہین اور غزل سے مسلسل سوال کر کے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ”ایوان غزل“ میں نہیں رہ سکتی۔ اس کا کوئی گھر نہیں ہے۔ ماں باپ نہیں ہیں۔ اس لیے اسے چپ چاپ میر یسٹر کی ہر

بات مان لینا چاہیے۔ مگر وہ میری سسٹر کی کوئی بات نہ مانتی۔۔۔ روز صبح جب شاہین کلینک آتا تھا تو میری نہایت مظلوم صورت بنائے کرانتی کے جرائم کی رپورٹ سناتی۔

انے ہم کو گالی دیا۔۔۔ ہماری بیر کی بوتل توڑ دیا۔۔۔ رات کو کھانا نہیں کھایا۔۔۔ دوا پھینک دیا، اندھیرے میں اکیلا سڑک پر چلا گیا۔۔۔

”اچھا۔۔۔ آج میں اسے ڈانٹوں گا۔“

مگر شاہین جانتا تھا کہ کرانتی کی رگوں میں دوڑنے والا خون ڈانٹیں نہیں سنا کرتا۔

برسات شروع ہوچکی تھی۔

حیدر آباد کی برسات کہ آج شام کو بارش ہوئی تو کل بھی اس وقت ہوگی اور پرسوں بھی اسی وقت آ جاتی۔

شاہین باہر جانا چاہتا تھا مگر بار بار آسمان کو دیکھ کر پلٹ آیا اور ور انڈے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر صبح کے پڑھے ہوئے اخبار ایک بار پھر پڑھنے بیٹھ گیا۔

آداب عرض کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ مزار تشریف...؟ شیخو میاں اوپر آئے اور جھک کر نہایت جاگیردارانہ انداز میں سلام کیا۔

او ہوشیخو بھائی آج کد ہر آنکلے اتنی بارش میں۔ “شاہین شیخو بھائی کو بھولا نہیں تھا۔ کیوں کہ شیخو بھائی گھر ” کے ہر بجے کو یاد تھے۔

دو گڑمہ پی کر رات کو آیا کرتے تھے۔ نوکروں والی کوٹھری میں رات کو سویا کرتے۔ اور گھر کی کوئی نہ کوئی چیز لے کر فرار ہو جایا کرتے تھے۔ اس لیے ایک ان کہے فرمان کے بموجب ان کا داخلہ آنگن والے دروازے تک محدود تھا۔ شیخو بھائی بھی اپنے حدود سے واقف تھے۔ اس لیے جب کبھی بھوک یا پانی سے مجبور ہو کر انہیں لنگڑی پھوپو کو بلا نا ہوتا تو وہ دروازے سے ہی چلاتے تھے۔

مگر آج شیخو بھائی کو ورانڈے میں آنے کی اجازت کیسے مل گئی ! شاہین کو تعجب تھا۔

“اور سنائیے شیخو بھائی آپ کی سیاسی سرگرمیوں کا کیا حال ہے ؟ ”

اجی کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب... خوم کی خاطر بڑی مصیبتاں اٹھانا پڑ رہی ہیں۔ مسلمانان بچارے کتنے برباد ہو گئے ہیں۔ ”

“انہیں بچانا اب ہمارا کام ہے۔

شیخو بھائی شروع ہو گئے۔

دیکھو بابا... اب تک دس خاندانوں کو ان کی دولت کے ساتھ پاکستان بھجوادیا ہوں۔ صرف نواب عظیم الدین خاں دس ” لاکھ روپے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ادھر غریب مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہم نے کیمپ لگائے ہیں۔ انڈین گورنمنٹ نے مجھے ”اس کا گتہ دیا ہے۔ اس واسطے شاہین بابا آج کل اپن تو مزے میں ہیں۔

“ارے ہٹاؤ شیخو بھائی ان باتوں کو۔ کچھ اور سناؤ آج کل گڑ مہے کا کیا بھاؤ ہے...؟”

بابا... شیخو بھائی ہنسنے لگے۔ ”کیا ڈاکٹر پاشا کبھی ایک روپیہ بھی نہیں دیتے کہ شیخو بھائی آج ہماری طرف سے ”

“اپنے منہ کا مزہ بدل لے۔

لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ خودکشی کریں۔ گڑمہ تو آپ کے لیے زہر ہے۔ “شاہین اچانک ڈاکٹر بن بیٹھا۔

ا جی چھوڑو میاں... زہر تو جانے کہاں کہاں ہے۔ آپ زہر پھیلنے سے کیسے روکیں گے...؟ “ شیخو بھائی نے غزل ” کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

“! چھوٹے نواب۔ آپ کی ڈیوڑھی میں جوز ہر پھیل گیا ہے اس کا کیا علاج کریں گے ڈاکٹر صاحب”

شاہین نے نظریں اٹھائیں۔ غزل اندر کمرے میں دروازے کا سہارا لیے کھڑی تھی کسی سوچ میں کر ڈوبی ہوئی... شاہین نے سوچا اس زہر کا خوف شیخو میاں پر بھی طاری ہے۔ یہ زہر جو خود شیخو میاں کی زندگی میں پھیل گیا ہے جو لنگڑی پھوپو کی جوانی کو راکھ کر گیا... جو

بی بی کو عمر قید کی سزا دلا چکا ہے۔۔۔ چاند کو قبر میں سلا گیا۔ اور آج غزل بن کر ”ایوان غزل“ میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ زہر کہاں سے آیا۔۔۔ شاہین کے ڈاکٹر ذہن نے اس وجہ کو تلاش کرنا شروع کیا جو ”ایوان غزل“ کو بلا چکی تھی۔۔۔ کوئی ایسی بات ہوتی رہی جو اس ڈیوڑھی کی عورتوں کو زندگی سے مسلسل الرجی ہوتی گئی۔۔۔ دولت۔۔۔ شاہین نے جیسے زمین کی تہوں میں کچھ کھوجتے ہوئے سوچا۔ دولت جود کن کے جاگیرداروں کے لیے امرت بھی تھی اور زہر بھی۔۔۔ انہوں نے زندگی بھر اس امرت کو پیا اور اسی کے ایک گھونٹ نے ان کا کام تمام کر دیا۔۔۔ ”ایوان غزل“ کے مکینوں نے دولت کے پیڑا گائے۔۔۔ دولت کے شامیانے اپنی قبروں پر تان دیئے۔۔۔ مگر ”ایوان غزل“ کے بڑے ہال ”بیت الغزل“ میں ان حضرات کے جو فوٹو لگے ہوئے تھے ان میں وہ دولت مند نہیں تھے۔ صرف شاعر تھے۔ شاعری۔۔۔ جس نے ان سب کو زندگی بھر بیکرار رکھا۔۔۔ وہ محبوبہ کی ایک ادھر اپنی زندگی کے داؤ لگاتے رہے۔۔۔ انہوں نے ہر محبوبہ کو یقین دلایا کہ وہ دل کے ساتھ جان بھی اس کی نذر کر رہے ہیں اور اس کے لیے وفا۔ یقین اور رفاقت کے تحفے لا رہے ہیں۔ وہ بچاری کھڑی ہے۔۔۔ منتظر آنکھوں میں حیرانیاں سمیٹے۔۔۔

آج غزل کے چہرے پر کیسی موبنی تھی۔۔۔ دل میں برجھی کی انی بن کر چبھنے والی کشش۔۔۔ جانے کیوں اس وقت شاہین کو غزل بھی چاند آیا معلوم ہونے لگی بھی بی بی۔۔۔ کوئی بات ضرور تھی جو ادھر دیکھ کر دنیا اندھیری اندھیری سی لگتی ہے جانے آج شاہین کی آنکھوں کو کچھ ہو گیا تھا یا پھر یہ خون کا اثر تھا جو شاہین کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ ورنہ یورپ میں پانچ برس گزار کے اس نے بھی عورت کے حسن کے سارے مزے چکھے تھے۔ وہ اپنے دادا الکتھر دادا کی طرح اتناثر سا ہوا نہ تھا کہ حسن کی ایک جھلک پر دیوان سیاہ کرنے بیٹھ جاتا مگر آج اسے لگا کہ غزل میں کوئی بات ضرور ہے جو زہر کی طرح مرد کے جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔

نصیر چچانے بچاری کو بڑا دھوکہ دیا۔۔۔ ان سب مردوں نے اسے مراد یا جن کے پیچھے دو بھاگتی رہی۔

بچپن میں غزل کیسی تیز طرار تھی کہ دنیا بھر کو چلانے والا شاہین بھی اس کے آگے مات کھا جاتا تھا۔ اس نے شاہین کو رنگین فوٹو والی کہانیاں چبانے کا گر سکھایا تھا۔ نالے الانگھنے کا۔ کھانے پینے کی چیزیں چرانے کا۔ ابا کے سامنے جھوٹ بولنے کا۔۔۔ شاہین کے سامنے بہت پرانے دن پھیلنے لگے جب غزل ناشتے کی میز پر جی بھر کے بڑوسنے کے بعد نیچے گرے ہوئے چاول اٹھا کر کھاتی تھی۔ دانت اور منہ دھوئے بغیر ناشتے کی میز پر آ بیٹھتی تھی۔ بغیر چڈی پہنے کھیلتی۔۔۔ اور ہر بات پر اسے ہنسی آتی تھی۔۔۔ مگر اب تو وہ ہر وقت بس آنسو ہی پوچھتی نظر آتی ہے۔ شاہین کی بچپن سے عادت تھی غزل کو چھیڑنے اور جلانے کی۔ مگر اب وہ جوابی حملہ کرنے کی بجائے ٹھنڈی سانس لے کر منہ پھیر لیتی تھی۔

آپ کو گھبراؤ ڈاکٹر صاحب۔۔۔ یہ زہر پینے کو اب میں تیار ہوں۔“ شیخو بھائی نے اسے یوں سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔

”چار چوٹ کی مار دے تو ایک دن میں سیدھی ہو جائے گی۔“

کون۔۔۔؟“ شاہین نے چونک کر پوچھا۔

یہی غزالہ بیگم۔۔۔ میں بھی جانے دو بول کے کر لے رہا ہوں۔ کیا کروں؟ راشد نواب کے سرکا بوجھ بھی تو کچھ کم کرتا ہے نا۔۔۔؟

کیا آپ کر رہے ہیں غزل سے شادی۔۔۔؟“ شاہین چونک پڑا۔

سچی بات کو کیا ہے۔ میں تو راضی نہیں ہوں میاں۔۔۔ مگر راشد دولن بولے تو اب انکار کیسے کرنا۔

”آپ ہی بولو۔۔۔؟“

شیخو بھائی چلے گئے تو وہ سیدھا امی کے پاس پہنچا۔

”امی کچھ دن کے لیے فوزیہ کو بلا لیجیے۔ غزل کی خاموشی سے تو میرا گھر میں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔“

اب اپنی دلہن سے جی بہلانا بابا۔۔۔“ لنگڑی پھوپو نے آنکھیں مٹکا کر بڑے ناز سے کہا۔ زندگی میں ایسے موقعے بہت ” کم آتے تھے جب لنگڑی پھوپو مسکرانے لگیں۔

”ایسی چاندی دلہن ڈھونڈ رہی ہوں کہ اس کی صورت تکے جانا۔“

ار تو بہ۔۔۔ صرف دیکھنے کے قابل دلہن ہوگی۔۔۔؟ ارے بھائی امی آپ کہیں میری دلہن کا انتخاب لنگڑی پھوپو کو مت ” سونپ دینا۔ اگر صورت ہی دیکھنا ہے تو میں غزل کا ایک اسٹیجو بنالوں گا۔“ اس بات پر سب ہی ہنس پڑے۔ سوائے غزل کے جو زیادہ سنجیدہ ہو کر سینے کی مشین پر جھکی اپنے جہیز کے کپڑے ہی رہی تھی۔

اور نہیں تو کیا۔۔۔ غزل کی بولنے والی کل تو بگڑ ہی چکی ہے۔ اب تو وہ اپنے آپ کو خود ہی پتھر کا مجسمہ بنا رہی ” ہے۔“

مرد اتنے احمق کسی وقت نہیں ہوتے ، جتنے وہ کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتے وقت ہوجاتے ہیں۔ اب ذرا دیکھئے تو کہ اتنی بارش طوفان کی پر شور دو پہر اور شاہین جیسا تجربہ کار ڈاکٹر جس نے عورت کا ہزار بار ڈس ایکشن کیا تھا مگر پھر بھی اسے غزل میں آج کوئی ایسی چیز نظر آ رہی تھی کہ وہ مسلسل دو گھنٹے تک اپنی امی سے غزل کے ٹاپک پر باتیں کرتا رہا۔ وہ بھی اس طرح کہ اس کی نظر میں صرف غزل پر تھیں۔ مشین چلاتے ہوئے اس کے خوب صورت ہاتھوں پر۔ بندلیوں پر۔۔۔ اداس آنکھوں پر اور ان الجھے الجھے تیل سے بے نیاز بالوں پر جنہوں نے اس کے چہرے کی دل کشی کو اور بڑھادیا تھا۔

اس دن بچارے دل کے درد اور بلڈ پریشر کے مارے ہوئے مریض گھنٹوں کلینک میں بیٹھے کراہتے رہے۔ صبح کا اخبار یوں ہی پڑا رہا اور راشد بار بار اندر باہر گھوم گھوم کر کے شاہین کو یاد دلاتا رہا کہ اب اٹھ کر کلینک جاؤ۔ مریض انتظار کر رہے ہوں گے۔ یورپ جانے اور ڈاکٹر بننے کے باوجود اس لڑکے کو وقت کی قدر کرنا نہیں آئی۔ بھلا کسی اتنے مشہور ڈاکٹر کے پاس اتنا فضول وقت ہوگا کہ وہ محض گپ بازی میں دو گھنٹے گزار دے۔ رات کو گیارہ بجے جب مریضوں کو نبتا کر شاہین گھر لوٹا تو غزل شیخو بھائی کا کھانا میز پر رکھے جاگ رہی تھی۔ کیوں کہ لنگڑی پھوپو کا حکم تھا کہ جب تک شیخو آ کر کھانا نہ کھالیں غزل کو جاگتے رہنا چاہیے۔

”آج کل شیخو بھائی کی بڑی خاطر مدارت ہو رہی ہے۔ کیا جنت میں بنگلہ ریز رو کر وانے کا ارادہ کر لیا ہے“

یہ سنتے ہی غزل میز پر جھک کر رونے لگی۔ سب سوچکے تھے۔ بارش اور سردی کی وجہ سے لنگڑی پھوپو نے بھی اپنا کمرہ بند کر لیا تھا۔ باہر بارش کا شور مچا ہوا تھا۔ اس وقت شیخو بھائی کسی نالی میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔ اس لیے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ ورنہ غزل کا رونا اور شاہین کا پہلی بار سے ہا ہوں میں بھر کے سمجھانا۔ جانے کیا غضب ڈھاتا۔ رضیہ نے تو اسے دو پہر ہی ڈانٹ دیا تھا کہ غزل جیسی آوارہ چھوڑیوں کے مسائل پر اسے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے ایک زہر کا انجکشن دید و شاہین بھائی اگر تم کو مجھ سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو اپنے کلینک سے میرے ” لیے تھوڑا سا زہر لا دو۔“

مگر کیوں گجو۔۔۔ تم نے کوئی قصور نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اور چاند آپا کو گھر والوں نے مارا ” ہے۔“

نہیں مجھے کسی نے نہیں مارا۔۔۔“ اس نے شاہین کے ہاتھ اپنے کاندھوں سے ہٹا کر کہا۔ ”

”میں خود مرنا چاہتی ہوں۔“

کیوں۔۔۔؟ دُنیا سے ڈرتی ہو۔۔۔؟“ شاہین کے ہاتھ اب اس کے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے گالوں پر تھے۔ اور اس نے غزل ” کا چہرہ اوپر اٹھا رکھا تھا۔

اب دُنیا میرا اور کیا بگاڑے گی جو دنیا سے ڈروں۔۔۔؟ میں صرف شیخو بھائی سے ڈرتی ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس پر ”غشی سی چھانی لگی۔

اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ اس کے بستر پر لٹا کے انجکشن دیا اور کمرے کا دروازہ بھیڑ کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دوسرے دن ”ایوان غزل“ میں بڑا پر شور طوفان آیا۔

شاہین نے اپنی شخصیت کی تمام اہمیت کو سمیٹ کر کھانے کی میز پر اعلان کیا کہ وہ غزل کی شادی شیخو بھائی سے نہیں ہونے دے گا۔

تم ابھی بچہ ہو۔۔۔ تم گھر کے معاملات کو کیا جانو۔ ہم جو ٹھیک سمجھیں گے وہ کریں گے۔“

رضیہ بھی شاہین کی ماں تھی بہت بڑے باپ کی بیٹی اور ”ایوان غزل“ کی ملکہ۔۔۔

”نہیں آپ ایسا نہیں کر سکیں گی۔“

رضیہ کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گرا۔ راشد نے اپنے آدھے سفید اور آدھے سیاہ بالوں کی لٹیں ہٹا کر شاہین کو بڑے غور سے دیکھا اور روٹی کے ہزاروں ٹکڑے کر پھینکے۔ وہ شاہین کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

”اگر آپ نے شیخو بھائی کی شادی غزل سے کی تو میں غزل کو زہر دے دوں گا۔“

اور اگر تم پھر اس بیچ میں بولے تو میں زہر کھالوں گی۔۔۔“ رضیہ نے بھی غصے میں گرج کر کہا۔ پھر سب چپ ہو گئے۔ گیلی لکڑیوں میں پھونکیں مارتی ہوئی غزل آنکھوں سے بہتا پانی پو نچھ پونچھ کر پراٹھے سینکتی رہی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ ناشتے کی میز پر کیسا طوفان آیا تھا

بات اتنی تلخ ہو جائے گی اس کا شاہین کو اندازہ نہ تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی اپنے والدین سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ بلکہ امی کے سامنے جھکنا اور ان کی ہر بات پر گردن ہلانا اس کے خاندان کی روایت تھی۔۔۔ اس کے باوجود۔۔۔ ہزار بار ارادہ کرنے کے باوجود وہ امی سے معافی مانگنے نہیں گیا۔۔۔

رضیہ اپنے کمرے میں لیٹی سسکیاں لیتی رہی۔ راشد نے ماں بیٹے کے درمیان ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بیٹے کی خودسری سے اسے بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے باوجود اس نے بیوی کی طرف داری نہیں کی۔۔۔ کیوں کہ بیٹا اس کا مستقبل تھا اور دوراندیشی راشد کی سرشت میں داخل تھی۔

اس دن کلینک ختم کر کے شاہین دو پہر کے کھانے پر گھر نہیں آیا۔ شام کو وہ کلب چلا گیا۔ رات کو بارہ بجے آیا تو لنگڑی پھوپھو کے بہت اصرار پر بھی اس نے کھانا نہیں کھایا۔

بیٹے کے یہ تیور دیکھ کر رضیہ نے خود ہی سپر ڈال دی۔ رفتہ رفتہ شاہین جیسے بھول ہی گیا کہ اس نے امی سے کوئی گستاخی کی تھی۔

اور رضیہ اسی طرح ہاسپٹل جاتے وقت اسے روک کر پوچھتی۔

”دوپہر میں کیا پکواؤں۔“

جھینگے کی کڑھی۔ ماہی قلیہ۔۔۔“ شاہین جیسے پہلے سے سوچے بیٹھا تھا کہ آج کیا کھاتا ہے۔“

غزل گھر والوں کی اس خاموشی سے کچھ چونکنی سی ضرور تھی۔ مگر اس نے اب سب باتوں پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے وہ دن بھر چولہے کے پاس گھسی رہتی تھی۔ وہاں سے اٹھی تو گھر کی صفائی پوری ہے۔ فرش دھو رہی ہے۔ لنگڑی پھوپھو کے سر میں جویں دیکھ رہی ہے۔ سرور کبھی اچانک آکر دیکھ لیتا تو ہرگز یقین نہ کرتا کہ سیکڑوں دلوں کو جیتنے والی یہ اسٹیج کی ماہ پارہ وہی ہے جس کی ایک نگاہ پر سرور کا دل کانپنے لگا تھا۔ جسے وہ دنیا کے ہر دکھ سے بچا کر تختیل کی ملکہ بہار بنا تھا۔

رضیہ نے گھر کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر شاہین کے بیاہ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ ہمر و، اطلس اور کمخواب کے ٹکڑے نکال کر اس نے لنگڑی پھوپھو کو دیے کہ خوان پوش سینا شروع کر دیں۔ اس دن کے بعد سے رضیہ نے غزل سے بھی بڑا سرد مہری کا برتاؤ شروع کر دیا تھا وہ چار چار بار پوچھتی تو ایک بار جواب ملتا۔

مگر شاہین بڑے مزے میں تھا۔ شام کو وہ کلینک سے آتا تھا تو اس کی جیب میں کبھی ٹافیاں ہوتیں کبھی چاکلیٹ۔ کبھی کھٹے بیر۔ سب کی نظریں بچا کر وہ اس لفافے کو غزل کی طرف اچھال دیتا تھا۔ کبھی شاہین اپنے کمرے میں سو رہا ہوتا تو جانے کیوں رضیہ کو یوں لگتا جیسے اندر کوئی اور بھی نہیں رہا ہو۔

پھر انہیں یاد آتا کہ شامی ٹرانسٹر پر کوئی ڈرامہ بن رہا ہو گا۔

دو پہر کو شاہین کھانے کے لیے آیا تو دالان میں ہر طرف رنگین کپڑے اور گوٹا کناری کی جھلملاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ رضیہ اور لنگڑی پھوپھو ہو کپڑے سی رہی تھیں۔ غزل سیاہ مخمل پر چمکیاں ٹانک رہی تھی۔

شاہین کا موڈ ٹھیک دیکھا تو لنگڑی پھوپھو نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھا کر کھنا شروع کیا۔

میرے بھائی کو منع کر دیا۔ اب میں بھی دیکھتی ہوں کہ شاہین میاں کیسا ڈاکٹر، انجینئر لاتے ہیں ڈھونڈ کر اپنی سستی ”ساوتری بہن کے واسطے۔“ ہم لوگ تو چپ اللہ کے واسطے میں ہاں کر دیے تھے۔ ورنہ شیخو میاں تو خود بھی کب تیار تھے جھوٹن کھانے کے واسطے۔

شاہین نے ادھر دیکھا۔ غزل کپڑے پر چمکیاں ٹانک رہی تھی۔ پھر اپنے آنسو ٹانکنے لگی۔ شاہین نے لنگڑی پھوپھو کو کوئی جواب نہیں دیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا یہ بات لنگڑی پھوپھو نے نہیں کہی امی نے ان سے کہلوائی ہے۔

رات کو وہ کلینک بند کر کے آیا تو حسب عادت سب سوچکے تھے، صرف غزل کے کمرے کی لائٹ کھلی تھی۔ شاہین نے آہستہ سے کواڑ کھول کر اندر دیکھا۔ غزل کے ہاتھ میں کوئی ادھ سلا کپڑا تھا۔ مگر وہ آنکھوں میں آنسو لیے سسکیاں لے رہی تھی۔ شاہین نے آہستہ سے دروازہ بند کرو یا اور غزل کے پاس جا بیٹھا۔

”تم نے اپنے آنسوؤں کا خزانہ کہاں چھپا رکھا ہے غزل۔ پندرہ برس سے تمہیں روتے دیکھ رہا ہوں۔“

غزل کچھ نہ بولی۔ ہاتھ میں تھامے ہوئے سوائی کو اپنی انگلیوں میں چبھو چبھو کر خون نکالتی رہی۔ پھر شاہین کو اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر چونک پڑی۔

شاہین۔ مجھے شیخو بھائی سے شادی کرنے دو۔ ورنہ کتوں کی جھوٹن کون کھائے گا! میں کب تک ممانی بیگم کے ”سر پر سوار رہوں گی“ مگر شاہین نے کچھ نہ سنا۔ وہ تو صرف غزل کو دیکھے جارہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ ”ایوان غزل“ کے وہ سارے مکین بے قصور تھے۔ جو عورت کے حسن کی آنچ میں پگھل پگھل کر موم بنتے رہے جنہوں نے عشق کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا۔ پھر بھی ایوان غزل کے لائبریری روم میں رکھی ہوئی پچھتر بیاضیں مکمل نہیں تھیں۔ ان میں ابھی بہت کچھ کہنے کو رہ گیا ہے۔

اس سانولے سے رنگ کے بارے میں۔ سو جھی سو جھی سی آنکھوں کے بارے میں، چھوٹی سی سرخ ناک اور اڑے اڑے بالوں کے بارے میں۔ شاہین کا بھی اپنے دادا حضرت کی طرح شاعری کرنے کو دل مچل اٹھا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ غزل

میں کوئی ایسا سحر ہوتا ہے۔ جو وہ شاعروں کی پسندیدہ صنف ادب بن گئی ہے۔ ہر دور میں شاعروں نے اسے اپنے سینے سے لگایا۔ اس پر طبع آزمائی کو ضروری سمجھا۔ اور پھر شاہین نے بھی ان چند لمحوں میں غزل کو بڑے لطیف نام دیے۔ بڑی خوبصورت شبیہیں۔ جذبات کے جانے کتنے سمندر تیرنا پڑے۔۔۔ راہ کے کتنے پہاڑ الا نگھے۔۔۔ تب وہ ہانپتا ہوا بولا۔

”غزل۔۔۔ اگر میں تم سے شادی کرنا چاہوں تو تم راضی ہوگی؟“

اس بار غزل کا ہاتھ اتنی زور سے کا نپا کہ سوئی ہتھیلی میں اترتی چلی گئی۔۔۔ اس نے تڑپ کر شاہین کو دیکھا۔۔۔ سر سے پیر تک۔ جیسے شاہین نے بڑی بے رحمی سے اسے چر کا دیا ہو۔ اس پر کھلے چاقو سے وار کیا ہو۔۔۔ اور پھر وہ کانپتے ہاتھوں سے شاہین کو دور ڈھکیل کر بولی:۔

”نہیں نہیں ایسا مت کہو۔۔۔“ اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تو ہتھیلی میں سے ٹپکنے والے خون کے قطرے اس کے گالوں پر گرنے لگے۔

”میں۔ یہ ناٹک کھیلتے کھیلتے عاجز آچکی ہوں۔ اب میرے اور ٹکڑے مت کرو۔ چلے جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ شاہین۔“

شاہین نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور غصے میں کہا۔

بس کرو اپنے حسن پر اترا نا۔ میں کوئی بلگر امی نہیں ہوں جس کے آگے تم ڈرامے کی ریہرسل کر رہی ہو۔“ اور پھر ”شاہین نے اس کے گالوں پر لگا خون پو نہ چھ ڈالا۔

اس نے نگاہ اٹھائی۔ شاہین کو دیکھا۔ دیکھتی رہی۔۔۔ اس کے چہرے پر کوئی خوشامد نہیں تھی۔ کوئی طلب نہیں تھی۔ وہ بہت ہی مغرور نظر آ رہا تھا۔ ہمت والا۔ جیسے اب غزل نے انکار کیا تو اس کی پیٹھ پر دولا میں مارے گا۔

میں نصیر کی طرح محبت کا ڈھونگ نہیں رچا رہا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی محبت و حبت نہیں ہے۔ آگے کی نہیں کر ”سکتا۔“

اور وہ باہر چلا گیا۔

یہ شاہین تھا۔ غزل نے اپنی خون آلودہ ہتھیلی کو دبا کر سوچا۔ اس نے تو کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا، کہ شاہین بھی اسے ایک عورت سمجھتا ہے وہ تو شاہین کے وجود کو ہمیشہ نظر انداز کرتی رہی۔ اس کے لیے شاہین ایک احمق معصوم لڑکا تھا۔ جسے ہر شرارت، ہر بغاوت سکھانا پڑتی تھی۔ وہ آج بھی اتنا ہی چھوٹا تھا۔ اتنا ہی احمق۔ کچھ تو سوچتا وہ اتنا بڑا ڈاکٹر ”ایوان غزل“ کا مالک ہے راشد کا بیٹا۔ بے وقوف۔۔۔ جب ہی تو اتنی صاف گوئی سے کام لے رہا ہے۔ مجھے تم سے محبت و حبت نہیں ہے آگے کی نہیں کہہ سکتا۔ تو آگے کی بات میں کہوں گی۔ ابھی اسی وقت وہ اٹھ کر شاہین کی کمرے کی طرف بھاگی۔

بجاری لنگڑی پھوپھو بڑے انہماک سے جانماز پر بیٹھی اپنی قسمت کا سورج نکلنے کی دعائیں مانگتی رہیں۔ انہیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ واحد حسین کا پوتا، راشد کا بیٹا بھی اتنا گیا گذرا تھا کہ جھوٹے کھانے پر منہ مارتا پھرے۔

خیر۔۔۔ صبح ہوئی تو سب غزل کے قہقہوں کی آواز پر جاگے۔ وہ آنکھوں میں گنگنائی پھر رہی تھی۔ جاگو موہن پیارے جاگو۔۔۔

صبح بادام کا حریرہ بنا کر راشد کو دینے کی بجائے وہ اپنے گیلے بال کھولے آئینے کے سامنے جا بیٹھی اور چاند آپا کے میک اپ کا ڈبہ کھول لیا۔ کرائی کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا اس لیے شاہین اکثر اسے ہاسپٹل سے گھر لے آتا تھا۔ آج بھی کرائی غزل کے قدموں کے پاس بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

! آنتی آج آپ اپنا منہ ریڈ کیوں کر رہی ہیں۔۔۔”

رضیہ نے اس کے جہیز کے لئے جو دو چار جوڑے سلوائے تھے اس میں سے چوتھی والی ہری ساری نکال کر اس نے پہن لی۔

مگر رضیہ کو اپنی پریشانیوں میں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ غزل کے اس بدلے ہوئے روپ پر غور کرتی۔

سارے گھر میں خاموشی سی چھائی رہتی۔ شروع ہی گرمیوں کی تیز ہوائیں ہر چیز کو جسے جھنجھوڑے ڈالتی تھیں۔ درختوں سے زرد پتے گرے جاتے تھے۔ سپوٹے پک رہے تھے۔ اور آم کے بور کی تیز مہک ہر طرف پھیل رہی تھی۔

یہ بڑا افراتفری کا دور تھا۔

اعلیٰ حضرت ”راج پرمکھ“ بن چکے تھے۔ اور کے ایم منشی نے انڈین یونین کے ایجنٹ بن کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ ابھی چند ماہ پہلے گاندھی جی کا قتل ہو چکا تھا۔ اس لئے ہر طرف سخت دہشت اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ اتحاد المسلمین کے کچھ لیڈر راتوں رات فرار ہو چکے تھے۔ قاسم رضوی جیل میں تھے اور لائق علی اپنے گھر میں ہی نظر بند تھے۔

اس وقت راشد اور اس کے ساتھیوں نے کانگریس سرکار کے سامنے اپنی وفاداری کے ہزاروں ثبوت پیش کئے اس کے باوجود جاگیریں اور منصب ختم ہو رہے تھے۔ گھبرا کے وہ بغاوت کی سوچتے۔۔۔ مگر کیسی بغاوت۔۔۔؟

ہر طرف سسکیاں اور آنسو تھے۔ ہزاروں افراد۔ جنہوں نے گاندھی جی کے اشارے پر اپنے خطاب اور جاگیریں واپس کر دی تھیں۔ پھانسی کے تختے اور جیل کی سختیاں برداشت کی تھیں۔ انہیں اب قبل از وقت پنشنیں دی جارہی تھیں۔ بہت سے چھوٹے بڑے کلرکوں، پولیس آفیسروں اور اہم عہدے داروں کو زبردستی ان کے عہدوں سے نکال دیا گیا۔ اس ہما ہمی کے عالم میں ہر شخص سوچ رہا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا! ایسے وقت راشد چاروں طرف ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی پر احتساب تھا۔ اس لئے مخدوم اور ان کے ساتھی انٹرگراؤنڈ تھے۔

ان حالات میں شاہین سوچتا کہ انسان بچ کر کہاں جائے گا ؟

اس نے راشد کی تمام تجویز میں رد کر دی تھی۔ وہ نہ تو پاکستان جائے گا اور نہ امریکہ جاکر دولت کمائے گا۔ دولت کمانے میں اسے کوئی دلچسپی نظر نہ آتی تھی۔ کیوں کہ اس کے باپ اور دادا نے جو دولت کمائی تھی وہ ”ایوان غزل“ بنی اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ اور جب ہر طرف ایسے ہی حصار کھینچے ہوئے ہوں تو بھاگنے کی کوشش کیوں کریں۔ اس لئے شاہین حیدرآباد میں رہنا چاہتا تھا۔ تمام سیاسی اور سماجی تحریکوں سے الگ میڈیکل ریسرچ میں وقت صرف کرنا چاہتا تھا۔۔۔ وہ جب ہائی اسکول میں پڑھتا تھا تو مخدوم کی رومانی نظمیں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اور وہ اکثر سائنس کی کتاب رکھ کر گنگنانے لگتا تھا۔

رات بھر دیدہ نمناک میں لہر تے رہے

سائنس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

اس شعر کی اداس فضا میں وہ خود بھی اپنے آپ کو تنہا اور اداس محسوس کرتا تھا۔

پھر ایک دن ایک مقامی رسالے میں اس نے مخدوم کی نئی نظم دیکھی جو جیل کی سلاخوں کو توڑ کر سارے حیدرآباد مینگونج رہی تھی۔

سوچتا ہوں کہ یہ کنج گران مایہ عمر

نذر زنداں ہوا نذر آزدائی زنداں وطن کیوں نہ ہوا۔

مخدوم کی ایسی نظموں کی وجہ سے شاہین جیسے تعلیم یافتہ نو جوان حالات سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے چاروں طرف راستہ تلاش کر رہے تھے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ مجبوری اور ضرورت نے بہت سی پرانی روایتوں کو توڑ دیا تھا۔ ڈیوڑھیوں سے پردہ لگی کاروں اور جھٹکوں میں نکلنے والی لڑکیاں اب بس اسٹینڈ کے کیو میں کھڑی نظر آتی تھیں۔ ہر گھر کی لڑکی اب اسکول جارہی تھی۔ بند کمروں میں قالین پر تانبورہ سنبھالے ہوئے چنونا اب اب ریڈیو اسٹیشن سے دادرا اور ٹھمریاں گانے لگے تھے، ڈیوڑھیوں کا نیلام ہو رہا تھا۔ کاروں اور مکانوں کی قیمتیں گر گئی تھیں۔ دولہا نواب کے پوتے رکشا چلا رہے تھے اور مسکین علی شاہ کی پوتی منہ پر میک اپ چڑھائے ہر مرد سے عشق کا کھیل کھیلنے کو تیار تھی۔ جو اسے پناہ دینے کا وعدہ کرتا جو اس کے باپ کی کھوئی ہوئی ”الف لیلہ“ اسے واپس دلانے کا یقین دلاتا تھا۔ اسی لئے شاہین پیسہ بٹورنے کی بجائے ہاسپٹل میں سروس کر رہا تھا۔ اور اب اس نے اپنا ایک چھوٹا سا کلینک حیدر گوڑہ میں کھول لیا تھا۔ جہاں وہ غریب مریضوں کا مفت علاج کرتا، ان کے پھلوں کے لیے پیسے اپنی جیب سے دیدیتا تھا۔ جب بھی اس کے سامنے کوئی ضرورت مند آ کھڑا ہوتا تھا تو وہ فوراً اپنی جیب ٹٹولنے لگتا تھا۔ یوں ہی جیسے اس نے غزل کو شادی کا آفر دے دیا۔ اس نے تمام یورپ دیکھا تھا اور وہ سچ مچ اتنا احمق نہیں تھا جتنا اس کی ماں یا غزل اسے سمجھتی تھیں۔

مگر غزل میں اچانک جانے اسے کیا کیا نظر آیا کہ اس نے کچھ نہ سوچا غزل اس کا ساتھ دے گی۔ اس کے ساتھ پنس سکتی ہے، رہ سکتی ہے۔۔۔ بس پھر میں اس کا ماضی کیوں دیکھوں، میں بھی تو اپنے ماضی میں جھانکنے کا اختیار اسے نہیں دے رہا ہوں۔ بچاری غریب لڑکی جسے بچپن سے صرف نفرت ملی۔ ایسی لڑکیاں ہر ڈیوڑھی میں ملتیں۔ ہر بنگلے سے نکل رہی تھیں۔ انہیں اپنے بے سہارا خاندان کو پالنے کے لئے بہت سے بہانے تلاش کرنا پڑتے۔۔۔ اسٹیج پر اداکاری۔۔۔ آفس میں کلر کی اسکول مینٹیجر۔ یا پھر محفلوں میں چمکنے والی ایک فیشن ایبل خاتون بن کر کبھی وہ راشد کی زندگی کا سامان مہیا کرتیں کبھی ہمایوں کی روٹی کپڑے کا بندوبست ہو جاتا تھا۔

بیٹے کی اس خودسری پر راشد کو بڑا افسوس تھا۔ ادھر فوزیہ کی طرف سے بھی راشد کو چین نہیں ملا تھا۔ کیوں کہ فوزیہ کے دولہا کو ہر وقت یہی پچھتاوا تھا کہ اس نے شادی کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ ورنہ اسے گھوڑے جوڑے کے پچھتر ہزار بھی مل سکتے تھے۔ اپنے نقصان کا ذکر ہر وقت وہ فوزیہ سے کرتا رہتا تھا۔

ان حالات نے راشد کو قیل از وقت بوڑھا بنادیا۔ وہ ہر طرف کی پریشانیوں۔ اندیشوں اور مشکلوں کو تنہا جھیل رہا تھا۔ اس کا بیٹا اپنے باپ کی مشکلوں کو سمجھتا تھا۔ اور ہمیشہ یہی مشورہ دیتا کہ آپ رویہ کمانے کی کوششوں کو اب ترک کر دیجیے۔ اکیلا میں آخر کتنا کھاؤں گا۔

صبر کرتے کرتے راشد کو اختلاج کی شکایت ہو گئی تھی۔

چنانچہ ایک دن زہر دستی شاہین نے اس کا چیک اپ کیا۔ جانے کتنے ٹسٹ لئے۔ پھر اس کے ہاتھ پر پٹی باندھ کر اس کے دل کی دھڑکن سنی اور بہت پریشان ہو کر کہا۔

”ڈیڈی آپ کا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے۔ نمک چھوڑ دیجیے۔“

مگر راشد کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کی ساری پریشانیوں کا سبب نمک ہو سکتا ہے۔ رضیہ بھی ان پریشانیوں میں گھر کر نہ ڈھال رہنے لگی تھی۔ اس کے باوجود اس نے کئی بار غزل کو غور سے دیکھ کر کہا کہ یہ نئی ساری کیوں پہن لی۔ کبھی وہ شاہین کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے پر اسے ڈانٹ دیتی۔ وہ جانتی تھیں کہ غزل تو منہ لگانی ڈومنی ہے۔ شاہین نے شیخو بھائی سے اس کی شادی رکوا دی ہے اس لئے آجکل شاہین پر بڑی مہربان ہے۔ اب تو پولیس کے کسی سپاہی سے اس کا بیاہ کرنا ہوگا تا کہ ساری مستی نکل جائے۔

لیکن غزل لنگڑی پھو پھو آجکل بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ انہوں نے غزل کے بدلے ہوئے رویے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اور دن بھر شیخو بھائی کی کوٹھری میں گھسی جانے کیا کھسر پھسر کئے جاتیں۔

انہوں نے اپنے جہیز کے لئے رکھی ہوئی سرخ نیلی پیلی ساریاں بھی نکال کر پہن ڈالیں۔ دن میں کئی کئی بار اپنے کھچڑی بال کھولے کنگھی کئے جائیں۔ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے ماما کو کم دیا جاتا کہ شیخو بھائی کو ایک ہاف فرائی انڈا۔ اور ایک پیالی دودھ بھیج دیا جائے۔

غزل نے اس فرمان کو بڑے غور سے سنا۔ اچھا ہوا کہ رضیہ نے لنگڑی پھوپھو کا یہ حکم نہیں سنا تھا۔ کیونکہ شیخو بھائی کو تو ہمیشہ نوکروں والا ناشتہ بھیجا گیا تھا۔

ایک بار لنگڑی پھوپھو پولکس صابن کی ٹکیا اپنی سوکھی کلائیوں پر رگڑ رہی تھیں تو انہوں نے غزل سے کہا۔

تم لوگاں رات دن منہ پر سرخی پاؤڈر تھوپتے ہو مگر پھر بھی صورت پر ٹھیکرے برستے ہیں۔ ہمیں دیکھو پچاس ”
”کے قریب پہونچ گئے مگر صورت پر کیسی رونق ہے۔۔؟“

شابین کو عادت تھی کہ آتے جاتے غزل کے سر پر دھول مارتا ہوا جاتا وہ غزل سے اتنا لمبا تھا کہ اس کے سر پر دھول مارنے کے لیے غزل کو استول پر چڑھنا پڑتا تھا۔ اسی لئے وہ ایک تپاہی پر چڑھ کر شابین کو پکڑنے کو جھکی تو شابین نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ میں اٹھا لیا۔ راشد اور رضیہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مگر اندر کمرے میں کھڑ پھڑ کرنے والی لنگڑی پھوپھو نے اس منظر کو دیکھ لیا۔

شام کو سب کھانے کی میز پر بیٹھے تو لنگڑی پھوپھو نے فلیتہ جلايا۔

اچھا ہوا دلہن آپ حبیب جنگ کی پوتی سے شابین بابا کا رشتہ طے کر آئے۔ مگر سنا ہے وہ لوگاں بڑے پرانے خیال ”
”کے ہیں کہتے۔

رضیہ اور راشد کا خیال تھا کہ شابین اس خبر سے چونک پڑے گا کہ اس کی مرضی کے بغیر یہ رشتہ کیسے طے ہو گیا۔ مگر وہ مچھلی کے کانٹے صاف کرتا رہا۔

”یہ بھی اچھی بات ہے۔ ہم لوگاں بھی کاں کے ترقی پسند ہیں۔“

راشد بھی اب واحد حسین کے انداز میں سوچنے لگا تھا۔ اس کے کہیں کہیں سے ہوتے ہوئے سفید بال، بھاری بھر کم بدن اور گر جدار آواز پر غزل کو اکثر نا احضت یاد آ جاتے تھے۔

”مگر تمہارے گھر کا ان سے میل کیسے ہوگا ر شد نواب۔۔۔؟“

لنگڑی پھوپھو اتنی جلدی بات ختم کرنے کو تیار نہ تھیں۔

وہ لوگاں اپنے گھر کے چال چلن بھی دیکھیں گے۔ مگرایاں تو ہر وقت ادھر ادھر کی پوٹٹیوں کے دن رات مزاح دل گل ”
چلتی رہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غزل کے سوا کوئی بھی لڑکی گھر میں ڈھونڈ تو دوا کے لئے بھی نہ ملتی۔ مگر شابین آج مچھلی کے کانٹوں میں اس بری طرح الجھ گیا تھا کہ اس نے کچھ نہ سنا۔ اس کے ہاتھ تو کانٹوں سے بچاؤ میں مصروف رہے۔ اور نگاہیں اس کوشش میں رہیں کہ میز کے دوسرے سرے پر بیٹھی ہوئی غزل سے چار نہ ہوں۔

تو کونسی لڑکیاں، چھو کر یاں ہم نے رکھ چھوڑی ہیں۔۔۔ بس لے دے کر ایک غزل ہی تو ہے۔“ رضیہ نے پانی کا ”
گھونٹ لے کر کہا۔

لنگڑی پھوپھو نے منہ بنا کر رضیہ کو گورا۔ یہ رضیہ بنتی توتھی اپنے آپ کو بڑی چالاک مگر کبھی جو بات کی تہہ تک پہونچے۔

یہ تو اللہ کا شکر بھیجو دلہن کے ان لوگوں کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا ہے کہ غزل ”ایوان غزل“ میں رہتی ہے۔ ”ورنہ آپ کے گھر کون رشتہ کرے گا۔۔۔؟“

لنگڑی پھوپو کی اس صاف گوئی پر شاہین اچھل پڑا۔ رضیہ بھی کھسا کر انہیں گھورنے لگی۔ اور راشد کو پانی پی کر یہ کہنا پڑا۔

پھوپو کا تو اب دماغ بالکل چل گیا ہے۔ غزل ہماری بہن کی نشانی ہے۔ اگر وہ لوگاں اتنے چھچھورے ہیں تو ہم خود ”اس رشتے سے انکار کر دیں گے۔“

مگر غزل ماموں جان کی بات سننے سے قبل اٹھ چکی تھی۔ لنگڑی پھوپو کو اس دن سب ہی نے خوب برا بھلا کہا۔ اس لئے انہوں نے بھی سارے گھر سے بائیکاٹ کر کے شیخو بھائی کی کوٹھری میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے باوجود انہیں یقین تھا کہ غزل کے قہقہے تھم جائیں گے۔ اور وہ شاہین کے ساتھ مذاق کرنے کی جرأت نہیں کرے گی۔

لیکن رات کو وہ جب عشا کی نماز کے لئے ورائٹے میں آئیں تو غزل خوب بنی ٹھنی خوشبوؤں میں بسی آنگن میں کھڑی تھی۔ اور شاہین سوٹ پہنے ورائٹے میں کھڑا پانی پی رہا تھا۔

وہ ستون کا سہارا لیے منہ کھولے اس منظر کو دیکھتی رہیں۔

یہاں تک کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹتے چمٹتے باہر کی طرف جانے لگے تو شاہین نے لنگڑی پھوپو سے کہا کہ وہ سکنڈ شود یکھنے جارہا ہے اس لئے گیٹ لاک مت کرنا۔

اور پھر انہوں نے کارا سٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

اس رات لنگڑی پھوپو نے عشا کی نماز پڑھی ، نہ انہیں ساری رات نیند آئی کیونکہ اتنی وزنی بات کو چوکی سے اٹھا کر رضیہ کے کمرے تک لے جانے میں ہانپتی جارہی تھیں۔

کراتنتی نہیں تھی اور شاید اسے بخار آ گیا تھا اس لئے وہ خوب روٹی کراہتی رہی۔ مگر لنگڑی پھوپو پوکی جوتی کو غرض پڑی تھی کہ اس کے پاس جاتیں۔

صبح غزل اپنے ہاتھ سے شاہین کو چائے پلا رہی تھی تو یہ منظر لنگڑی پھوپو نے کواڑ کے سوراخ سے رضیہ کو بھی دکھایا۔

پھر راشد کی نظریں جانے کیسے شاہین کے کمرے کی طرف اٹھیں تو وہ غزل کے دونوں ہاتھ پکڑے اسے چکر دے رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آکر سگریٹ پی پی کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر جب بھپری ہوئی شیرنی کی طرح رضیہ کمرے میں آئی تو اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر کہا۔

”شاہین کے سسرال کے لوگاں کب تک شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔۔۔؟“

لیکن رضیہ پر تو جیسے کسی نے انگڑے اچھال دیئے تھے۔ تنک کر بولی۔

”بس بس رہنے دو برییکار کی باتاں۔ میرا منہ نکو کھلواؤ۔ یہ سب آپ ہی کیا دھرا ہے۔“

”ایسی کیا بات ہے۔ شاہین کی شادی ہو جائے تو۔۔۔“

راشد نے رساں سے کہتا چاہا مگر رضیہ بجلی کی طرح پلٹی۔

چپ بیٹھو اب۔۔۔ میں تو اس گھر میں آکر پچھتائی۔ غلاظت کا گڑھا۔ میرے کو معلوم تھا کہ میرے بچے بھی یاں نہیں ”
 ”بچیں گے۔ آپ کی بہناں مر گئے۔ کلموہی بیٹیوں کو میرے حوالے کر گئے۔

اور اسی وقت شاہین پردہ اٹھا کر اندر آیا۔ ثانی کی گرہ درست کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”امی۔ آپ میرے لئے دلہن مت ڈھونڈئیے۔ میری دلہن گھر ہی میں ہے۔“

بظاہر اس نے یہ بات امی سے کہی تھی۔ مگر انداز تخاطب پیا سے تھا۔ پھر وہ سیٹی بجاتا ہوا چلا گیا۔ لیکن وہ دونوں
 اپنی جگہ سے نہیں بلے۔ جیسے شاہین کوئی منتر پڑھ کر انہیں پتھر بنا گیا ہو۔ بڑی دیر کے بعد کلاک کے گھنٹے جیسے کسی
 خطرے کا اعلان کرنے کو بج اٹھے تو راشد چونک پڑا۔

افوہ۔۔۔ کیا بج گیا۔! اس نے اپنے آس پاس کی دنیا پہچانی۔ یہ اس کا کمرہ تھا، یہیں ان دونوں کے پلنگوں سے لگا ایک ”
 ننھا سا کریپ پڑا تھا۔ جس میں لیٹا ہوا شاہین اٹھنے کی کوشش کرتا تھا اور اٹھ نہ پاتا۔ پھر راشد جھک کر اپنی دونوں انگلیاں تھما
 دیتا تھا۔ تا کہ وہ ان کے سہارے اٹھ سکے۔ پھر وہ اٹھا۔۔۔ اور ہاسپٹل چلا گیا۔ جہاں وہ اسکرین پر لوگوں کے دلوں کا حال دیکھے
 گا۔ زخمی دلوں پر مریم رکھے گا۔ وہ شہر کا سب سے مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ مگر اس نے یہ نہ سوچا کہ اس کے باپ کے
 سینے میں بھی دل ہے۔ وہ بلڈ پریشر کا مریض ہے۔۔۔ اس کے دل پر کتناز بر دست وار کیا تھا۔۔۔ اور پھر بڑھتے ہوئے پریشر سے
 چکراتے ہوئے راشد نے کہا۔

”رضیہ گذرتے ہوئے وقت کو پیچھے کی طرف مت لے جاؤ۔۔۔ جو ہوتا ہے ہونے دو۔۔۔“

اس رات غزل کو بالکل نیند نہ آئی۔

ایسا تو اکثر ہوا کہ لوگوں نے اس کو شادی کا آفر کیا۔۔۔

بلگرامی۔۔۔ سرور۔۔۔ نصیر۔۔۔ اور پھر آج شاہین نے بھی یہی کیا۔۔۔

یہ سب مرد جو اس کے سامنے ایک دیا جلا کر اپنی دنیا کو روشن کرتے رہے ہیں۔۔۔ وہ ان کے لئے پلاسٹک کی گڑیا تھی۔۔۔ پالتو بلی تھی۔ جسے موڈ ہوتو پیار کرتے ہیں۔ جی نہ چاہے تو لات مار کے بھگا دیتے ہیں۔

آج شاہین نے بھی اس سے شادی کے لئے کہا تو اسے تعجب نہ ہوا۔ پھر بھی جانے کیوں اسے بچپن میں کہیں دیکھی ہوئی دیوالی کا ایک منظر یاد آیا۔۔۔ سیکڑوں چراغ قطاروں میں جلتے ہوئے۔

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ مجھ ہی سے شادی کیوں کر رہے ہو۔۔۔؟“

اس نے گھبرا کے پوچھا۔

”اس لئے کہ میں نہیں چاہتا تم زندگی بھر روتی رہو۔“

ہونہ۔۔۔“ دیوالی کے دیوں کی لمبی قطار بجھتی چلی گئی۔“

تو تم مجھ پر ترس کھا کر شادی کرنا چاہتے ہو۔۔۔ مجھ پر رحم کھا کر۔۔۔“ مگر اس نے یہ بات شاہین سے نہیں کہی۔“

”اچھا اگر میں زندگی بھر ہنسنے کا وعدہ کر لوں تو۔۔۔؟“

شاہین نے پلٹ کر اسے غور سے دیکھا۔۔۔

”کیسے ہنسو گی۔۔۔؟“

جیسے اب روتی ہوں۔۔۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔“

بس، بس بہت ہو چکی فلاسفی۔۔۔“ وہ جیسے اب کسی بحث میں پڑنے کو تیار نہ تھا۔“

”مابدولت جو فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس پر اٹل رہیں گے۔۔۔“

اور اسنے فوراً امی کے کمرے میں جا کر اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ جیسے خود بھی دیر کرنے سے گھبرار ہوا۔۔۔

شاہین ہاسپٹل چلا گیا تو کمرہ اندر سے بند کر کے غزل خوب روئی اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں کسی اور عورت کا تصور نہیں کر سکتا۔ وہ تو مجھ پر رحم کھا کر شادی کرے گا۔ بعد میں پچھتائے گا۔۔۔ مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔ شاید اسے بہانہ۔۔۔ بلگرامی اور نصیر کے قصے پوری طرح نہیں معلوم ہیں۔ بعد میں راشد ماموں اور لنگڑی پھو پوا سے یہ قصے خوب نمک مرچ لگا کر سنائیں گے اور وہ دور بٹٹے لگے گا۔

”آخر یہ کیسے ہوگا کہ میں نصیر کی دی ہوئی انگوٹھی اتار دوں۔۔۔“

پھر جلوے کی رات شاہین میری کونسی انگلی تھامے گا۔۔۔

نواب واحد حسین کا پوتا۔۔۔ اختر الدولہ کا نواسہ۔۔۔ راشد حسین کا بیٹا۔۔۔ ڈاکٹر شاہین راشد۔۔۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ ایم۔ آر۔ پی۔

نہیں نہیں۔ وہ بہت بڑا ہے۔ وہ تو میرے سر پہ پہاڑ بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ میں پس کر رہ جاؤں گی۔”

ایوان غزل“ کا سارا بوجھ میں اپنے سر پر کیسے اٹھاؤں گی۔۔۔”

ایوان غزل“ جو صرف محبوباؤں ، معشوقاؤں کے لئے ہے۔۔۔ یہاں جو عورت بیوی بن کر آئی وہ رضیہ کی طرح ہر ”
”طرف سے لٹتی رہی۔۔۔ میں بھی یہاں شاہین کی محبوباؤں کی ناز برداریاں کروں گی۔۔۔

رضیہ ممانی مجھے دو دن میں مار پیٹ کر نکال دیں گی۔ لنگڑی پھوپھو مجھے زہر کھلا دیں گی۔ جھوٹے ٹکڑے کھانے والی کتیا۔۔۔ دوٹکے کی آوارہ چھوکر۔۔۔ نہیں میں شیخو بھائی سے شادی کروں گی۔۔۔ صبح شیخو بھائی سے کہوں گی مجھے ساتھ لے کر کہیں بھاگ جاؤ۔۔۔ مجھے کمانے کے سارے گر یاد ہیں۔۔۔ میں تمہیں ہر طرح کا سکھ پہنچاؤں گی۔

وہ کروٹیں بدلتی رہی۔۔۔ پھر جب موذن اذان دے رہا تھا تو اس نے تھک کر سوچنا چھوڑ دیا۔

اللہ بہت بڑا ہے۔۔۔ اللہ بہت بڑا ہے۔۔۔

صبح اس نے بخار میں بھنتی ہوئی کر انتی کو اٹھایا تو سوچ لیا کہ وہ کرانتی کی ہو جائے گی۔۔۔ کر انتی اب آٹھ برس کی ہو چکی تھی۔ پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ اور اپنے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی۔

پھر اس نے کرانتی کو سوئٹر پہنایا۔ اور کمرے سے باہر نکلی تو حسین بی نے پوچھا۔

”غزل بی بی آج پھوپھو پاشاکاں گئے۔۔۔! میرے کو اسٹور کھول کر آٹاگھی ابھی تک نہیں دیئے۔۔۔“

تب اس نے جھانک کر دیکھا۔ لنگڑی پھوپھو اپنے کمرے میں نہیں تھیں۔ جانے صبح ہی صبح کہاں گئی ہیں۔ غزل کو مارنے کا سامان کرنے۔۔۔ وہ ہوتیں تو ابھی شیخو بھائی سے غزل کے نکاح کی بات کی ہو جاتی۔

تم کہاں جارہی ہو۔۔۔؟“ رضیہ نے بڑے قہر بھرے لہجہ میں پوچھا۔

کرانتی کو کلینک پہنچانے جارہی ہوں۔۔۔“ غزل نے سہم کر کہا۔ وہ چاہتی تھی آج کرانتی یہاں نہ رہے۔ جانے کیسے کیسے تماشے ہونے والے تھے آج کلینک میں میری اسے دوا پلا کر بخارا تار دے گی۔

اور لنگڑی پھوپھو کہاں ہیں۔۔۔؟“ رضیہ نے بالکل پولیس والوں کے انداز میں شک بھری آواز سے پوچھا۔ رضیہ کو اب ”یقین ہو چلا تھا کہ اس کے خلاف چپکے چپکے کوئی ہانڈی پک رہی ہے۔ شاہین اور غزل نے لنگڑی پھوپھو کو بھی اپنے ساتھ کر لیا ہے۔

اسی لئے زندگی میں پہلی بار لنگڑی پھوپھو کسی کو بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھیں۔ اب غزل بھی کرانتی کو لے کر کہیں بھاگ رہی ہے۔

کوئی ضرورت نہیں گھر سے باہر قدم نکالنے کی۔“ رضیہ غصے میں گرجی۔

کرانتی کو بخار ہے تو شاہین کو دکھاؤ۔۔۔ شاہین کے پاس تو تمہارے ہر دکھ کی دوا موجود ہے۔۔۔“ پھر وہ خود ہی ”سسکتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

ممانی بیگم کی ڈانٹیں نئی نہ تھیں کہ اس پر کوئی اثر ہوتا۔

کرانتی کو بلانکٹ اڑھا کر اس نے اپنے بستر پر لٹا دیا۔ تو ممانی بیگم کے کمرے سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔

ڈرائنگ روم میں اخبار پڑھتا ہوا راشد۔۔۔ سوتا ہوا شاہین۔۔۔ غزل۔۔۔ نوکر۔۔۔ ماما۔۔۔ سب ہی دوڑ پڑے۔

رضیہ کھلی ہوئی سیف پکڑے چلا رہی تھی۔

”میں لٹ گئی۔۔۔ میرا سارا زیور۔۔۔ پیسہ۔۔۔ مجھے کسی نے لوٹ لیا۔۔۔ تباہ کر دیا۔۔۔“

سب حیران تھے۔ راشد نے سیف کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاہین نے پورے کمرے کی تلاشی لی۔ واقعی کسی نے رضیہ کے سربانے سے چابی نکال کر سیف کھولی تھی اور اس میں سے صرف وہ زیور نکال لئے تھے جو اس خاندان کی دولت تھے۔ رضیہ کے جہیز والے زیوروں کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا، غزل ڈر کے مارے بے ہوش ہوئی جارہی تھی۔ کیونکہ بچپن سے ہر نا کردہ گناہ کی سزا اسے ملتی رہی تھی۔ آج جانے کیسا قمر نازل ہوگا اس پر۔

شاہین پولیس اسٹیشن فون کرنے لگا تو راشد نے آ کر فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

”احمق۔۔۔ کیا لنگڑی پھو ہو کو جیل بھجوائے گا۔ پہلے معلوم تو کرنے دو کہ معاملہ کیا ہے۔۔۔؟“

لنگڑی پھو ہو۔۔۔ شاہین نے تعجب سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ اور کیا۔۔۔“

شام تک راشد کو معلوم ہو گیا کہ لنگڑی پھو ہو نے شیخو بھائی سے نکاح کر لیا ہے۔ وہ اپنا سارا قیمتی سامان راتوں رات لے گئیں۔ رضیہ کے سیف میں سے وہ روپیہ اور زیور بھی لے گئیں جو ان کا حق تھا۔ لیکن اس پر واحد حسین قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ لنگڑی پھو ہونے کہلا بھیجا تھا کہ وہ مقدمہ بازی کے لئے تیار ہیں۔

”میں تو اسے پولیس میں دے دوں گی۔ اجاڑ صورت۔ بے شرم بڑھی اس بڑھاپے میں منہ کالا کرتے شرم بھی نہ آئی۔“

رضیہ کا چلاتے چلاتے منہ سرخ ہو گیا تھا۔

کیا پاگل ہوئی ہو۔۔۔ راشد نے اسے سمجھایا۔

اگر مقدمہ چلا تو آدھے ”ایوان غزل“ سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جائداد اور روپیہ پیسہ۔ ہر چیز مینسے آدھا حصہ دینا ”

پڑیگا۔

اللہ تو بہ اس خاندان کی پوٹیاں۔۔۔ اجاڑ صورتیں۔

بڑھاپے میں بھی تو بھروسے کے قابل نہیں۔ بال سفید کر دیئے کمر توڑ دی۔ مگر پھر بھی بڑھی کی مستی نہیں گئی۔

”جانے کب سے اس پیوٹ بڑھے پر نظریں رکھے بیٹھی تھی۔

رضیہ مسلسل بڑ بڑانے لگی۔

چلو ایک رقیب روسیا تو راہ سے ہٹا۔۔۔ اندر آ کر شاہین نے بڑی خوشی کے ساتھ غزل سے کہا۔ اور غزل سچ مچ رو ”

پڑی۔۔۔ شیخو بھائی کے چھن جانے پر۔۔۔

شاہین۔ اب اور کیا ہونے والا ہے۔۔۔؟“ اس نے پاگلوں کی طرح پوچھا۔

جی۔۔۔ آپ کو شرکت کی زحمت دی جانے والی ہے کہ میرے فرزند ڈاکٹر شاہین راشد کا عقد آج شام غزالہ سلطانہ ”

سے طے پایا ہے۔ آپ کی شرکت باعث مسرت۔۔۔

اور اس عقد مسعود کی رات غزل بار بار سوچ رہی تھی کہ لڑکیاں کتنا جھوٹ بولتی ہیں۔ اس وقت کے بارے میں۔۔۔ مجھے تو شہنائی کے سروں میں کوئی نشہ گھلتا نہیں لگ رہا ہے۔ نہ تو چاند تارے کہیں چٹک رہے ہیں اور نہ میرے دل میں کہیں کلیاں لہک رہی ہیں۔۔۔ ”ایوان غزل“ کی ساری اداسی اور مایوسی کا اندھیرا امیری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔۔۔ گھبرا کر وہ نصیر والی بیرے کی انگوٹھی کو بار بار اتارتی پھر پہن لیتی۔ تب شاہین اس کے پاس آیا۔ اور اس کی تھوڑی اٹھا کر بولا۔

”غزل۔۔۔ اب ڈرنا چھوڑ دو۔۔۔ سوچنا چھوڑ دو۔۔۔ آج سے وہی ہوگا جو تم چاہو گی۔۔۔“

نہیں۔ نہیں۔۔۔“ وہ چلا کر رو پڑی۔

شاہین خدا کے لیے میری اتنی انسٹلٹ مت کرو۔ میں کچھ نہیں چاہتی

مگر شاہین اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے غزل کو جو ہی کے نرم و نازک پھولوں کی طرح چھوا۔ اس کی صورت دیکھے گیا۔ اس کی باتیں سنتا رہا۔

شادی کے بعد وہ لوگ ”ایوان غزل“ کی اوپر والی منزل پر رہنے چلے مگر کرانتی کو ہاسپٹل سے گھر بلوالیا۔ اور وہ نیچے ایک کمرے میں رہنے لگی۔

میں کلینک چلا جاؤں۔۔۔؟ آج کونسی پکچر دیکھنا ہے۔۔۔؟“

آج تم کیا کھاؤ گی۔۔۔؟ ذرا امی سے بات کرنے نیچے چلا جاؤں۔۔۔؟“ وہ ہر بات غزل سے پوچھ کر کرتا۔

مگر اتنی محبت غزل کہاں سینٹ کر رکھتی۔ وہ جو بچپن سے جو تیاں اور تھپڑ کھانے کی عادی رہی تھی۔ شاہین کے خلوص اور محبت کی مٹھاس سے ابکائیاں لینے لگی۔ اسے یوں لگتا جیسے شاہین اس کا وہ شو ہر نہیں ہے جس کے ساتھ زندگی بھر لڑنے اور ملنے کے اس نے خواب دیکھے تھے جس کے ظلم سہہ کر آنسو بہانے اور اس کے پیر دبانے کا ارمان وہ دل میں چھپائے بیٹھی تھی۔ شاہین تو ایک اجنبی تھا۔ ایک ایسا شخص جو اتفاق سے اس کی زندگی میں گھس آیا تھا۔ ایک اجنبی جو اسے بیوی نہیں طوائف سمجھتا ہے۔ اور اس کی جسم کی خواہشوں کو سمجھنا ہی اس نے اپنا سب سے اہم کام سمجھ رکھا ہے۔ جیسے غزل کو اتنے مردوں کے پاس صرف جسم کے مطالبے ہی لے گئے تھے۔

اس لئے شاہین جب اسے اپنے پاس کھینچتا تو غزل اس سے میلوں دور ہو جاتی۔ اتنی دور کے شاہین کو چھونے کے لئے اس کے ہاتھ ہی نہ پہنچتے۔ اس نے غزل کے لئے نئی کار خریدی، بنجارہ ہلز پر زمین لے کر مکان بنوانا شروع کر دیا۔ کرانتی کو اپنی بیٹی بنا کر پالنے کا وعدہ کیا۔ اور اسے کونونٹ میں داخل کر دیا۔ شوخ تیز طرار کرانتی جتنی بڑی ہوتی جارہی تھی اس کی دوگنی رفتار سے اس کی عقل بڑھ رہی تھی۔ اسکول کی ہر کلاس میں اس کی فرسٹ ڈویژن آئی مگر ٹیچر سے بدزبانی کرنے پر اسے سخت سزائیں بھی ملا کرتیں۔ شاہین اس کے لئے بہترین کپڑے خریدتا تھا، اس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا۔ ایک بار غزل نے اسے ٹو کا بھی۔

”آخر ہم کرانتی پر کیوں اتنا روپیہ ضائع کریں۔ اسے پڑھا دیں یہی کافی ہے۔۔۔“

شاہین نے کہا۔

تو کیا ہوا۔ تم بچے پیدا مت کرنا۔ تا کہ کرانتی مزے میں رہے اور تم بھی بچوں کی جھنجھٹ سے آزاد رہ کر خوب ”مزے کرو۔ عیش کرو۔۔۔

عیش عیش... آخر میں کتنا عیش کروں گی۔۔۔“ بعض وقت غزل سوچتی شاہین تو سچ مچ فرشتہ ہے۔ وہ میرے آرام کے ”
لئے کیسے کیسے پلان بنا رہا ہے۔ مگر بچے کیوں نہ ہوں۔ اس کا تو جی چاہتا تھا کہ چھ سات بچے ہو جائیں۔ اور ان کی چیخ و
پکار میں غزل اپنے آپ کو بھول جائے۔ اس کا دماغ خالی ہو جائے۔ اپنے ذہن کا یہ بوجھ وہ کسی کو نہ دے سکتی تھی اپنی اولاد
کے سوا۔

شاہین تو اسے بے تحاشہ محبت دے دے کر پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ اور کرانتی بے حد سرکش تھی بے انتہا غیر جذباتی۔
وہ غزل کی محبت کا بھی مذاق اڑاتی تھی۔ ایک بار آٹھ برس کی کرانتی نے اس سے پوچھا تھا۔

”غزل آنتی، رضیہ آنتی کہتی ہیں کہ جب آپ کے بچہ ہو جائے گا تو آپ مجھ سے محبت نہیں کریں گی۔۔۔؟“

تو میری چاند ہے۔ چاند۔۔۔ بھلا میں اپنی کرانتی سے بھی کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ پگلی۔۔۔“ اس نے سچ مچ کر انتی ”
کو سینے سے لگا کر کہا تھا۔

مگر مجھے تو تعجب ہوتا ہے آنتی کہ آپ کو اور شاہین انکل کو مجھے پالینے سے کیا فائدہ۔۔۔؟ میں کوئی آپ کی بیٹی ”
”تھوڑی ہوں۔۔۔؟“

”بے وقوف۔۔۔ کیا ہر بات کسی فائدے کے لئے کی جاتی ہے؟“

تو کیوں نہیں کی جاتی؟“ کرانتی نے بھی چلا کر جواب دیا۔

دیکھنے نا آنتی۔ اب آپ نے مجھ پر اتنے بہت سے پیسے خرچ کر کے مجھے بڑا کر دیا نا تو اس کے بدلے میں ”
”مجھے بھی آپ سے محبت کرنا پڑے گی نا؟“

غزل کتاب ہاتھ سے رکھ کر کرانتی کو دیکھنے لگتی۔

یہ دس بارہ برس کی بچی۔۔۔ جو جانتی تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ اور جنہوں نے اسے جینا سکھایا ہے وہ ان
کی مقروض ہے۔

میرے اللہ۔۔۔ کرانتی کو پناہ کہاں ملے گی۔۔۔؟

وہ تو مجھ سے بھی زیادہ زہر پی رہی ہے۔ کیا وہ بھی زندگی بھر تنہائی کی آگ میں جلے گی۔ لوگ اس پر ترس کھا
نیں گے۔ یا نفرت کریں گے۔

قیصر اور سنجیو آ کی یہ نسل۔۔۔ ”ایوان غزل“ میں کیا کرنے کے لئے آئی ہے۔

غزل کو ہر وقت گم سم دیکھ کر شاہین کے دل پر چوٹ سی لگتی۔

ایہ لڑکی اب بھی خوش نہیں ہے۔ اب میں اور اس کے لئے کیا کروں۔۔

شاہین نے ڈاکٹری کے علاوہ فرائیڈ کو بھی پڑھا تھا، اور کارل مارکس کو بھی۔۔ وہ اپنے وقت کی تمام تحریکوں سے متاثر تھا اسنے انسان کے جسم پر ریسرچ کی تھی۔ اور انسان کے ذہن کی پیچید گیوں پر بھی غور کیا تھا۔ ستائیس برس میں اس نے دنیا کو کھول کر ادھیڑ کر۔ پرزے پرزے کر کے بھی دیکھا تھا۔ اور اپنی مٹھی میں تڑپنے والی تتلی کی طرح محسوس کیا تھا۔ اس نے اپنے خاندان اور اپنی روایتوں کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس نے اپنے والدین کے احساسات کو اپنی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں مانا۔ کیونکہ وہ زندگی سے محبت کرتا تھا۔ اسے اپنی ذات کی آزادی بہت عزیز تھی۔ شاید اسی لئے اس نے کسی عورت سے ابھی تک عشق نہیں کیا تھا۔ صرف اپنی جسمانی اور ذہنی تقاضے ضرور پورے کئے تھے، یہی وجہ تھی کہ غزل اس کی زندگی میں پہلی لڑکی نہیں تھی۔

وہ جانتا تھا کہ غزل کی زندگی میں بھی وہ پہلا مر نہیں ہے۔ لیکن اس نے عورت کے جسم کی پاکیزگی کو کبھی اہمیت نہیں دی۔

اس نے تو محبت کو بھی کبھی قابل توجہ نہیں سمجھا۔ ممکن ہے غزل کا مسئلہ گھر میں ہوں نہ اٹھ کھڑا ہوتا تو وہ ابھی اور دس پانچ برس تک میڈیکل کالج کی لڑکیوں اور نرسوں کے ساتھ وقت گزار دیتا ممکن ہے اس لڑکی سے شادی پر راضی ہو جاتا۔ جو امی نے اس کے لئے ڈھونڈ رکھی تھی۔۔ مگر یہ خود اس کی مرضی پر تھا۔ وہ اپنے مسئلہ پر۔ اپنے معاملے میں ہر کام میں خود مختار رہنا چاہتا تھا۔ کسی کی دھونس اور مصلحت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان لڑکیوں کو پل بھر میں پہچان لیتا تھا۔ جو مرد پر کئی طرح سے جال پھینکتی ہیں۔

اسے ہمیشہ کے لئے پھانسنے کو۔۔ اگر غزل بھی اس پر توجہ دیتی۔ اگر امی اور لنگڑی پھوپو غزل کے مسئلہ کو انی اہمیت نہ دیتیں تو شاید وہ بھی شیخو بھائی کی بجائے کسی اور مرد کی تلاش میں روانہ ہو جاتا جو غزل کا ہاتھ تھام سکے۔

مگر غزل اس بات کو ناممکن کیوں سمجھتی تھی۔ کہ وہ غزل سے شادی کر سکتا ہے۔۔؟ امی یہ کیونسمجھتی ہیں کہ ایک بد نام اور بے سہارا لڑکی ان کی بہو نہیں بن سکتی! اور اس نے یہ کر دکھایا۔

پھر اس نے غزل کو اس بات کا بھی یقین دلانا چاہا کہ وہ اس کے ساتھ شوہر کا ہر فرض نبھائے گا۔ اس سے زیادہ اور! کیا ہو سکتا تھا

مگر غزل شاید ابھی تک پرانی یادوں کے حصار سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ جاہل اور ناسمجھ لڑکی۔ وہ شاید اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ نصیر کی پہلی محبت ہی اس کی حق دار ہے۔ اسی لئے نصیر کی دی ہوئی انگوٹھی اس کی انگلی میں پڑی تھی۔ اور وہ شاہین کے ساتھ یوں نبھا رہی تھی جیسے اس کی بیوی نہ ہو۔ اس کی خادمہ ہو۔ دو پیسے کی چھوکری۔ جسے کسی بھی وقت دھتکارا جا سکتا ہے۔

رفتہ رفتہ شاہین نے پکچر جانے کا پروگرام بنانا چھوڑ دیا۔ کیونکہ باہر نکلتے ہی غزل گھبرا گھبرا کے ان شناسا چہروں کو ڈھونڈھے جاتی تھی جو انہیں ساتھ دیکھ رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی مل نہ جائے، کوئی کچھ پوچھ نہ بیٹھے۔

جھنجھلا کر شاہین کہتا۔

آخر تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ اس دنیا میں اس دنیا میں تم دوسرا جنم لو تا کہ لوگ تمہیں نہیں پہچانیں۔۔! ادھر ادھر ”
”دیکھنا چھوڑ دو۔۔ تم صرف مجھے دیکھا کرو۔۔ میں نے تمہارے اس خوف کی وجہ سے لوگوں سے تمہیں ملانا چھوڑ دیا ہے۔

اور غزل گھبرا کے سر جھکا لیتی۔

پردے پر ڈائریکٹر جانے کیا جھک مارتا ، دلپ کمار کیسی ایکٹنگ کرتا۔ بس یہاں تو دونوں ایک جگہ بیٹھے اپنے اپنے دلوں میں جانے کیا کیا خوف، اندیشے اور شکایتوں کی ہانڈی پکائے جاتے۔

چلو اٹھو۔۔۔ پکچر ختم ہوگئی۔۔۔“ وہ کھڑا ہو جاتا۔ ”

غزل چونک کر کھڑی ہو جاتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اپنی دھن میں غزل نے پکچر ہال سے باہر نکلتے وقت شاہین کی بجائے کسی اور مرد کے ہاتھ میں ہاتھ تھا دیا۔ کسی اور کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگی۔۔۔ شاہین نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کار کی طرف بڑھ گیا۔ پھر چونک کر غزل نے اپنے آس پاس دیکھا۔۔۔ نیلی کار کو پہچان کر وہ سمجھ گئی کہ شاہین ہی اس کے اندر بیٹھا ہوگا۔۔۔

رات کو کلینک سے آنے کے بعد اب وہ غزل سے چونچلے بھگارنے کی بجائے اپنے اسٹڈی روم میں اخبار رسالے پھیلا کر بیٹھ جاتا۔ تب غزل کا کلیجہ اور پھٹتا تھا۔

دیکھا۔۔۔ آخر وہ مجھ سے بیزار ہو بی گیا۔ کب تک زبر دستی کا ڈھونگ رچائے گا۔۔۔! وہ مجھے بھی اپنے دوستوں سے ” نہیں ملاتا میں کہیں باہر جاؤں تو بار بار یہی دیکھتا رہتا ہے کہ میں کسے دیکھ رہی ہوں اس نے مجھ سے آج تک کبھی گانے کی ”فرمائش نہیں کی، کبھی نصیر، بلگرامی، بہان اور سرور کے بارے میں نہیں پوچھا۔

رفتہ رفتہ شاہین کی مقبولیت بڑھتی گئی۔۔۔ کیوں کہ غزل سے مایوس ہو کر اس نے اپنے کام پر پوری توجہ دینا شروع کر دی تھی ، ابھی تک یوں بھی حیدرآباد میں اچھے ہارٹ اسپیشلسٹ بہت کم تھے۔ اس لئے اس کا سارا وقت اپنے کام میں گذرنے لگا۔ صبح آٹھ بجے سے کلینک شروع ہو جاتا۔ دو پہر میں کھانے کے وقت غزل سے کچھ بنسی مذاق چلتا اس کے بعد رات کے گیارہ بجے تک ہاسپٹل کی ڈیوٹی پھر مریضوں کے گھروں پر جانا۔

اور پھر رات آتی۔۔۔ اندیشے۔۔۔ مصلحتیں۔۔۔ احتیاطیں لئے ہوئے اور غزل کو رلا رلا دیتی۔

شاہین کے اتے محتاط رہنے پر ایک دن غزل جھنجھلا گئی۔

شاہین۔ اب ہماری شادی کو پانچ برس ہو گئے۔ میں نے بہت عیش کر لئے۔ اب مجھے انا بچہ چاہیئے۔ میں کب تک ”اکیلی رہوں؟“

میں جو ہوں تمہارے لئے۔۔۔ بے وقوف۔ بچے ہوں گے تو اور پریشان ہو جاؤ گی۔ دیکھ لو کرانتی اپنے والدین پر کیسی ” تنقید کرتی ہے تو تم یونہی لوگوں کے خوف سے کبھی رہتی ہو۔۔۔

شاہین کی بات سن کر وہ چپ ہو گئی۔۔۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“

میں کون تھی۔۔۔ کیا تھی۔۔۔ میں اس بات کو بھول چکی ہوں مگر شاہین نہیں بھولا۔ اس کے بچے بھی نہیں بھولیں گے۔ ” اسی لئے وہ اپنے بچوں کی ماں مجھے بنانا نہیں چاہتا۔ وہ بد نام لڑکی جس سے شادی کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ مگر شاہین نے اس کی خاطر یہ ایثار کیا۔ اتنی بڑی قربانی دی۔ وہ چاہتا تو شادی کے دو چار مہینے بعد مجھ سے کھیل کر مجھے رخصت دے دیتا۔ مگر اس فرض کو نبھائے جارہا تھا۔

اسی لئے وہ فوزیہ کے بچوں کو کاندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرتا بچوں کے کھلونے اور کلینڈر خرید کر لاتا ہے۔ پندرہ برس کی کرانتی سے بچوں کی طرح باتیں کرتا۔ مگر میری کوکھ سے کونیل اگا کٹر ”ایوان غزل“ کے باغ کی خوبصورتی بگاڑنا نہیں چاہتا۔

اب کیا سوچنا شروع کر دیا۔۔۔ اس نے غزل کا سر ہلا کر پوچھا اور پھر سنجیدگی سے کہا۔

غزل۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکا۔ میں وہ مرد نہیں تھا۔ تم نے جس کے خواب دیکھے تھے۔ ” بعض وقت مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم نے میری خواہش پر اپنے آپ کو قربان کر دیا ہے۔ مگر یقین مانو میں تمہارے کسی ” راستے پر نہیں کھڑا ہوں، تم جہاں چاہے جاسکتی ہو۔ جو چاہے کر سکتی ہو۔۔۔

میں جانتی ہوں۔۔۔“ غزل نے بڑی بے بسی کے ساتھ چلا کر کہا۔

مگر خدا کے لئے اپنی زبان سے یہ مت کہو کہ اس گھر سے چلی جاؤ“ اور پھر وہ چپ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس ” نے غلطی کی ہے۔ وہ مجھے اب ہر جگہ بھیجنے کو تیار ہے۔ ہر لمحہ چھوڑنے کو راضی ہے۔ وہ میری راہ سے ہٹتا جا رہا ہے۔ مگر میں کہاں جاؤں۔۔۔؟

وہ دونوں باتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

بس اب شروع ہو گیا روتا۔۔۔“ شاہین نے برا مان کر کہا۔

تم سے تو بات کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر میں کیا کروں۔۔۔؟“

”سالی زندگی تو ایک عذاب ہو گئی ہے۔

وہ منی بار، کھول کر شراب کی بوتل نکالنے لگا۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ دونوں منہ سجائے بیٹھے تھے کہ کرانتی اپنی رپورٹ لے کر آئی۔ اس کا میٹرک کا رزلٹ آیا تھا۔ وہ فرسٹ ڈویژن پاس ہوئی تھی۔

”انکل۔ اب آپ مجھے سائیکل ضرور د لا ئے۔ آپ نے پر دھر کیا تھا۔“

لڑکیاں سائیکل نہیں چلاتیں۔ تم نے کسی لڑکی کو سائیکل چلاتے دیکھا ہے۔“ غزل نے اسے سمجھایا۔

”نہ چلا ئیں۔ میں تو چلاؤں گی۔ تو کوئی میرا کیا کر لے گا ؟“

ابھی سے اتنی خودسری۔ کبھی میری بات نہیں مانتی۔“ غزل نے مدد کے لئے شاہین کو دیکھا۔

یہ ’ایوان غزل‘ کی روایت ہے۔“ اور پھر شاہین نے کرانتی سے کہا۔

”ہم لا دیں گے تمہیں سائیکل۔“

اور لاوارث لڑکیوں پر رحم کھانے کی روایت آپ قائم کر رہے ہیں۔“ غزل نے تنک کر پوچھا۔

رحم۔؟ میں کسی پر جم کر سکتا ہوں۔“ شاہین نے سگریٹ جلا کر ماچس کی تیلی بجھائی۔

میں تو ظالم ہے رحم ڈاکٹر ہوں۔ دل چیر چیر کے پھینکنے والا۔ انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والا۔ میں کیا جانوں ” رحم کیا ہوتا ہے۔ جذبات کیا ہوتے ہیں۔ محبت کیسی ہوتی ہے؟

صاف کہو نا کہ تمہیں مجھ سے کچھ نہیں ملا۔ محبت نہ قدر نہ انصاف“ غزل غصے کے مارے چلانے لگی۔

ایک رنٹی سے بیاہ کر کے تمہیں اور کیا ملے گا۔۔۔؟ تم کس چیز کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ تم نے مجھے محبت ، ”
”دولت اور اپنی پناہ کی بھیک دی۔ مگر میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہ بعد میں پچھتاؤ گے۔

مگر آپ کو پچھتانے کی کیا ضرورت ہے انکل۔۔۔؟ اگر آنتی آپ کو سوٹ نہیں کرتیں تو آپ ڈایورس کیوں نے لے ”
”لیتے۔۔۔؟

کرانتی نے شاہین کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اچانک کہا۔

اس کی بات سن کر غزل اور شاہین اچانک چپ ہو گئے۔ کیوں کہ وہ دونوں اس بات کو بھول چکے تھے کہ کرانتی اب پندرہ سال کی ہو چکی تھی۔ اور اس نے بہت سی کتاب ہیں، ناولیں، کہانیاں پڑھ ڈالی تھیں۔ وہ دن رات کتابوں میں کھوئی رہتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی اسکول کی رپورٹ بری نہیں آئی۔ اس کے بہت کم دوست تھے۔ وہ ہر جگہ تنہا تنہا اکیلی اکیلی پھرتی چھٹیوں میں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی تھی تو اکیلی کہیں گھومنے نکل جاتی رنگ و برش لئے پیٹنگ کرتی۔ کھڑکی کھولے گھنٹوں بازار کا نظارہ کئے جاتی۔

غزل نے کتنا ہی چاہا کہ کرانتی اس سے دوستی بڑھالے۔ وہ بھی تو اکیلی تھی۔ کوئی تو ہوتا جو اس کی بات سنے۔ جس سے وہ اپنے دل کا حال کہے نیچے رہنے والی رضیہ اور راشد نے تو اس سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ اسے نیچے اترنے کا حکم نہیں تھا۔ شاہین کو اپنا بنا لینے کے جرم میں۔ کئی بار غزل نے سوچا۔ کہ رضیہ سے جا کر کہے کہ شاہین اس کا نہیں ہے۔ اس نے رضیہ سے کچھ بھی نہیں چھینا ہے۔ اس لئے اس نے کرانتی سے دل بہلانا چاہا۔ کیونکہ غزل کرانتی کو بہت چھوٹا سمجھتی تھی۔ بالکل نادان بچی۔ مگر آج اسے معلوم ہوا کہ وہ غزل اور شاہین کے نازک رشتے پر بھی غور کر چکی ہے۔

اب غزل کہاں جاتی ”ایوان غزل“ نے اسے ابھی تک شاہین کی داشتہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ نہ کبھی راشد نے اسے دلہن کہہ کر پکارا تھا۔ نہ رضیہ نے اسے ماں بننے کی دُعائیں دیں۔ رضیہ نے اسے کوئی خاندانی زیور تک نہ پہنا یا تھا۔ اس کی انگلی میں صرف وہی انگوٹھی تھی۔ جو نصیر کے خاندان کی بہو کو پہنا چاہیے۔ اس انگوٹھی کے بارے میں بھی کبھی شاہین نے نہیں پوچھا کہ یہ کس نے دی تھی۔ کئی بار غزل کے دل میں آیا کہ اب جبکہ وہ مسز شاہین بن چکی ہے۔ یہ انگوٹھی اس کی انگلی میں کیوں ہے! اس نے انگوٹھی اتار کے سنگار میز پر ڈال دی تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ بیزار سی ہو گئی۔ جیسے اس کا دم نکل رہا ہو۔ میں نے نصیر سے کہا تھا۔ کہ میری جان اب اس انگوٹھی میں ہے۔ اس نے نصیر کے بغیر جینا سیکھ لیا۔ مگر انگوٹھی کے بغیر وہ چند منٹ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک بار کرانتی نے اسے انگوٹھی سے کھیلتے دیکھ لیا۔

”یہ آپ کے انگیج منٹ کی انگوٹھی ہے نا آنتی۔۔۔“

ہاں ! اس انگوٹھی میں میری جان ہے۔“ جانے کیسے اتنے جذباتی لہجہ میں اس نے کرانتی سے یہ بات کہی۔ حالانکہ ”
اس دن کے بعد سے وہ کرانتی سے بات کرتے وقت بڑی محتاط رہتی تھی۔

”آپ کی جان۔۔۔! اوہ کیسے آنتی۔۔۔؟“

سنوکرانتی۔۔۔!“ اس نے فوراً بات بدل کر کہا۔

”میں مر جاؤں نا۔ تب بھی تم اس انگوٹھی کو میرے ہاتھ سے مت نکالنے دینا۔“

میں سمجھ گئی۔ یہ انگوٹھی آپ کے رومانس کی یاد گار ہے۔ مگر آپ کو یہ کیوں دھوکہ ہے آنتی کہ آپ کی جان ”
انگوٹھی میں آسکتی ہے۔“ کرانتی اس کی جہالت پر ہنسنے لگی۔

”تم کیا جانو ان باتوں کو۔ جب بڑی ہو جاؤ گی تو پتہ چلے گا۔“

تو کیا آنتی آپ مجھے چھوٹا سمجھتی ہیں۔ سولہ سال کی لڑکی اوہ، میں اتنی بڑی ہوں نا آنتی۔۔۔ اب تو میں نے سیکس ”
 “پر بھی کتابیں پڑھی ہیں۔

سیکس پر۔۔۔؟“ غزل چونک پڑی۔

ہاں آنتی۔۔۔“ اس نے اپنی بات کی دھن میں غزل کے تعجب کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

آنتی آپ نے کیسی محبت کی۔ پھر شاہین انکل سے شادی بھی کر لی۔ اور اب رورو کے ان ہی کے ساتھ رہنا چاہتی ”
 “ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کا کیس۔۔۔

کرائنتی بڑے اطمینان سے غزل کے پلنگ پر لیٹی قلابازیاں کھا رہی تھی اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کے
 کٹے ہوئے گھنے بال سارے چہرہ پر بکھر گئے تھے۔ اور چھوٹی سی اسکرٹ کے نیچے اس کی سیاہ صحت مند را نیں نظر آ
 رہی تھیں۔

تو اسی لئے تم نے ابھی تک کسی سے محبت نہیں کی۔“ غزل نے بڑی مشکل سے ہنسی مذاق کا موڈ برقرار رکھا۔ وہ ”
 بہت دن سے چاہتی تھی کہ کر انتی سے کھل کر باتیں کرے اور اس کی کہیں شادی ہو جائے تو اس جھنجھٹ سے نجات ملے۔

میں محبت کیسے کروں آنتی۔۔۔ ! کالج میں بھی بہت سی لڑکیاں یہی پوچھتی ہیں۔۔۔“ وہ تکیہ سینے کے رکھ کر اوندھی ”
 لیٹ گئی۔

کسی ایک ہی لڑکے کے بارے میں کتنا ہی سوچوں مگر پھر خیال بھٹک جاتے ہیں۔۔۔“ وہ بڑی معصومیت سے کہہ ”
 رہی تھی۔

اچھا آنتی۔ ایک بات بتاؤں ؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

“ایک لڑکا سعادت تو مجھ سے محبت کر بھی چکا ہے۔“

اچھا۔۔۔؟“ غزل سنبھل کر بیٹھ گئی۔

“کیا کیا ہوا۔! مجھے پوری بات سناؤ۔“

مگر کر انتی پھر لیٹ گئی جیسے کوئی بہت اہم بات نہ ہوئی ہو۔

پھر وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر چت لیٹ گئی اور چھت کی طرف دیکھ کر بولی۔

میرا کلاس فیلو ایک لڑکا ہے سعادت، وہ اکثر میرے پیچھے پیچھے گھومتا تھا آنتی۔ ہر بات میں میری تائید کرتا۔ ”
 میرے لئے کیڈ بری جاکلیٹ اور چیونگم لا تا تھا۔ میرے نوٹس بھی تیار کر کے دیئے تھے۔۔۔ وہ ہماری کلاس کا بڑا پڑھا کولڑ کا
 ہے۔ تو ایک دن کالج جاتے وقت بس میں اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے بہت چاہتا ہے بس ہر وقت میرا ہی خیال ہے اسے۔۔۔
 تو آنتی میں فوراً سمجھ گئی اس کی بات۔۔۔ اور پھر کر انتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

“مگر آنتی۔۔۔ سچی بات کہنے پر آپ خفا تو نہیں ہوں گی۔۔۔؟“

نہیں۔۔۔ تم پوری بات سناؤ۔۔۔ غزل جانتی تھی۔ یہ ان لوگوں کی اولاد ہے۔ جنہوں نے بیچ کی لڑائی میں جان دی تھی۔

تو آنتی ایک دن جب سعادت نے مجھ سے کہا کہ آج رات ٹینک بند پر ملیں گے تو میں وہاں چلی گئی۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ اب یہ بتاؤ کسی ہوٹل میں کمرہ لو گے یا اپنے گھر مجھے لے چلو گے۔ کیوں کہ آپ کے ڈرسے میں اسے یہاں تو ”نہیں لاسکتی تھی نا۔۔۔“

اس نے اپنا بالوں کی لٹیں جھٹک کر بڑی شوخی سے غزل کو دیکھا جو اس کی بات منہ کھولے سن رہی تھی۔

میری بات سن کر وہ گھبرانے لگا۔ پھر کہنے لگا کہ کراؤ یہ بتاؤ کہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو سکتے ہیں۔ یا نہیں۔؟ لو۔۔۔ پھر وہی جہالت کی باتیں۔ سچی آنتی مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے کہا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تم سے صرف اسی وقت کی بات کر رہی ہوں۔ تم مجھے پسند ہو اس لئے میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔۔۔ مگر آنتی۔۔۔ وہ تو بس ایک ہی ”بات پر اڑا ہوا تھاکہ پہلے یہ بتاؤ مجھ سے شادی کروگی یا نہیں۔؟“

پھر کیا ہوا۔۔۔؟“ غزل نے لرز کر پوچھا۔

بس میرا موڈ خراب ہو گیا۔۔۔“ وہ زور زور سے اپنا پیر جلانے لگی۔

میں کیوں کرتی اس کے ساتھ شادی۔ شادی کے بعد زندگی بھر مجھے اس کی بات ماننا پڑتی۔ اور وہ مجھ پر ایثار و قربانی کے احسان رکھتا۔ آپ ہی سوچئے نا آنتی کہ کوئی بھی میاں بیوی مکمل آزادی کے ساتھ کہاں رہتے ہیں۔ اور میں تو ایسا ”کبھی نہیں کروں گی کہ دل نہ جانے پر بھی اپنے شوہر کو دھوکا دیے جاؤں۔۔۔“

”تو آنتی میری باتیں سن کر فوراً بھاگا پھر کبھی اُوں گا۔“

ہاہاہا۔“ وہ تیکے میں منہ چھپا کر خوب ہنسی۔

آنتی یہ جو ہمارے کالج کے لڑکے ہیں نا۔ سب کے سب اپنے پیرنٹس سے بہت ڈرتے ہیں۔ جب تک ان کی ممی کی ”پسند نہ ہو وہ کسی لڑکی سے لو نہیں کر سکتے۔ سب بڑے بزدل ہیں۔

تم کون ہو۔۔۔؟“ غزل نے اسے غور سے دیکھ کر پوچھا۔

میں ! میں تو بس کراؤتی ہوں۔ آنتی ! آپ کو معلوم ہے میری ممی اور ڈیڈی نے کیا کیا غلطیاں کی تھیں ! ہمارے لیکچر ”ار گوپال ریڈی نے مجھے سب بتایا ہے۔ وہ بڑے جینٹل اسکالر ہیں۔ آپ سے اور انکل سے ملانے میں کبھی انہیں گھر لاؤں گی۔“ آنتی، گوپال ریڈی نے مجھے بتایا ہے کہ مجھے کل کیا کرنا ہے۔ کدھر جاتا ہے۔۔۔

کراؤتی باتیں کرتے کرتے تھک گئی۔ بڑی دیر تک چھت کو گھورتی رہی۔ جانے کیا سوچے گئی۔

پہراچانک اٹھ بیٹھی اور پلنگ سے نیچے کود کر بولی۔

”اب چلے ہم بھی اپنا حق چھیننے۔“

مگر غزل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی فضا میں گھور رہی تھی۔

اور

اس کے دونوں گال آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے۔

ایوان غزل“ کا وہ سجا بنا باغ اب اجاڑ پڑا تھا۔ ساری ڈیوڑھی میں سنائٹا گونجتا رہتا۔ سوکھے پتے آنسوؤں کی طرح ” دن بھر گرا کرتے۔ پھر کبھی شاہین کے حکم پر کریم دھوبی کو بلایا جاتا جو سارے پتے سمیٹ کر لے جاتا تھا۔

آم اور سیتا پھل، چیکو اور نارنگیاں خود ہی پک پک کر گرتی تھیں مگر انہیں اٹھانے کے لئے کوئی بچہ نہیں دوڑتا تھا۔۔۔ باغ کے تمام پودے ڈسپلین اور قواعد کو بھول کر کانٹے دار جھاڑیوں میں مل گئے تھے۔

اندر بھی سارے کمرے بند پڑے تھے۔ رضیہ سر شام ور انڈے کی لائٹ کھول دیتی۔ یا اس کے کمرے کا بلب جلنا تھا۔ گیارہ بجے راشد واپس آتا تو وہ دونوں وہیں چوکی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔۔۔ بسم اللہ ہی جلدی جلدی برتن سمیٹتی اور سو جاتی تھی۔

ایوان غزل“ کا سب سے بڑا ہال البتہ ابھی تک آباد تھا کیوں کہ راشد وہیں بیٹھتا تھا۔ اس نے اب گتے داری چھوڑ کر ” کانگریس میں شرکت کر لی تھی اور پہلا الیکشن ہوا تو کانگریس کے ٹکٹ پر وہ بھی کھڑا ہوا۔

چند دن بعد رضیہ نے کرانتی کو بھی اوپر بھیج دیا تھا۔ اوپر والے حصے میں بھی بہت کم شور مچتا۔ کالج سے آنے کے بعد کچھ دیر کرانتی کی چیخ و پکار ہنسی مذاق گونجتی تھی۔ اس کے بعد وہ کوئی کتاب لے کر اپنے کمرے میں لیٹ جاتی تھی۔

نیچے غزل اور کرانتی کی آواز بھی نہ پہنچتی تھی۔

بابر لان میں پھدکنے والی رنگین چڑیا اب بھی دالان کے سامنے، کر یا پات کے درخت پر آ کر بیٹھتی تھی۔ اور چاروں طرف گھوم گھوم کر دم ہلا ہلا کر ہر شخص کا انگریزی میں احوال پوچھتی۔۔۔

شوں شوں۔۔۔ شو۔۔۔ وو۔۔۔ یہ سیٹی بجانے والی ننھی سی چڑیا حیران تھی کہ اس گھر پر ایسا سنائٹا کیوں چھا گیا ہے۔ واحد حسین کہاں گئے جنہوں نے اس چڑیا کو مخاطب کر کے اپنی برائی غزل سنائی تھی لنگڑی پھوپھو کہاں ہیں جنہیں اپنی آواز کے آگے اس چڑیا کی آواز کبھی نہ بھائی۔

”بھاگ اجاڑ صورت یاں سے۔ جب دیکھو پکارا کرتی ہے۔۔۔“

وہ ننھے ننھے بچے کہاں گئے جو سوپ کا جال بنا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ تنک مزاج بشیر، جس نے ایک بار سے پتھر کھینچ مارا تھا۔۔۔ رحم دل بتول جو اسے ہمیشہ روٹی کے ٹکڑے ڈالا کرتی تھی۔ شوخ و چنچل چاند جو اس کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی سیٹی بجانے لگتی۔۔۔ روتی صورت غزل جسے کبھی اس کی سیٹی بھی نہ ہنسا سکی۔۔۔

ادھر فوزیہ بھی مہینوں میکے نہ آئی۔

اپنے اکلوتے بھائی کی اس حماقت پر اسے بھی ماں کے ساتھ بے حد غصہ آیا تھا۔ افسوس بھی ہوا کیوں کہ بھائی کے بیابہ میں گھوڑے جوڑے پر لڑائی لڑنے اور مہینوں گھر میں دھوم مچانے کے ارمان دل ہی میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ غزل سے نفرت نہ کر سکی۔ کیونکہ غزل اس کی ہم عمر سہیلی بھی تھی۔ اس کے بچپن کی ساتھی تھی۔ اور شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قسمت نے فوزیہ کو کچھ نہ دیا تھا۔ شوہر کی محبت سے مایوس ہو کر اس نے اپنے بچوں میں پناہ لی تھی تو اکتھے سات بچے پیدا کر ڈالے۔ ان میں سب سے چھوٹے بچے کو رضیہ پالتی تھی کہ فوزیہ کا کچھ بوجھ کم ہو۔ پھر جب اس چھوٹے سے چھوٹا آجا تا تو بڑا ماں باپ کے پاس بھیج دیا جا تا تھا۔ فوزیہ کا ڈاکٹر شوہر اب تین بیویوں کا رکھوالا تھا۔

ہر بیوی کے پانچ سات بچے تھے۔ اس لئے وہ بیویوں سے گھبرا کے گھر کی ماماؤں اور ہاسپٹل کی نرسیوں میں پناہ لیتا تھا۔ فوزیہ کی وہ بے پناہ خوبصورتی اور تنک مزاجی جانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ سوکھ کر کانٹا بوگئی تھی۔ ہر بار بچے کی پیدائش پر سب ڈر جاتے تھے کہ اب کی نہ بچے گی۔ مگر اس کا ڈاکٹر شوہر دو چار بوتلیں خون چڑھا کر پھر زندگی کے میدان میں گھسیٹ لاتا کہ اگلے سال وہ ایک اور بچہ پیدا کر سکے۔ اب اس کی ساس کو سمدھیانے کے خراب گھی پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر فوزیہ خود ہی گھر سے باہر نہ نکلتی۔۔۔ سب سے بڑی بیوی ہونے کی وجہ سے شوہر کے سارے کاموں اور مسائل کی وہی ذمہ دار تھی۔ پھر سوکنوں کے جھگڑوں سے نبٹتا۔ ان کی اولادوں کی ضرورتیں پوری کرنا۔

اس کے باوجود میکے آتی تھی تو اس کا سارا وقت غزل کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ غزل کی ہم عمر تھی۔ مگر اب اس سے دس برس بڑی لگتی۔ کہیں کہیں بال سفید ہو رہے تھے۔ بدن سوکھ کر بے رونق ہو گیا تھا۔ اختلاج، خون کی کمی اور نقابت کے مارے اس کے چہرے کی رونق غائب ہو چکی تھی۔

فوزیہ غزل کی قسمت پر رشک کرتی تھی۔ کیسی خوش قسمت نکلی یہ لڑکی۔۔۔ بچپن سے من مانے عیش کئے۔ مردوں کے ساتھ خوب گل چہرے اڑائے اور پھر شاہین جیسے تعلیم یافتہ خوبصورت خاندانی لڑکے پر چہا پہ مارا۔۔۔ لیجئے سب کو ادھر! ادھر ڈھکیل پورے ”ایوان غزل“ کی ملکہ بن بیٹھی۔۔۔

دونوں کی زندگی کیسی پر سکون تھی! فوزیہ نے کبھی بھائی بھاج کو لڑتے دیکھا نہ ایک دوسرے کی کوئی شکایتیں کرتے سنا۔ سونے پر سہاگہ بچے بھی نہ ہوئے، جو فوزیہ کے لئے اللہ کا سب سے بڑا قہر تھے، غزل کو دیکھو کیسے مزے میں ہے پچیس برس کی ہو چکی۔ مگر سولہ سال کی لڑکیوں والی صحت ہے۔ طرح طرح کے فیشن۔۔۔ قسم قسم کا میک اپ۔۔۔ شوہر کیوں ادھر ادھر بھٹکے گا! دیکھو کیسا بیوی کا بلو تھامے پھرتا ہے۔۔۔ فوزیہ نے بھائی کے تعلق سے کبھی کوئی خبر نہ سنی کہ اس نے کسی ماما کو کبھی اندھیرے اجالے پکڑا ہو۔

اس کے باوجود وہ اوپر آتی تو سونا سونا ”ایوان غزل“ دیکھ کر اسے وحشت ہوتی تھی۔ اب اس گھر میں کون بچے اکھیلیں گے۔

اکلوتے شاہین کے ہاں بھی کونپلیں نہ پھوٹیں تو کیا ”ایوان غزل“ کا تاریخی باغ اجڑ جائے گا

فوزیہ کے ماں باپ نہ چاہیں مگر فوزیہ تو ہر نماز کے بعد بھائی کا چراغ روشن ہونے کی دعائیں مانگی تھی۔ بھائی کو حکیموں، ڈاکٹروں کے پاس جانے کا مشورہ دیتی۔ اسے تعجب تھا کہ یہ کیسی عورت ہے جسے بچے کی آرزوی نہیں ہے۔ اکیلی گھر میں پڑی رہتی ہے۔ فوزیہ کے چھوٹے بچے کو اوپر بلا کر اس کے ساتھ کھیلتی ہے مگر اپنا بچہ نہیں چاہتی۔ آخر ایک دن فوزیہ نے کہہ دیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا غزل کہ تم اپنا علاج کیوں نہیں کروا تھیں؟“

اس لیے کہ میں بیمار نہیں ہوں۔۔۔“ غزل نے آہستہ سے کہا۔

تو پھر۔۔۔“ فوزیہ و سخت تعجب ہوا۔

سنو فوزیہ۔۔۔“ غزل نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔۔۔

تم اس بات کو یاد کیوں نہیں رکھتیں کہ میں ایک رنڈی ہوں۔ دس مردوں کی ٹھکرانی ہوئی۔ اور شاہین نواب واحد حسین ” کا پوتا۔۔۔ اختر الدولہ کا نواسہ ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ

ایوان غزل“ کی رگوں میں دوڑنے والا خون ناپاک ہو جائے؟ تم نے ترس کہا کر مجھے اپنے گھر میں پناہ دی ہے فوزیہ۔ مگر ” اس نیکی کے بدلے میں تمہیں شرمسار کرنا نہیں چاہتی۔۔۔ اب تم اپنے بھائی کی ایک شادی اور کرو۔۔۔ کسی شریف زادی سے۔ تا کہ تمہارے نجیب الطرفین خون کی شرافت باقی رہے۔۔۔“ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ فوزیہ کے کاندھے پر اس کا سر تھا اور

وہ دونوں ہاتھوں سے فوزیہ کو تھامے ہوئے تھی۔ فوزیہ چپ تھی۔ غزل سمجھ رہی تھی کہ اب وہ غزال کو سینے سے لگا کر سمجھائے گی۔ اپنے بھائی سے جواب طلب کرے گی۔۔۔ مگر فومیہ نے غزل کا سر اپنے کاندھے سے ہٹایا اور آہستہ آہستہ نیچے اتر گئی۔۔۔

رات سے راشد کی طبیعت خراب تھی۔ اسے ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔۔۔ کیونکہ وہ الیکشن ہار گیا تھا۔۔۔ پچاس ہزار روپے اور مستقبل کی منسٹری۔۔۔ گورنمنٹ کا اعتماد۔۔۔ انسان کتنی شکستوں کو دل پر سہہ سکتا ہے۔۔۔

آج غزل اور کرانتی کے نیچے آنے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ رضیہ کو اپنی پریشانی میں ناراض ہونے کا ابوش ہی کہاں تھا

سب راشد کے کمرے میں جمع تھے۔ رات کو نو بج رہے تھے۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ مگر فوزیہ کے بچوں کا ہنگامہ جاری تھا۔ آج شاہین بھی کلینک بند کر کے جلدی آ گیا تھا اور دواؤں کی بجائے اچھی اچھی خبروں کے ڈوز ڈیڈی کو پلائے جارہا تھا۔

راشد بھی اب کل سے بہتر تھا۔ اسے غزل اور کرانتی کا نیچے آنا اچھا لگ رہا تھا گھر کی کھوئی ہوئی چہل پہل اچھی لگ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شاہین یہ ساری باتیں اسے خوش کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ مگر پھر بھی شاہین کا اس کے سر ہانے بیٹھ کر قہقہے لگانا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔۔۔

پھر دروازے کا پردہ ہٹا اور شیخ بھائی اندر آئے۔۔۔

چوڑی دار پاجامہ۔۔۔ ٹوئیڈ کی شیروانی۔۔۔ ترکی ٹوپی۔۔۔ حجامت بنی ہوئی۔۔۔ اجلے اجلے ہے۔۔۔ ان کے پیچھے لنگڑاتی ہوئی لنگڑی پھوپھو کھڑی تھیں مگر ان کی شکل اتنی بدل چکی تھی کہ پہلی نظر میں کسی نے نہ پہچانا۔ انہوں نے اپنے بال سیاہ کر لئے تھے۔۔۔ کانوں میں کرن پھول جھمکے۔ گلے میں ست لڑا اور چندن ہار۔۔۔ اور کالی پوت کا لچھا۔ گلابی کتان کی چمکی ہوئی ساری اور ہاتھون میں جگمگاتا ہوا سچے موتیوں کا جوڑا۔۔۔

کمرے میں سب بی ان سے چھوٹے بیٹھے تھے۔ مگر انہوں نے سب کو جھک جھک کر سلام کئے۔ آخر میں رضیہ سے جا کر لیٹ گئیں اور رونے لگیں۔

مگر رضیہ کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ اس نے لنگڑی پھوپھو کو ہٹا کر تیز لہجے میں کہا۔

”آپ لوگاہاں کیوں آئے ہیں۔ کس کی اجازت سے۔۔۔“

بشت۔۔۔ چپ بیٹھو رضیہ۔۔۔ راشد نے غصے سے کہا۔

”بات تو کرنے دو۔۔۔ آتے ہی لڑنا شروع کر دیا۔“

میرے کو معلوم ہے۔ راشد میاں کہ رضیہ دلہن مجھ سے لڑیں گی۔ مجھے گالیاں کو سننے دیں گی۔ کیونکہ میں اپنا حق ”لے گئی تھی۔۔۔

کرانتی سب سے الگ ایک کتاب کھولے کرسی پر بیٹھی تھی۔ مگر لنگڑی پھوپھو کی بات سننے کے لئے کتاب پھینک کر تماشہ دیکھنے کے لئے آ کھڑی ہوئی۔

مگر ہوس چھوڑ دو لہن پاشا۔۔۔“ لنگڑی پھوپھو کہہ رہی تھیں۔

تمہارے خسر میرے کو چھت سے نیچے پھینک کر اپنی قبر میں کیا سمیٹ کر لے گئے کہ تم لے جاؤ گی۔ دیکھ ”لوکتوں کی چھوڑی جھوٹن تم کھا رہی ہو۔۔۔ اب تو خدا کے قبر سے ڈرو بی بی۔۔۔

چپ بیٹھ بے شرم بڈھی۔۔۔“ رضیہ نے غصے میں کہا۔

”بے شرم کہیں کی۔ سفید چونڈے کو کا لک لگا کر اپنا تماشہ بنا یا ہے اور اب آئی ہے میرے کو نصیحت کرنے۔۔۔“

غزل پیچھے ہٹ کر چپ چاپ شیخو بھائی کو دیکھ رہی تھی جو غصے میں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ شاہین بڑے غور سے اپنی ماں اور لنگڑی پھوپھو کی باتیں سن رہا تھا لیکن کرائنتی کاہنسی کے مارے برا حال تھا۔ وہ اس لڑائی کو یوں انجوائے کر رہی تھی جیسے کوئی مزاحیہ ڈرامہ دیکھ رہی ہو۔

”تو پھر کیا کرتی! واحد بھائی نے مجھے چھت سے نیچے پھینک کر میری ٹانگیں توڑ دیں کہ میں اس گھر سے کہیں نہ جاسکوں۔ ارے میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ کبھی مجھے نیچے پھینک دیتے ہو کبھی چاند کو آگ میں جھونکتے ہو۔۔۔“

”تمہاری شاعری کی ایسی تیسی۔ اس ”ایوان غزل“ پر مٹی ڈالوں جہاں عورت کو لوٹ کھسوٹ کے چھوڑ دیتے ہیں۔“ گو ہر پھوپھو چلاتے چلاتے بے دم ہی ہو کر ایک طرف کو جھک گئیں تو شیخو بھائی نے انہیں اپنے ہاتھوں پر سنبھالا۔ پس کرو گو ہر بیگم آپ یہاں لڑنے کو نہیں آئے تھے۔“ اور پھر شیخو بھائی نے ایک ایک کر کے لنگڑی پھوپھو کے بدن پر سے زیوراتار کے راشد کی طرف پھینکنا شروع کیے۔

”یہ لو راشد میاں، اس زیور کو پھر اپنی سیف میں بند کرلو۔ گو ہر بیگم بولے ہیں۔ میں ان کو منع کیا تھا میرے کو“ ”زیور نہیں ہونا۔ ایک گوہر بھوت ہے۔“

راشد نے سونے کے کڑے کو ہاتھ میں تھام کر حیرانی سے دیکھا اور خوشی کے مارے کانپنے لگا۔ پھر چالیس تولے کا وزنی ہار دھم سے راشد کے سینے پر پڑا اور اس نے ہار سمیت دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا۔

سب خاموش تھے۔ شاہین۔۔۔ غزل۔ فوزیہ اور رضیہ اور کرائنتی جیسے کسی پکچر کا کلائمکس سین آگیا ہو جہاں ایک ولن اچانک کسی فرشتہ صفت انسان کا روپ دھار لے۔ اور ایک ایک روپے کے لیے سب کے سامنے گھگھیا نے والے شیخو بھائی کا روپ دھار کر ہزاروں روپے کا زیور راشد کے منہ پر مارنا شروع کر دے

سچ مچ کی زندگی میں تو کبھی ایسا نہیں ہوا ہے یہ تو کسی تھرڈ کلاس ہندوستانی فلم کا ایک بورسین تھا۔ کرائنتی کو الجھن سی ہونے لگی۔

یہ بھی اتارلو۔۔۔“ لنگڑی پھوپھو نے انگوٹھیوں والا مہندی کا ہاتھ رضیہ کی طرف بڑھادیا۔

رہنے دو۔۔۔ مجھے نہیں چاہئے یہ زیور۔۔۔“ جانے کس دل سے رضیہ نے محض دکھاوے کے لیے سب کو سنایا۔

”جاؤ سب زیور لے جاؤ شیخو بھائی اور اس کا گرمہ پی ڈالو۔“

گڑ مہ پینے کے لیے میں نے ایک کارخانے میں نوکری کر لی ہے۔ دلہن پاشا آپ کی مہربانی کا شکریہ۔“ شیخو بھائی نے ہاتھ جوڑ کر حسب عادت نہایت انکساری سے کہا۔

”گوہر بیگم کو دلہن بننے کا ارمان تھا بول کے انوں یہ زیوراں لے کر گئے تھے۔“

تو اب کون سا دلہنا پا ختم ہو گیا ہے ان کا۔۔۔“ رضیہ نے جل کر کہا۔

بڑے ارمانوں بھری سولہ برس کی کنواری ہیں نا۔ ابھی برس دو برس اور گھونگھٹ نکال کر بیٹھا رہنے دو۔۔۔ توبہ تو بہ اللہ میاں۔۔۔“ رضیہ نے زور زور سے منہ پر تھپڑ مارے۔

ایوان غزل کی پوٹیاں، چھوکریاں۔ اللہ کی پناہ اجاڑ صورتاں موری کے کیڑے ہیں۔ چاہے انہیں قبر میں سلا دو۔ پھر بھی ان پر اعتبار نہیں کرتا۔ رضیہ غصے میں یوں ٹہل رہی تھی جیسے جلتے تیل میں پوری کانپ رہی ہو۔

اس سارے جھگڑے کے دوران راشد بالکل چپ رہا۔ چندن ہار اس کے سینے پر رکھا تھا۔۔۔ کرانتی ، رضیہ اور شیخو بھائی کے مکالموں پر خوب قہقہے لگاری تھی اور باری باری سب کی صورتیں غور سے دیکھتی جاتی تھی۔۔۔ پھر کچھ دیر بعد کرانتی کچھ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے پلنگ پر پڑا ہوا کرن پھول اٹھا کر راشد کے اوپر رکھتے ہوئے کہا۔

”راشد انکل کی ڈیڈ باڈی پر میں سب سے پہلے سونے کا پھول رکھوں گی۔“

یہ سن کر سب اچھل پڑے۔ شاہین تڑپ کر اٹھا۔۔۔ اور اس ایک لمحہ کے دوران جب وہ کرسی سے اٹھ کر راشد کی طرف جھک رہا تھا تو اس نے اندازہ لگالیا کہ اس کے باپ کو نجات مل چکی ہے۔

راشد کی تیسری برسی کے دن غزل پیش دالان میں چاندنی کا فرش کروارہی تھی کہ کوئی نوکر اس کے ہاتھ میں ایک خط دے گیا۔ یہ خط غزل ہی کے نام تھا۔

آج میں اس غزل سے مخاطب ہوں جس نے مجھے پاکستان کا سب سے مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ مگر اب میری شاعری پھیکی پڑتی جارہی ہے کیونکہ تمہاری یادوں کے نقوش دھندلانے لگے ہیں۔

اس لیے میں نئی زندگی کے لئے تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی بھی ہوگی۔

نصیر

جسے اب کسی کا ہونے کا

اندیشہ نہیں ہے۔

غزل نے خط تہہ کر کے لفافے میں رکھا۔ اور ڈھلتی شام کی ساری اداسی۔ برسی والے گھر کا غم ناک سناٹا۔ اس کے چاروں اور چھا گیا۔۔۔ قالین کا کو نا ہاتھ میں تھا مے وہ ہر چیز بھول گئی۔ سب باتیں۔۔۔ یوں لگا جیسے ان دس برسوں میں صرف آنگن میں بڑھتا ہوا اندھیرا ہی دیکھے جارہی ہے۔۔۔

اسے انتظار تھا۔۔۔ کسی کی آہٹ کا۔۔۔ کسی کے ہلکے ہلکے ترنم کا۔۔۔ میری شاعری۔۔۔ جان غزل۔۔۔ ایمان غزل۔۔۔ میری غزل۔۔۔

اب وہ کتنا مایوس ہوگا مسز شاہین سے مل کر۔۔۔ میں اس کا انتظار کیوں کرتی۔۔۔! میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ میں اس سے اجنبیوں کی طرح ملوں گی۔ اس کے شاعرانہ موڈ کو تباہ کر دوں گی۔ اس کی شاعری کا رُخ بدل دوں گی۔۔۔

نصیر کو جلانے کے لیے وہ اچانک شاہین پر زیادہ مہربان ہو گئی اپنا رنگ و روپ تو بقول فوزیہ کے یوں ہی اس نے سینت کر رکھا تھا۔ کسی کے انتظار میں۔ میک اپ کی تہ اور بڑھادی۔۔۔ وہ سب ساریاں اکٹھی کیں جو اس پر اچھی لگتی تھیں۔۔۔ شاہین کے ساتھ شام کو وہ عابد شاپ گئی۔ بہت سے نئے قسم کے بلاؤز سلوانے جس میں بدن کا ہر حصہ نمایاں ہو سکے۔ وہ اپنی بھولی بھری ہنسی کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھا کرنے لگی۔

نصیر کی بیوی، بیویوں کا بہت ہی فضول سی ماڈل تھی گوری گول مٹول۔ دو بچوں کے بعد ہی پھول کر کیا ہو گئی تھی۔ بے ڈھنگے پن سے سلے ہوئے کپڑے پہنے۔ پھوڑ پن کا میک اپ۔ ضروری اور غیر ضروری زیوروں میں لدی۔۔۔ شوہر کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں پر ناک بھوں چڑھانے والی۔۔۔ ذرا راسی بات پر نصیر کو اس کی خوشامد کرنا پڑتی۔

نصیر غزل سے یوں ملا جیسے وہ غزل کے جان لیوا بدن، مدھوش کن آنکھوں اور سب کچھ بھلا دینے والے چہرے سے واقف ہی نہ ہو۔۔۔ یہ بات غزل کو بھی پسند آئی۔۔۔ اسے ڈر تھا کہ نصیر کہیں اپنی بیوی کے سامنے اس کی عزت کا بھرم نہ توڑ دے۔

رضیہ نے نصیر کی خوب آؤ بھگت کی۔ سارے گھر میں چہل پہل مچ گئی۔ فوزیہ بھی اپنے بچوں سمیت نصیر بھائی سے ملنے آئی دور چلے گئے تو کیا ہو۔۔۔ آخر خون کی محبت کبھی نہ کبھی تو اسے کھینچ ہی لانی شاہین نے بڑے بھائی کی طرح اس کا استقبال کیا۔ وہی لڑکپن کی بے تکلفی اور بے ساختگی واپس آگئی جو نصیر کے پہلی بار حیدر آباد آنے پر ان دونوں کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔

نصیر نے اس کی ڈاکٹری کے دھندے پر طنز کیے اور اس نے نصیر کے بھاری بھر کم بدن کو دیکھ کر پاکستان میں شاعروں کی قدر دانی پر جملے کسے۔۔۔ ذرا دیر بعد ہی وہ دونوں غزل اور نفیس کی حرکتوں پر دبئی دبئی سرگوشیوں کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ شاہین کو جیسے بالکل یاد ہی نہ رہا تھا کہ نصیر پہلی بار حیدر آباد آیا تھا تو اس نے غزل کے خطرے سے

اسے آگاہ کیا تھا۔ اس کے باوجود اورنگ آباد جاتے وقت وہ راہ میں لٹ جائے والے مسافر کی طرح سسکیاں لے کر شاہین سے کہہ رہا تھا۔

شاہین میں مرجاؤں گا۔ بار صرف تم سے امید ہے کہ میرا ساتھ دو گے قسم خدا ور نہ میں زہر کھالوں گا۔ تم پہر کبھی ”میری صورت نہ دیکھ سکو گے۔“

اور اب آنے کے بعد نصیر نے شاہین کو یوں شادی کی مبارکباد دی تھی جیسے وہ شاہین کی دلہن سے واقف ہی نہ ہو۔ اس نے غزل بھائی غزل بھابی کی رٹ لگا لی تھی۔

اتنے بھاری جھوٹ کے پتھر انھوں نے کیسے اپنے سینے پر رکھ لیے ہیں۔ غزل بڑے تعجب سے کبھی نصیر کو دیکھتی۔ کبھی شاہین کو۔ اور شاہین نصیر کے سامنے غزل کے ساتھ نئے نئے نولے دولہاؤں کی طرح چونچلے بگھارتا۔ دم بھر کے لیے اس سے دور ہٹ کر نہ بیٹھتا تھا، گھبراہٹ کے مارے غزل کو اختلاج سا ہونے لگا تھا۔ یوں لگتا جیسے وہ سب منہ پر میک اپ تھوپے، سوانگ بھرے کوئی ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔ ابھی پردہ گر جائیگا تب ایک اور تماشہ شروع ہوگا۔

نصیر انڈیا تفریح کرنے آیا تھا۔ دل کے سونے ہوئے جذبے جگانے اور وہ کرانتی کو دیکھ کر جاگ اٹھا۔ ہائے کیا جوانی ہے۔۔۔ اسے جوش یاد آئے اور پھر ان کے وہ معاشقے جو انھوں نے دکن کی سیاہ فام عورتوں سے کیے تھے۔ وہ شاہین کی پسند کی داد دینے لگا کہ کیسی چڑیا اس نے پال رکھی تھی۔۔۔ چلو ”ایوان غزل“ میں اب ایک نئے معشوق کی آمد تھی۔ اور وہ چاہتا تھا اب کی بار پھر یہاں کوئی اور رنگین کہانی چھوڑ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے غزل پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور شاہین کے ساتھ بولیا کہ اس ترمال میں ساجھے دار بن سکے مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے شاہین اس نو خیز حسینہ کے معاملے میں کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کرتا۔ یا پھر کوئی اور بات تھی کہ اس کی قیامت خیز جوانی کو شاہین نظر انداز کئے ہوئے تھا۔

یار تم نے یہ چڑیا تو خوب پالی ہے۔“ ایک دن نصیر صبر کھو بیٹھا۔ شاہین نے نصیر کو گھور کے دیکھا۔۔۔ کرانتی کو ”اس نے دل کے کسی خانے میں بیٹی کا سا رشتہ تو نہیں دیا تھا۔ پھر بھی وہ کرانتی کی جوانی پر بھی نگہ نہیں ڈال سکا۔ شاید اس لیے کہ اس نے چار پانچ برس کی کرانتی کو اپنی گود میں اٹھایا تھا۔ اس نے کرانتی کو کھلونے لا کر دیئے تھے اور اسے اپنے بستر پر تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ لیلیٰ کا کتا۔ رضیہ نے کرانتی کو ہمیشہ لیلیٰ کا کتا کہا تھا۔ اسی لیے نصیر کی بات اسے اچھی نہیں لگی اور رات کو اس نے زندگی میں پہلی بار کرانتی کو ڈانٹا۔“

”گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ہر وقت منی اسکرٹ اور بیل باٹم مت پہنا کرو۔“

کرانتی سہم گئی۔۔۔ کیونکہ انکل نے بھی اس کے لباس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ اور شاید یہ پہلی ڈانٹ تھی جو اس نے سنی۔ مگر وہ جواب دینے کے بجائے چپ ہو گئی۔ کیونکہ اس وقت اسے شاہین سے ایک اہم بات کہنا تھی۔۔۔

اور آج تم گھر پر کیوں ہو۔۔۔ کالج نہیں گئیں۔۔۔“ شاہین نے پھر پلٹ کر پوچھا۔

وہ چاہتا تھا کہ جب تک نصیر یہاں رہے کرانتی کم سے کم گھر میں آئے۔ ویسے بھی وہ گھر میں کم رہتی تھی اور اس کا سارا وقت گوپال ریڈی کے ساتھ گزرتا تھا جو نکسلانٹ تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے کالج سے نکالا گیا تو اسی کے ساتھ کرانتی کو بھی ملازمت سے علاحدہ کر دیا گیا تھا۔

انکل۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ گوپال ریڈی۔۔۔“ کرانتی کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔۔۔

اب گوپال ریڈی کا ساتھ چھوڑ دو۔ ایک بار ملازمت کھو چکی ہو۔۔۔ پھر کہیں یہ نوکری بھی نہ چلی جائے۔“ شاہین نے ”سنبل سنبل کر کہا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کرانتی نصیحتیں سننے والوں میں سے نہیں تھی۔

کرانتی نے بال پیچھے کی طرف جھنک کر آہستہ سے کہا۔

”وہی تو ہوا ہے۔۔۔“

پھر نوکری چھوٹ گئی۔۔۔؟“ شاہین نے تعجب سے پوچھا اور پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ کہیں جائے وہ۔۔۔ ” میری بلا سے۔۔۔ الماری سے بوتل نکال کر اس نے میز پر رکھتے ہوئے سوچا۔۔۔

کئی دن بعد نفیس اور نصیر سے ہنسی مذاق کر کے غزل اوپر آئی تو رات کے بارہ بجے تھے۔۔۔ شاہین کسی مریض کو دیکھنے گیا تھا اور کرائنتی کے کمرے میں ابھی تک لائٹ جل رہی تھی۔۔۔ پڑھا رہی ہوگی۔۔۔ اس نے سوچا۔۔۔ یہ لڑکی جانے کس طرف جارہی ہے۔ کہاں ماری ماری پھرتی ہے۔ کچھ نہیں بتاتی۔ بالکل لڑکوں کے انداز میں جرسی اور بیل باٹم پہنے۔۔۔ سگریٹ پیتی ہے۔ اس نے لڑکیوں والی کوئی بات نہیں سیکھی تھی۔ میک اپ کرنا نہ اچھے کپڑے پہننا۔ نہ پکچر دیکھنا۔۔۔ اسے کوئی شوق نہیں تھا۔۔۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے غزل ٹھٹک گئی۔

سفید قمیص اور نیلا پینٹ پہنے کرائنتی سگریٹ سلگارہی تھی۔ اس کے جھنڈ والے بال سارے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور سارا کمرہ جانے کیسے سامان سے بھرا پڑا تھا۔

!وہ کہیں جارہی ہے۔۔۔

یہ سامان کیسا ہے۔۔۔؟“ غزل نے اندر آ کر ادھر ادھر دیکھا۔ سیاہ کپڑے میں بندھی ہوئی رانفلین تھیں۔ کارتوسوں کی ” پیٹیاں اور بندڈے۔۔۔ غزل کو دیکھ کر کرائنتی گھبرا گئی اور سگریٹ پھینک کر اس سے لپٹ گئی۔

آنتی آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟ میں ذرا آج گوپال ریڈی کے ساتھ جارہی ہوں۔۔۔ ابھی ہمارے ساتھی آتے ہوں گے۔۔۔ ” آپ مت گھبرائیے۔۔۔ میں اب یہاں نہیں آیا کروں گی۔۔۔ آپ کو نہیں سناؤں گی۔۔۔

غزل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس چپ چاپ کھڑی رہی۔

تم کہاں جارہی ہو۔۔۔ کیا کرنے۔۔۔؟“ بڑی دیر بعد غزل اپنی آواز پر قابو پاسکی۔

میں لڑنے جارہی ہوں۔۔۔“ کرائنتی نے سگریٹ کی خالی ڈبیہ کو ٹھوکر مار کے کہا اور سامان کے ڈیوں پر ایک چادر ” لا کر ڈال دی۔

آج آپ نے نیوز پڑھی آنتی! ورنگل میں سات آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی ہے۔۔۔ کیا آدمی کا خون اتنا سستا ہے ” آنتی۔۔۔ وہ کمرے میں ادھر ادھر گھوم کے کچھ چیزیں اپنی جیبوں میں بھر رہی تھی۔۔۔ کیا اپنے لیے حق راحت اور انصاف ”مانگنے کی سزا بھی ختم نہ ہوگی۔۔۔؟

مگر یہ تو بڑا خطرناک راستہ ہوتا ہے کرائنتی۔۔۔“ غزل نے بڑے دکھ سے کہا۔ (اسے قیصر اور سنجیو کا انجام یاد آ رہا تھا)۔۔۔

لوٹ مار قتل اور غارت گری پھیلانے کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہوسکتا ہے۔۔۔ کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے۔“

غزل اب تھک کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

میرے ڈیڈی نے کہا تھا۔۔۔“ کرانتی نے سگریٹ سلگاتے میں کہا۔۔۔“

“انصاف کی بھیک مانگی تو انہیں پھانسی کا پھند ا ملا تھا۔“

اور تمہیں کیا ملے گا۔۔۔؟“ غزل نے جل کر پوچھا۔۔۔(باغیوں کی اولاد۔ آخر گئی نا اپنے خون پر!)

سکون“ اس نے آنکھیں بند کر کے چہت کی طرف منہ اٹھایا۔“

اجنبی لوگوں کے لئے غزل کے دل میں ہمیشہ محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے تھے۔۔۔ اسے جو چیز پسند آ جاتی اس کی تمام برائیاں خود بخود نظروں کے سامنے سے ہٹ جاتی تھیں۔۔۔ اسی لئے نصیر کی بیوی نفیس بھی اس کی عنایتوں سے نہ بچ سکی۔ غزل جب نصیر کی سی آنکھوں والی ، اس کی سی مسکراہٹ والی نصیر کی چھوٹی بچی کو پیار کرتی تھی تو اس میں فرائیڈ کے خوش ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ خلوص پر مرنا اس کی پرانی عادت تھی۔۔۔ ایک ہفتہ میں اس نے نفیس کے ساتھ دوستی کے بے شمار مرحلے طے کر ڈالے۔

بچوں کو مارنے پیٹنے اور شوہر سے لڑنے کے بعد وقت بچے تو نفیس کافی خوش مزاج تھی۔

ایک بار نصیر اور شاہین سیکنڈ شوڈ یکھنے چلے گئے، بچوں کو سلا کر نفیس اوپر چلی آئی ، پھر نفیس اور غزل ایک ہی پلنگ پر لیٹ کر گپیں بانکنے لگیں ، وہ ساری دلچسپ باتیں ، راز اور ساس نندوں کی زیادتیاں ، شوہر کے رومانس کے قصے ، جو صرف دو جگری سہیلیاں ہی آپس میں کرتی ہیں۔

نفیس نے پہلے تو عام عورتوں کی طرح اجالا بیگم کے ظلم و ستم کی داستان سنائی، پھر اپنے خاندان اور اپنی صورت شکل کی تعریفیں کرتی رہی اور آخر میں نصیر کی طرف آئی۔۔۔

یہ تمہارے نصیر بھائی بھی بڑے وہ ہیں۔۔۔“ وہ ناز سے اٹھلائی۔

مجھ سے کہتے تھے کہ شادی کرونگا تو تم سے ورنہ ساری زندگی کنوارا رہوں گا۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ میرا ” ”بی تو ذکر ہے۔

، غزل یہ سن کر چونک پڑی

ان سے شادی کے وقت مجھے بڑا ڈر لگتا تھا کہ شاعروں پر بہت سی لڑکیاں مرتی ہیں نا۔۔۔

”پاکستان کے شاعر تو چیونٹیوں بھرے کباب ہیں جانے کتنی محبوبا ئیں ان کی جان کو لیٹی رہتی ہیں۔

ہاں تو پھر۔۔ اور کیا کہتے تھے تم سے نصیر۔۔۔“ غزل نے کھوئے ہوئے لہجہ میں پوچھا

”انہوں نے مجھ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ تم ہی وہ پہلی اور آخری لڑکی ہو، میں جسے چاہتا ہوں۔ ”

غزل نے مسکرانا چاہا، پھر بار کے زور زور سے پاؤں ہلانے لگی۔

نفیس اپنی دھن میں کیے جارہی تھی۔

”البتہ ایک بار انہوں نے اقرار کیا تھا کہ ایک لڑکی انہیں بے حد چاہتی تھی۔“

”اچھا۔۔۔؟“ غزل یوں اچھل پڑی جیسے اچانک نفیس نے اس پر چاقو سے وار کیا ہو۔

ہاں۔۔۔ بڑے رنگین مزاج میں یہ تمہارے نصیر بھائی۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ لڑکی انڈیا میں تھی، اسی لیے تو میں ” ”ضد کر کے ان کے ساتھ آئی ہوں مجھے جلانے کے لیے کہتے ہیں وہ تو آج بھی میری راہ میں آنکھیں بچھائے ہوگی۔

ہونہ۔۔۔ سب بکواس ہے۔ غزل نے غصے میں اپنے ہونٹ کاٹے

اور نہیں تو کیا۔“ نفیس نے اطمینان سے کہا۔“ کہتے ہیں ایک خوبصورت لڑکی مجھ پر بری طرح مرتی تھی، مگر وہ ” ”ایسی لڑکی تھی جس سے صرف پیار کیا جاتا ہے۔۔۔

غزل پر جانے کیسی تھکن سوار ہوئی کہ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی ، صرف محبوبہ۔۔۔

نصیر کی محبوبہ۔۔۔ بلگرامی کی محبوبہ۔۔۔ بیہان کی محبوبہ۔۔۔ شاہین کی محبوبہ۔۔۔ سرور کی محبوبہ۔۔۔ جان غزل۔۔۔ شاعر
اگر۔۔۔ ”ایوان غزل“ کی معشوقہ۔۔۔

پھر نفیس نے اپنے سینے پر پلو ڈال کر بڑے ٹھسے سے بیوی پن کی اہمیت جتائی۔

اب تو میں نے انہیں خوب کس کر باندھ رکھا ہے ، کہو تو سوئی کے دھاگے میں سے نکل جائیں گے میرے خاطر۔“ ”
غزل جانے کیسے وہاں سے اٹھی اور یوں اپنے کمرے میں آئی جیسے موت کا خیال آتا ہے۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ دیوار سے اپنا سر دے مارے ، بستر پر گر کے وہ ہاتھ پاؤں پٹکنے لگی ، دل میں جانے کیا چیز
ٹوٹ کر بکھر رہی تھی ، شاید اسی کو ہارٹ اٹیک کہتے ہیں۔۔۔ دل کا دورہ۔۔۔ دل پر ایک زوردار چوٹ لگتی ہے ، ایک گہرا زخم پڑ
جاتا ہے۔۔۔ لیکن میرے دل پر بھی کوئی جگہ زخم کے لیے باقی ہے۔۔۔؟ دانت کچکا کر اس نے ساری کھول پھینکی کسی کو
مار ڈالنے ، تباہ کر ڈالنے کے لیے اس کے ہاتھ بیقرار تھے۔۔۔ اس نے کروٹ بدلی تو سامنے ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ تھا۔۔۔ افوہ۔۔۔ اس
کا چہرہ لال بھوکا ہو رہا تھا۔۔۔ بال چڑیلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔۔۔ آخ تھو۔۔۔ اس نے سچ مچ آئینے کے اوپر تھوک دیا۔۔۔
شاعروں کی معشوقہ غزل۔۔۔ جان جانان۔۔۔

پھر شاہین کا میڈیکل بکس کھول کر اس نے آئیوڈین کی ایک شیشی نکالی اور بڑے اطمینان سے سوچ سوچ کر پیڈ پر
لکھنے لگی۔

”میں اپنی موت کی خود ذمہ دار ہوں۔“

ابھی اس نے زہر کی شیشی کھولی بھی نہ تھی کہ دل میں ناقابل برداشت درد ہونے لگا۔

تو آج وہ دن آگیا۔۔۔؟

اس نے چاروں طرف آخری نظر ڈالی۔۔۔

اس گھر کے اس نے کیسے کیسے خواب سجائے تھے۔۔۔ الماری میں کتنی چیزیں اکٹھی کی تھیں۔۔۔ رنگین ساریاں۔۔۔
طرح طرح کے جوئے جھوٹے موتیوں کے زیور۔۔۔ ان چیزوں کی خاطر اسے گھنٹوں چہرے پر میک اپ کرنا پڑا تھا ، شراب کی
بدبو میں نہائے ہوئے مردوں کے پیار۔۔۔ گنجے بڈھوں کا چھچھورا پن۔۔۔ نو جوان مردوں کی بے قراری۔ کیسے کیسے زہر پیئے
تھے۔۔۔ ان الماریوں میں فلمی گانوں سے بھری ہوئی کاپیاں تھیں۔۔۔ اخباروں کی کٹنگ اس میں اس کی اداکاری کی تعریف کئی
اگئی تھی۔۔۔ چھوٹے بڑے کپس اور شیڈز۔۔۔ اور پھر اس کا البم۔۔۔

البم کے نام پر اس کا دل ٹھہر گیا۔

یہ البم اس کی زندگی کا آئینہ تھا ، یہاں شناسا چہروں کا ہجوم تھا ، وہ اٹھی اور البم نکال کر کھول دیا۔۔۔ یہ سب وہ تھے
جو اس پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار تھے مگر عزت نثار نہ کر سکے۔۔۔ انہوں نے اسے اپنی محبوبہ بنایا تا کہ اپنی جوانی کو
ارنگین بنا لیں اور پھر ان عورتوں سے شادی کی جو صرف بیویاں ہوتی ہیں۔۔۔ ماچس اٹھا کر اس نے البم کو جلانا شروع کیا۔۔۔

مرنے سے پہلے ان سب صورتوں کو آگ لگا دینا چاہیے۔

تمام فوٹو بڑی جلدی جل گئے۔۔۔ لیکن ربر کی چمڑے والی جلد بڑی دیر میں جلی۔۔۔ راکھ بثور کے وہ پھینکے گئی تو
راکھ میں دیا ایک ادھ جلا فوٹو نکلا۔۔۔ یہ سرور کی آنکھ تھی جو ابھی تک اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ یہ فوٹو سرور نے
، شادی کے آفر کے ساتھ اسے دیا تھا اور غزل اسے سارے گھر میں بچاتی پھری تھی

”ان حضرت کو ملاحظہ کیجیے۔ شاعری کرتے ہیں اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔“

میں نے کہا:

جاؤ شاعر۔ کیوں اپنا شاعرانہ موڈ تباہ کرنا چاہتے ہو، مجھے ابھی کئی ڈراموں میں ایکٹنگ کرنا ہے۔۔۔ شادی کی ”فرصت کے ہے۔۔۔!“ آج سرور کا پورا چہرہ جل گیا ہے، مگر یہ آنکھ باقی ہے، میری طرف دیکھے جارہی ہے۔

کھڑکی کے پاس جا کر اس نے فوٹو کا وہ ٹکڑا نیچے چھوڑ دیا۔۔۔ بڑی دیر تک وہ خلا میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا اور پھر! کسی پتھر سے جا ٹکرایا۔۔۔

اس کے دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔۔۔ چلو کسی کو تو اس نے بھی ٹھکانے سے لگایا۔۔۔

اندر آئی پیٹ سامنے رکھا تھا

”میں اپنی موت کی خود ذمہ دار ہوں۔“

کیوں۔۔۔؟ میں کیوں ہونے لگی اپنی موت کی ذمہ دار۔۔۔! میری موت کا ذمہ دار اُردو کا ہر شاعر ہے۔۔۔ ”ایوان غزل“ کے وہ سارے مکین ہیں جو سنہری فریموں میں بند پڑے بال کے اندر چپ چاپ بیٹھے ہیں۔۔۔ کسی نئے معشوق کے منتظر۔۔۔ عشق کی کسی تازہ واردات کے مارے ہوئے جولڑنے بھی جاتے تو معشوقوں کی ڈولیاں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔

اپنے سے دور۔۔۔ اپنی مصروفیتوں اور دلچسپیوں سے دور جہاں کی سسکیوں اور آہوں کی آوازیں انہیں کبھی سنائی نہ دیتیں تھیں۔

اگر نصیر کو اپنی موت کا ذمہ دار ٹھہراؤں تو اس کی کتنی بدنامی ہوگی نفیس تو فوراً روٹھ کر میکے چلی جائے۔۔۔ اور وہ نصیر کی صورت والی ننھی سی بچی ماں کے بغیر رورو کر مر جائے گی۔۔۔ اور نصیر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بیٹھ جائے گا، سارے پاکستان میں اس کے دشمن اس کا نام اچھا لیں گے، اسکی شہرت خاک میں مل جائے گی، نصیر کے اس وحشت ناک تصور کو اس نے اپنے سامنے سے ہٹا دیا

پھر کیا لکھوں۔۔۔ کسے قاتل ٹھہراؤں۔۔۔؟

”غزل۔۔۔؟“

اس نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔

نصیر، پشیمان سا۔۔۔ چوروں کے انداز میں سامنے کھڑا تھا۔۔۔

ایک ہی نظر میں اس نے نصیر کے چہرے پر برستے ہوئے سوال کو پڑھ لیا۔۔۔ دس برس سے ترسا ہوا اس کا بدن۔۔۔ بے قرار ہاتھ۔۔۔ بے چین آنکھیں۔۔۔ جانے کتنی کوشش کے بعد نفیس اور شاہین سے یچ کر وہ یہاں آیا تھا۔۔۔ اچانک غزل کا سویا ہوا بدن سپردگی کے بے پناہ جذبوں سے سرشار ہوا تھا۔۔۔ وہ پٹرول کا ڈرم بن گئی اور ننھی سی چنگاری اسے چھونے آگے بڑھ رہی تھی۔۔۔ آج پورے دس برس کے بعد نصیر اس کے سامنے کھڑا تھا تو وہ کچی کنواریوں کی طرح کانپ رہی تھی۔۔۔ اس وقت وہ اپنی موت بھول چکی تھی۔۔۔ اسے نفیس اور شاہین بھی یاد نہیں رہے تھے۔۔۔ نصیر اس کے اور قریب آ گیا۔۔۔ اتنے قریب کہ وہ اسے بے اختیار لپٹ گئی۔۔۔

مگر نصیر نے اپنی کمر میں سے اس کے ہاتھ نکال کر تھام لیے

غزل۔۔۔ یہ انگوٹھی مجھے دے دو۔۔۔ اماں جان کہتی تھیں کہ یہ انگوٹھی نفیس کو پہننا چاہیے، میں تمہیں اور بہت سے ”پریزنٹس دے جاؤں گا۔۔۔ اور ہاں بھئی۔۔۔ ایک دن ہم پر بھی کچھ عنایت کرو۔۔۔ مگر اس طرح کہ شاہین کو خبر نہ ہونے پائے۔۔۔ قسم ”خدا کی تمہاری یاد تو میری جان کا روگ بن گئی ہے۔۔۔ میں نے تمہارے تصور میں جانے کتنی غزلیں۔۔۔

وہ منہ کھولے نصیر کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ اس کی سننے اور سمجھنے کی قوت ختم ہو چکی تھی۔۔۔

وہ حرکت بھی نہ کر سکی۔۔۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ جو کسی کو پکڑنا چاہتے تھے یوں ہی اٹھے رہے اور نصیر نے آہستہ سے انگوٹھی اتار لی۔۔۔

”میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میری جان تمہارے فراق میں۔۔۔“

وہ غزل کے کھلے ہوئے ہونٹوں پر جھک گیا۔۔۔

تم آج بھی میری شاعری کی جان ہو۔۔۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ دنیا کو ہماری اس دیوانگی کا کوئی ثبوت نہ ملنے ”پائے۔۔۔“

وہ نہ جانے غزل کو کب تک پیار کرتا رہا اور کب باہر چلا گیا۔۔۔

غزل نے چونک کر اپنی خالی انگلی کو ٹٹولا اور اس چھت کی طرح دھم سے گر پڑی جس کے ستون کسی نے نیچے سے گرا دیئے ہوں۔

ایوان غزل“ کے اس سب سے بڑے اور خوبصورت ہال بیت الغزل میں غزل کی نہائی دھوئی بنی سنوری لاش رکھی تھی۔۔۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر وہی ازلی معصومیت تھی جس کی وجہ سے اس نے بہت سے مردوں کو بے وقوف بنایا تھا۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے آج اپنے سارے آنسو ختم کر کے دو چپکے چپکے مسکرا رہی ہو۔۔۔

کر یا بات تلے کرسی ڈالے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، شاہین بالکل اپنے دادا کے انداز میں بیٹھا تھا۔۔۔ سارے گھر میں لوگ بھرے ہوئے تھے، اور جب انگریزی میں باتیں کرنے والی چڑیا اس حادثے کی تفصیل پوچھنے شاہین کے پاس آئی تو اس نے سراٹھا کر اس چڑیا کو دیکھا۔۔۔ میں کیا جانوں وہ کیوں مر گئی۔۔۔ شاعروں کے مضامین میں معشوق کو موت نہیں آئی، وہ ! نہ تو کسی کو چاہتا ہے نہ کسی سے پیمان وفا باندھتا ہے۔۔۔

پھر سیاہ برقعہ میں لپٹی ہوئی کر انتی ایک ہفتے بعد آئی تو غزل آنتی کی موت نے اسے تڑپا دیا۔۔۔ روتے روتے وہ چپ ہو گئی، اس نے کفن بنا کر غزل کی انگلی ٹٹولی اور شاہین کے پاس جاکر آہستہ سے بولی۔۔۔

”انکل، وہ انگوٹھی کیا ہوئی جو آنتی کے ہاتھ میں تھی۔“

شاہین نے کرانتی کی اس فضول بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”آنتی کی موت کی وجہ میں جانتی ہوں۔۔۔“

وہ اب کی بار نصیر سے مخاطب ہوئی جو کرانتی کو بڑی ترسی ہوئی ندیدی نظروں سے گھور رہا تھا۔

نصیر انکل۔۔۔ آنتی اس لیے مر گئیں کہ ان کی انگوٹھی کھو گئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا مرنے کے بعد بھی ”انگوٹھی کو مت اتارنا۔۔۔ اس میں میری جان ہے۔“

اچھا۔۔۔ کیسی انگوٹھی تھی وہ۔۔۔“ نفیس نے تعجب سے کہا۔

اور نصیر جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا اور باہر جا کر شیخو بھائی سے پوچھنے لگا کہ قبر تیار ہونے کی اطلاع آئی ”
ایا نہیں۔۔۔

غزل ” ایوان غزل“ سے رخصت ہونے لگی تو کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھے۔۔۔ رضیہ۔۔۔ فوزیہ۔۔۔ نفیس اور نصیر، سب سر جھکائے کھڑے تھے، کرانتی وہاں سے غائب تھی۔۔۔ آخری دیدار کے لیے لوگوں نے غزل کا چہرہ کھولا تو شاہین کو کچھ نظر نہ آیا۔۔۔ اس کی آنکھوں میں غزل کے نقوش دھندلے ہونے لگے۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی۔۔۔ جیسے سینما کے پردے پر ایکسی ہیروئن کا کلوز اپ فیڈ آؤٹ ہو جائے۔۔۔

آج نصیر پاکستان جا رہا تھا۔

کل غزل کا چہلم ہو گیا تھا۔۔۔ اور نصیر نے ختم قرآن کے بعد اللہ میاں سے دعا مانگی تھی۔۔۔ غزل کے گناہ معاف کرنے کی۔۔۔ اس پر دوزخ کا عذاب کم کرنے کی۔۔۔

پھر وہ ”ایوان غزل“ کے سب سے بڑے ہال میں گیا، اور وہاں کے مکینوں کی بیاضیں دیکھنے لگا۔۔۔ تا کہ چند اچھی غزلیں منتخب کر کے پاکستان کے مشاعروں کے لیے کچھ مسالا لے جائے

واحد حسین کے دادا کی بیاض پر رینگتی ہوئی دیمک جھٹک ہی رہا تھا کہ اچانک چاروں طرف اجالا پھیل گیا۔۔۔ فریموں میں سے نکل نکل کر تمام سوئے ہوئے شاعر بے چینی سے دیکھنے لگے اور دیمک لگی بیاضیں کھلنے لگیں کہ ایک اور معشوق کا سراپا لکھ لیں۔

نصیر بڑے اشتیاق سے اس محبوب کو دیکھنے لگا، جس کی مشعل رخسار سے شام گلزار ہوئی جارہی تھی۔

”آداب عرض کرتا ہوں کرانتی دیوی۔۔۔ آئیے یہاں بیٹھے۔۔۔“

اس نے کرسی سے اٹھ کر جھکتے ہوئے اسے کرسی پیش کی۔۔۔

کرانتی نے اپنے بغیر تیل والے بالوں کے جھنڈ کو پیچھے جھٹکا اور سگریٹ منہ سے نکال کر بولی۔

شکریہ۔۔۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔“ اور پھر پرانی کتابوں والی الماری کھول کر کچھ نئی کتابوں کے بندپیکٹس ایک ”
! اٹیچی میں رکھنے لگی۔۔۔

”اچھا۔۔۔ آپ کو بھی شاعری کا شوق ہے۔۔۔؟“

وہ کرانتی کے پاس جا کھڑا ہوا تو اس نے مڑ کے بڑی ناگواری کے ساتھ اسے دیکھا، اور سگریٹ کا کش لے کر بولی۔۔۔

”جی نہیں۔۔۔ یہ دوسری کتابیں ہیں۔۔۔ میں نے حفاظت کے لیے یہاں رکھ دی تھیں۔“

”لیکن آج ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔۔۔ ایسی بھی کیا ہے رخی۔۔۔؟“

اس نے کرانتی کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔ کیوں کہ نصیر جانتا تھا کہ آج کی لڑکیاں عشق کا یہی انداز پسند کرتی ہیں۔۔۔ بے باکی۔۔۔
جلد بازی۔۔۔ اور۔۔۔ زبردستی۔۔۔

کرانتی نے اپنا ہاتھ چھڑا یا نہیں۔۔۔ وہ نصیر کی صورت پر برستے ہوئے سوال کو سمجھ گئی اور اپنے پینٹ کی جیب میں دوسرا ہاتھ ڈال کر بولی۔۔۔

لیکن آپ کو مجھ سے بہت دور بیٹھنا پڑے گا نصیر صاحب۔۔۔! کیوں کہ میری جیب میں ٹائم بم ہیں۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو، ”
 ”میں آپ کے پاس آؤں اور آپ معہ ”ایوان غزل“ کے حروف مکرر کی طرح مٹ جائیں۔۔۔

کرائنتی ہنسنے لگی۔۔۔

اتنی زور سے کہ الماریوں میں چین سے سونے والی چھپکلیاں بے چین ہو کر جھانکنے لگیں۔

یہ غزل کا نیا مضمون ہے۔۔۔ نصیر نے سو جا۔۔۔

اور آہستہ آہستہ وہ ”ایوان غزل“ کے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔۔۔

کر یا بات پر بیٹھی ہوئی چڑیا کی سیٹی اسے ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔۔۔

شوسو۔۔۔شوسو۔۔۔ شووو
